کتب سیرت میں کلامی مباحث اور ان کی عصری معنویت:

منتخب عربی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

سعید عبد اللہ

پی ایچ۔ڈی اسکالر علوم اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر 743PhD/IS/S18

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست 2025ء

کتب سیرت میں کلامی مباحث اور ان کی عصری معنویت:

منتخب عربی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

سعید عبد اللہ

پی ایچ۔ڈی اسکالر علوم اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر743PhD/IS/S18

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

پروفیسر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن: 2018-2023ء

©سعید عبد اللہ

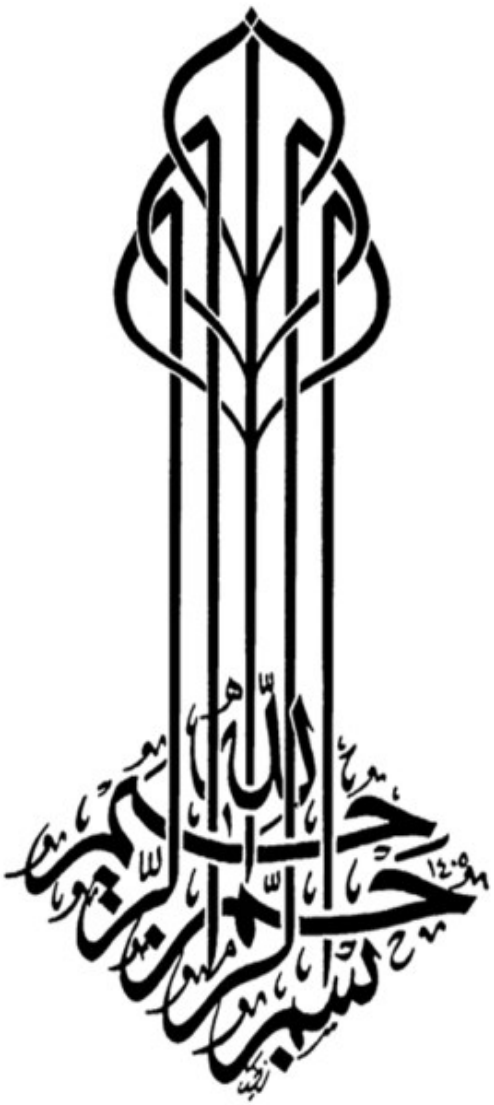
بسم الله الرحمن الرحيم
١٤٠٩

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **کتب سیرت میں کلامی مباحث اور ان کی عصری معنویت: منتخب عربی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ**

Translation of Title in English & Roman:
Theological Debates in the Seerah Works and Their Contemporary Relevance: An Analytical Study of Selected Arabic Books
Kutub e Seerat Main Kalami Mabahis or un ki Asri Manwiyat: MuntakhAb Arabi Tasaneef ka Tajziati Mutalia

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: **سعید عبداللہ**

رجسٹریشن نمبر: 743PhD/IS/S18

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی	_____
(نگران مقالہ)	دستخط نگران مقالہ
ڈاکٹر ریاض احمد سعید	_____
(صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت)	دستخط صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت
پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض شاد	_____
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز)	دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز
میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی (ہلال امتیاز ملٹری)	_____
(ریکٹر نمل)	دستخط ریکٹر نمل

حلف نامہ فارم

(Canidate Declaration Form)

میں **سعید عبداللہ** ولد قاری محمد افضل

رول نمبر:PD-IS-S18-115 رجسٹریشن نمبر743 -PhD/IS/S-18

طالب علم پی ایچ ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز(نمل) اسلام آباد حلفا اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **کتب سیرت میں کلامی مباحث اور ان کی عصری معنویت: منتخب عربی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ**

Translation of Title in English & Roman:

Theological Debates in the Seerah Works and Their Contemporary Relevance: An Analytical Study of Selected Arabic Books

Kutub e Seerat Main Kalami Mabahis or un ki Asri Manwiyat: Muntakhab Arabi Tasaneef ka Tajziati Mutalia

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے اور **پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کرایا گیا ہے، اور نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے، اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: **سعید عبداللہ**

_____

دستخط نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

_____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Theological Debates in the Seerah Works and Their Contemporary Relevance: An Analytical Study of Selected Arabic Books

(ABSTACT)

With the dawn of scholarly endeavours to explain the evidences and proofs of the Prophethood of Muhammad (PBUH) and the attempts to compare these with the previous Prophets and their miracles and evidences, it became evident that in order to present the Prophethood and Divine revelation more eloquently and persuasively the logical and rational perspectives are to considered .

This was done with a view to provide the rational arguments to address those who might not believe or accept the scriptural proofs from the Qur'an and Sunnah. From the early third century Hijri till now, almost all of the biographers have alluded to these theological questions despite the fact that they never met the Prophet.

Hence, in-so-far as these theological readings of the Prophet's biography are concerned, there are particularly well-known works of earlier scholars including Ash-Shifa bi Ta'rif Huquq al-Mustafa, Zad al-Ma'ad and Ar-Rawd al-Unuf. This study aims to analyze the available theological debates on prophethood in these three works and in addition it also deals with the modern objections of atheists and orientalists and logical and rational doubts in light of these early works moreover a modern evaluation of these arguments has been presented to highlight the contemporary relevance of these themes.

Keywords: Theological Debates, Miracles and Evidences, Divine revelation

کتب سیرت میں کلامی مباحث اور ان کی عصری معنویت:
منتخب عربی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

ملخص مقالہ

اس علمی تحقیق کا مقصد نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دلائل و شواہد کو واضح کرنا اور ان کا سابقہ انبیاء اور ان کے معجزات و نشانیوں سے تقابلی جائزہ پیش کرنا تھا، یہ حقیقت سامنے آئی کہ نبوت اور وحیِ الٰہی کو زیادہ مؤثر، فصیح اور مدلل انداز میں پیش کرنے کے لیے عقلی و منطقی پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اس کی غرض و غایت یہ ہیکہ ایسے لوگوں کے سامنے عقلی اور منطقی دلائل پیش کیے جا سکیں جو قرآن و سنت کے نقلی دلائل کو ماننے یا تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لے کر آج تک تقریباً تمام سیرت نگاروں نے ان کلامی مباحث کی طرف اشارہ کیا ہے، باوجود اس کے کہ وہ خود حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے گواہ نہیں تھے۔

لہٰذا، جہاں تک سیرتِ نبوی کے ان کلامی مباحث کا تعلق ہے، وہاں قدیم علماء کی متعدد معروف کتب سامنے آتی ہیں، جن میں الشفاء بتعریف، حقوق المصطفی، زاد المعاد اور الروض الأنف خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تحقیق جہاں ان تینوں کتب میں موجود مباحثِ نبوت اور کلامی مباحث کا تجزیہ پیش کرتی ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ ملحدین اور مستشرقین کے جدید اعتراضات اور عقلی و منطقی شبہات کا جائزہ قدیم مباحث کی روشنی میں لیتے ہوئے ان دلائل کی عصری معنویت کو بھی واضح کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ : کلامی مباحث، معجزات و دلائل، وحیِ الٰہی۔

فہرستِ مضامین بالترتیب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	مقالہ کی منظوری کا فارم	III
2	حلف نامہ	IV
3	Abstract	V
4	ملخص مقالہ	VI
5	فہرستِ مضامین بالترتیب	VII
6	اظہار تشکر	XI
7	انتساب	XII
8	**باب اول: تعارفی مباحث؛ موضوع تحقیق اور منہج تحقیق**	1
9	**فصل اول: موضوع تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث**	2
10	جواز تحقیق	3
11	علوم اسلامی میں علم کلام کی ضرورت	4
12	سیرت و تاریخ میں علم کلام اہمیت	6
13	کتب سیرت میں کلامی مباحث کا تعارفی جائزہ	7
14	موضوع تحقیق سے متعلق کام کا جائزہ(Literature Review)	10
15	منہج تحقیق کی تفصیل	18
16	ابواب و فصول کی تقسیم و ترتیب(Chapterization of Research Theme)	19
17	**فصل دوم: سیرت نگاری کے مدارج و مناہج اور کلامی موضوعات سیرت**	20
18	متقدمین کے ہاں اصطلاح سیرت	23
19	متاخرین کے ہاں اصطلاح سیرت	27
20	سیرت نگاری کا آغاز وارتقاء	30
21	اولین علماء سیرت	33

22	متقدمین سیرت نگار	37
23	متاخرین علمائے سیرت اور ان کی تصانیف	39
24	**فصل سوم: منتخب عربی تصانیف اور ان کے کلامی موضوعات کا جائزہ**	41
25	قاضی عیاض اندلسی (1083-1149) اور ان کی تصنیف الشفاء	43
26	الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ کا کلامی منہج واسلوب	46
27	علامہ السہیلی (1114-1185) اور ان کی تصنیف	49
28	الروض الانف کا کلامی منہج واسلوب	53
29	حافظ ابن قیم (1292–1350) اور ان کی تصنیف	57
30	زاد المعاد کا کلامی منہج واسلوب	60
31	**باب دوم: سیرت کے اہم کلامی مباحث کی کلاسیکی اور عصری معنویت**	65
32	**فصل اول: کتب سیرت میں کلاسیکی اور جدید کلامی مباحث**	66
33	منتخب کتب میں کلامی ابحاث کا اسلوب	66
34	جدید تصانیف میں کلامی مباحث کے مناہج	73
35	خلاصہ بحث	78
36	**فصل دوم: قرآن اور سیرت سے متعلق مستشرقین کے کلامی اشکالات**	80
37	قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا محاکمہ	82
38	سیرت سے متعلق مستشرقین کے اشکالات کا تجزیہ	86
39	خلاصہ بحث	100
40	**باب سوم: وحی ورسالت سے متعلق عصری اشکالات کا تجزیہ**	101
41	**فصل اول: علم الوحی اور منصبِ رسالت سے متعلق ابہامات**	102
42	علم وحی سے متعلق علمائے اسلام کی توضیحات	103
43	اقسام وحی	105
44	وحی کے حوالے سے سرسید کی عقلیت پسندی	111
45	وحی سے متعلق جدید مستشرقین کے شبہات	112

46	قرآن وحدیث کی روشنی میں مقام ومنصبِ رسالت	123
47	واقعہ شق صدر اور اس پر اعتراضات کا جائزہ	128
48	لزلے ہزلٹن(Lesley Hazelton: 1945-2024)کا ابہام	133
49	فترۃ الوحی سے متعلق مباحث	136
50	فترۃ الوحی سے متعلق اعتراضات	139
51	پروفیسر واٹ، ولیم میور اور کارلائل کے اشکالات کا تجزیہ	140
52	خلاصہ بحث	147
53	**فصلِ دوم: عصمتِ انبیاء اور عقیدۂ ختمِ نبوت سے متعلق کلامی مباحث**	149
54	عصمت انبیاء- قرآنی آیات کی روشنی میں	150
55	عصمت انبیاء-احادیث کی روشنی میں	153
56	عصمتِ انبیاء اور فقہائے کرام	157
57	عصمت انبیاء کی کلامی تعبیر	162
58	مستشرقین کے اشکالات کا محاکمہ	167
59	عصمتِ انبیاء اور آزادئ اظہارِ رائے کا مغربی تصور	173
60	عقیدہ ختم نبوت از روئے قرآن وحدیث	176
61	عقیدۂ ختمِ نبوت اور دلائلِ قرآنی	178
62	عقیدہ ختم نبوت احادیث کے تناظر میں	180
63	ختمِ نبوت کے اصطلاحی مفاہیم	182
64	عقیدہ ختم نبوت اور اجماع امت	184
65	عقیدۂ ختمِ نبوت عقلی دلائل کی روشنی میں	185
66	مہرِ نبوت کی تفصیل اور امام سہیلی	189
67	کتب سماویہ میں ختمِ نبوت سے متعلق بشارات	192
68	مدعیانِ نبوت کی تاریخ اور تحفظ ختمِ نبوت	199
69	خلاصہ بحث	204

70	**باب چہارم: معجزات النبی ﷺ سے متعلق عصری اشکالات کا تجزیہ**	206
71	**فصل اول: معجزات النبی ﷺ سے متعلق کلامی مباحث**	207
72	علاماتِ نبوت اور معجزات	211
73	خرقِ عادت کے اعتبار سے معجزہ کی اقسام	217
74	معجزہ اور سحر کے مابین فرق	218
75	معجزات سے متعلق مسلم علماء و حکماء کا کلامی استنباط	222
76	غزالی، رومی، رازی، ابن تیمیہ	223
77	حکماء اور معجزات؛ ابن مسکویہ، ابو نصر الفارابی، ابن سینا اور علامہ ابن رشد	244
78	خلاصہ بحث	248
79	**فصل دوم: معجزات سے متعلق عقلی اشکالات کا تجزیہ**	249
80	معجزات سے متعلق مستشرقین کے نظریات: ڈیوڈ ہیوم، ہکسلے، ولیم جیمز، سینٹ آگسٹن	250
81	برصغیر کے جدت پسند مسلم مفکرین کی آراء کا تجزیہ؛ سرسید، غلام احمد پرویز، عبد اللہ چکڑالوی، جے اسلم راجپوری، جاوید غامدی	256
82	خلاصہ بحث	304
83	**نتائج بحث**	305
84	**تجاویز و سفارشات**	309
85	**فہرست قرآنی آیات**	311
86	**فہرست احادیث**	316
87	**فہرست مصادر و مراجع**	319

اظہار تشکر

اللہ سبحانہ وتعالی کا بیش بہا شکر ہے جس کی توفیق و عنایت سے یہ تحقیقی مقالہ اپنے اختتام کو پہنچا اور لاکھوں درود و سلام اس عظیم ہستی پر جن کی ذات و سیرت کے حوالے سے بندہ اس ادنیٰ کاوش کو پیش کرنے کے قابل ہوا۔

استاد محترم، پیکر شفقت و محبت، صاحب علم و عرفان جناب پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی دامت برکاتہم جن کی بھرپور سرپرستی، محنت اور راہنمائی کی بدولت یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا اور انکی حوصلہ افزائی سے بندہ کو اس قابل بنایا کہ اس موضوع کی خاردار وادیوں اور گھاٹیوں کو عبور کرنے کی سعی میں کامیاب ہوا، خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔

علاوہ ازیں صدر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، عظیم محقق جناب محترم ڈاکٹر ریاض احمد سعید صاحب، کو آرڈینیٹر جناب ڈاکٹر عبد الرؤف صاحب کے تعاون اور خصوصی شفقت و محبت کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے مقالہ ہذا کی تکمیل کے جملہ معاملات کے لیے مناسب وقت فراہم کرنے میں تعاون کیا جبکہ اساتذہ کرام شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، میرے سابق سپروائزر جناب ڈاکٹر سید شاہد ترمذی صاحب کا بھی خصوصی شکریہ کہ جن کی سرپرستی میں اس کام کا ابتدائی خاکہ تیار ہوا۔

اور ان تمام دوستوں مختلف مکتبہ جات، اور اہل علم و فضل کا انتہائی احسان مند ہوں کہ جنکے تعاون کے بغیر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا مشکل تھا۔

طالب دعا

سعید عبد اللہ

انتساب

محسن انسانیت، فخر کون و مکاں، رحمت للعالمین جناب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام

کہ جن کی سیرت تا قیامت انسانیت کے لیے ہر طرح کے

حالات میں مشعل راہ ہے۔

باب اول: تعارفی مباحث: موضوع تحقیق اور منہج تحقیق

فصل اول: موضوع تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث

فصل دوم: سیرت نگاری کے مدارج و مناہج اور کلامی موضوعات سیرت

فصل سوم: منتخب عربی تصانیف اور ان کے کلامی موضوعات کا جائزہ

فصل اول: موضوع تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث

تحقیق ہٰذا کا موضوع در حقیقت کلامیات سیرت سے متعلق ہے۔ کلامیات سیرت سے مراد سیرت النبی (صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم) سے متعلق وہ مباحث و موضوعات ہیں جن کی تعبیر و تفہیم میں عقلی استدلال کا اختلاف واقع ہوا ہے (جیسے وحی اور معجزات) یا ایسے مسائل اور واقعات سیرت ہیں جن پر عقلی اعتراضات وارد ہوئے (جیسے دفاع و جہاد اور تعدد ازواج) اور علمائے اسلام نے ان علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ کی بنیاد پر ان کا مؤثر دفاع کیا۔ ایسے تمام موضوعات، بعض کتب سیرت میں زیر بحث آئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح عمری کی ترتیب و تدوین ہجرت مدینہ کے بعد باقاعدہ شروع ہوئی۔ اس کا آغاز، مغازی کے بیان سے ہوا۔ ابتدائی دو سو سال میں جمع و تدوین کے مراحل ایسے مواد سے متعلق رہے جو کہ مغازی کی تفصیلات اور سیرت کے واقعات پر مبنی تھا۔ دوسری صدی ہجری کے اختتام اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مطالعہ سیرت کی نئی جہات سامنے آگئیں جس کے نتیجے میں سیرت کے عنوانات و واقعات کا عقلی و کلامی انداز سے مطالعہ شروع ہوا۔

اس منہج کی پہلی وجہ تو اسلامی تہذیب کی وسعت تھی جس کی بنیاد پر، اسلام کا مکالمہ و مقابلہ دیگر مذاہب، فلسفوں اور تہذیبوں سے ہونے لگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت یونانی فلسفہ وفنون کا وسیع پیمانے پر عربی زبان میں ترجمے کا کام شروع ہوا تھا جس کے باعث مسلمان اہل علم نے بھی یونانی منطق، فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کا مطالعہ کر کے یونانی انداز استدلال اختیار کرنا شروع کیا۔ لہذا اس وقت سیرت کے عمومی تاریخی، فقہی اور قانونی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ علم کلام اور علم عقائد کے مسائل سے متعلقہ پہلوؤں پر بھی کام کیا جانے لگا۔

گویا نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت کے دلائل اور شواہد پر جب تصنیفی کام کا آغاز ہوا اور انبیائے سابقہ کے معجزات و دلائل سے ان کا تقابل کیا جانے لگا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس موضوع کو زیادہ مؤثر اور بلیغ انداز میں بیان کرنے کیلئے ضروری ہے کہ نبوت اور رسالت اور وحی و الہام کے حوالے سے منطقی و عقلی نقطہ نظر سے بھی غور کر کے ایسے عقلی دلائل کو مرتب کیا جائے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے دلائل سے کامل اطمینان اور شرح صدر محسوس نہ کر سکیں وہ دلائل ان کیلئے مفید اور معاون ثابت ہوں۔ تاہم یہ ہر زمانے کی ضرورت ہے کہ اس دور

کے علمی اور فکری ذوق کے مطابق سیرت کو مدلل اور مؤثر انداز سے پیش کیا جائے تاکہ دین اسلام کے اس بنیادی مصدر کی پذیرائی صحیح معنوں میں ممکن ہو سکے، اور دینی موضوعات کی عصری معنویت بھی ان میں سموئی جا سکے۔

تحقیق ہٰذا کے لیے سیرت کے بنیادی مصادر میں سے تین کا انتخاب کیا گیا ہے، جن کے مصنفین کا تعلق پانچویں سے ساتویں صدی ہجری (گیارہویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک) سے ہے جب فن سیرت نگاری اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا اور ان کتب کا وقار اور اعتبار آج بھی قائم ہے۔ مطالعہ کے لیے منتخب کتب میں ایک معروف تصنیف شیخ ابو القاسم السہیلی (1185-1114ء) کی الروض الانف ہے جو کہ انہوں نے سیرت کی سب سے پہلی مدون کتاب السیرۃ النبویہ (سیرت ابن ہشام) کی جامع شرح کے طور پر لکھی گئی ہے۔ دوسری کتاب الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ ہے جس کے مصنف قاضی عیاض مالکی (1083-1149) ہیں۔ جب کہ تیسری منتخب کتاب حافظ ابن قیم (1292–1350ء) کی مشہور تصنیف زاد المعاد ہے۔

تحقیق ہٰذا میں مذکورہ تینوں کتب میں شامل مباحث میں سے کلامی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور کلامیات سیرت کی عہد حاضر میں معنویت سے بحث کی گئی ہے۔ مزید برآں، اس سلسلہ کے جدید علمی و عقلی اعتراضات کا تجزیہ شامل تحقیق کیا گیا ہے۔

عصر حاضر میں سیرت طیبہ اور اس سے متعلقہ موضوعات پر نت نئے عقلی و منطقی انداز سے شکوک و شبہات اور اعتراضات و اشکالات وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا، علمی حلقوں میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ نبوت و رسالت کی تشریح و توضیح ایسے عقلی و منطقی انداز سے کی جائے کہ جس سے مسلم اور غیر مسلم مصنفین و مفکرین کے اعتراضات اور جدید مسلم ذہن کے شبہات و سوالات کا تحقیقی تجزیہ پیش کیا جائے۔ مزید برآں، کلامی مباحث سیرت کی عصری معنویت کو بنیاد بنایا گیا ہے تاکہ عہد حاضر میں، سیرت کے طلبہ کو درپیش سوالات و شبہات اور چیلنجز کے حل اور جواب کے لیے رہنمائی کے خطوط ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جواز تحقیق:

عصر حاضر میں سیرت طیبہ اور اس سے متعلقہ موضوعات پر نت نئے عقلی و منطقی انداز سے شکوک و شبہات اور اعتراضات و اشکالات کے تناظر میں، اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ نبوت و رسالت کی تشریح و توضیح ایسے عقلی و منطقی انداز میں کی جائے کہ جس سے ملحدین اور دیگر غیر مسلم حضرات کے اعتراضات کا بالعموم اور

مسلمانوں کے شبہات و سوالات کا بالخصوص جواب پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ادب سیرت میں کلامیات پر مشتمل اہم کتب سیرت کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی روشنی میں عہد حاضر میں درپیش سوالات و شبہات کے حل اور جواب کے لیے رہنمائی کے خطوط ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

علوم اسلامی میں علم کلام کی ضرورت

علم کلام سے مراد، اسلامی فلسفے کی وہ بنیادی صورت ہے، جس کے تحت، دین اسلام کی تفہیم، تبلیغ اور دفاع کے لیے عقلی اور نقلی استدلال اور قیاسات سے کام لیا جاتا ہے۔ اس علم کا باقاعدہ آغاز دوسری صدی سے ہجری سے ہوا، اور ارتقائی سفر جاری و ساری ہے۔ علم کلام کا نفس مضمون دین متین کے ذوو جہین مسائل سے زیادہ متعلق ہے، یعنی ایسے مسائل و مباحث سے ہے جن کی تعبیرات دو یا زائد پہلوؤں سے ہو سکتی ہیں۔ جیسے مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر۔ تاریخ اسلام میں ایسے اختلافی مسائل کی بنیاد پر، باقائدہ فکری و عملی طبقات وجود میں آتے رہے ہیں۔

اصطلاحی طور پر علم الکلام سے مراد وہ علم ہے کہ جس کی غرض اسلامی عقائد و نظریات کی حقانیت کو ازروئے عقل مضبوط وراسخ بدلائل ثابت کر کے ان عقائد میں پیش آمدہ توہمات اور کمزوریوں کو رد کیا جائے۔ چونکہ اس علم میں عقائد و نظریات پہلے سے وجود پذیر ہوتے ہیں اور صرف عقلی دلائل کے ذریعے ان کی حقانیت وراسخیت کے ثبوت کی کوشش کی جاتی ہے۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:(هو علم يتضمن الحجج عن العقائد الايمانية بالادلة العقلية والرد علىٰ المبتدعة المنحرفين فى الاعتقادات عن مذاهب السلف واهل السنة)[1]۔ اس طرح علامہ جرجانی کے ہاں علم الکلام کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے : (علم يبحث فيه عن ذات الله تعالىٰ وصفاته و احوال الممكنات من المبدا والمعاد على قانون الاسلام)[2](یعنی علم الکلام وہ علم ہے جس میں ذات خداوندی، صفات اور ممکنہ احوال جیسے مبدا و معاد سے اسلامی قانون کے تحت بحث کی جاتی ہے)۔

اسی طرح علامہ سید شریف جرجانیؒ نے شرح المواقف میں علم کلام کی تعریف درج ذیل الفاظ سے کی ہے : (هو علم يقتدر مع على اثبات العقائد الدينية على الغير بايرادا الحجج ودفع الشبه) [3] (یعنی علم کلام سے مراد ایسی علمی شاخ ہے کہ انسان اس کے حصول سے اتنا قادر ہو جاتا ہے کہ کسی غیر پر عقائد دینیہ کا

---

[1] ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد، تاریخ العبر، دار ابن حزم، 2010ء، 1\485

[2] الجرجانی، سید شریف، معجم التعریفات، دار القلم، بیروت، لبنان، 1984ء، ص458

[3] الجرجانی، سید شریف، معجم التعریفات، دار القلم، بیروت، لبنان، 1984ء، ص458

اثبات کر سکے اور اپنے عقیدے پر دلائل کے ساتھ ساتھ شبہات واعتراضات کا رد کر سکے)۔

علم الکلام کی ابتداء و آغاز کے حوالے سے مؤرخین کہتے ہیں کہ اس کا آغاز صدرِ اسلام سے چلا آ رہا ہے چنانچہ اس کا سب سے پہلا مسئلہ جس پر اس زمانے میں بحث واختلاف کا آغاز ہوا وہ جبر واختیار کا مسئلہ تھا۔ اسی طرح ایک سبب مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کا باہمی میل جول اور اختلاط بھی علم الکلام کے آغاز وابتداء کا سبب بنا جیسے مسلمانوں نے ایرانیوں، رومیوں، اور مصریوں سے تعلقات وروابط پیدا کیے تو اسلامی عقائد کے دیگر مذاہب کے ساتھ اختلافات واضح ہوئے اور یوں تعارض و ٹکراؤ پیدا ہوا۔ اہل علم مسلمانوں نے اسلامی بنیادی عقائد کے تحفظ و دفاع میں کلامی بحثیں شروع کیں اور یوں علم کلام نے ارتقائی سفر کا آغاز کیا۔

مختلف اسلامی سلطنتوں اور حکومتوں میں وسعت اور پھیلاؤ کے پیش نظر دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے جب دین اسلام قبول کرنا شروع کیا تو انہوں نے قوانینِ اسلامی کی اتباع کے طور پر غیر اسلامی قوانین کو خیر باد کہا مگر بعض معاملات میں وہ اپنے عقیدے وعلم کے مطابق قرآنی و اسلامی تفاسیر بیان کرتے رہے جس کے باعث اہل علم نے یہ کوشش کی کہ کلامی مباحث سے اسلامی عقائد کی وضاحت کر کے لوگوں کو خود ساختہ عقائد میں مبتلا ہونے سے محفوظ کیا جائے۔ اس علم کی پیدائش انہیں چیدہ چیدہ وجوہات کی وجہ سے ممکن ہوئی۔[1]

علم الکلام کو علوم میں بہت اہم مقام حاصل ہے بلکہ چند اہل علم نے تو اس علم کو رئیس العلوم قرار دیا ہے۔ کیونکہ علوم عالیہ اور علوم مقصودہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف وغیرہ میں سے جس علم کو بھی اگر اٹھایا جائے تو اس میں علم کلام کا کوئی نہ کوئی دخل ضرور ہو گا۔

اسی طرح اگر علم اصول فقہ پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی علم کلام کا بڑا اثر نظر آئے گا۔ کیونکہ اصول فقہ کی تقریباً قدیم کتب جیسے علامہ فخر الاًاسلام بزدوی کی "اصول"، امام فخر الدین الرازیؒ کی "المحصول" علامہ ابن حاجبؒ کی "المختصر" اور علامہ محب اللہ بہاریؒ کی "مسلم الثبوت" کے جملہ صفحات علم کلام اور اس کے مباحث سے لبریز ہیں۔ تصوف پر لکھی گئی اکثر کتب علم کلام سے بھری پڑی ہیں۔

امام غزالیؒ کی "احیاء علوم الدین" جو تصوف کے مبادی واصول بیان کرتی ہے اس کی ابتداء امام غزالیؒ نے کتاب العقائد سے کی ہے۔ جس میں علم الکلام کے اہم مباحث، الہیات، نبوات اور سمعیات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات جس کے اکثر خطوط میں کلامی مباحث کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی طرح علم تصوف کی معروف و مسلم کتاب "التعرف فی اصول التصوف" جو کہ امام کلاباذی کی تصنیف ہے۔ اس کی ابتداء بھی علم العقائد کی ابحاث

---

[1] السبحانی، محمد تقی، بحوث فی الملل والنحل، نشر العلوم، اصفہان، 1\226

شامل کی گئی ہے اور "الرسالۃ القشیریۃ" نامی تصوف کی اہم کتاب بھی علم العقائد والکلام کے مباحث پر مشتمل ہے۔

سیرت وتاریخ میں علم کلام کی اہمیت:

مطالعہ سیرت میں آپؐ کی نبوت ورسالت کا معجزات سے ثبوت، عقیدہ ختم نبوت، حشر الاحساد جیسے مباحث، علم الکلام کے ذریعے واضح کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ذخیرہ احادیث میں بعض روایات ایسی ہیں جو عقیدہ اور صفات متشابہات سے متعلق ہیں اور ان کے ظاہر پر اگر عمل کیا جائے تو انسان "تجسیم وتشبیہ" کے دائروں میں گم ہو جاتا ہے۔

کلامی فرقوں میں سے خوارج کا پہلا فرد عہد رسالت میں ظاہر ہوا۔ یہ ایسا شخص تھا جس نے نبی کریمؐ پر اس وقت طعنہ زنی کی تھی کہ جب آپؐ جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے۔ اس نے کہا: (اے محمد ﷺ! عدل کیجیے! میرے زعم میں آپ ﷺ عدل نہیں فرمارہے۔ آنحضرت ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: تم ہلاک ہو جاؤ اگر میں عدل نہیں کر رہا تو اور کون عدل کرے گا؟۔ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے کہ اسی ذوالخویصرہ التمیمی کا ہم خیال گروہ ہی بعد میں بہ صورت خوارج ظاہر ہوا تھا۔[1]

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد امت میں کئی فتنوں نے سر اٹھایا جن میں نبوت کے جھوٹے دعویدار، مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور دیگر کئی بنیادی اسلامی تعلیمات کے منحرفین شامل ہیں۔ اور اسی طبقے نے دور عثمانی میں حکومت وسلطنت کے نظام اور دائرہ اختیارات کو چیلنج کیا تھا۔[2] بعد میں دور علی المرتضیٰؓ جب آیا تو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے جنگ صفین کے موقع پر "تحکیم" کا موقف اپنایا تو خوارج کا گروہ سامنے آیا جس نے اپنے استدلال کی بنیاد علم کلام پر رکھی۔

دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں، فرقہ معتزلہ وجود میں آیا۔ معتزلہ کے مذہب کی اساس عقل وفلسفہ پر ہے چنانچہ یہ خلافِ عقل قطعیات میں تاویل کرتے ہیں اور ظنی دلائل کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرتے ہیں اور انسانی اعمال کے حسن وقبح کی بنا پر رب کریم کے افعال پر بھی حسن وقبح کا حکم لگاتے۔

کلامی فرقوں میں ایک طبقہ اشاعرہ کا ہے جو کہ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری کی جانب منسوب ہے۔ اس فرقے کا ظہور چوتھی صدی اور اس کے بعد ہوا ابتداءً اشعری اعتزال کے قائل تھے پھر کلام الٰہی، صفات باری تعالیٰ

---

[1] العسقلانی، ابن حجر، فتح الباری، دارالعرفۃ، بیروت، 2005ء، 12\292

[2] النیسابوری، ابوعبداللہ حاکم، المستدرک الحاکم، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت، 2009ء رقم: 8394، 4\499

اور تقدیر کے مسئلے میں ابن کلاب سے متاثر ہوئے پھر اشاعرہ کے عقیدہ نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور عقلی و کلامی اور صوفیانہ مناہج میں گہرائی اور توسع اختیار کیا حتی کہ آٹھویں صدی میں ایک عقلیاتی، فلسفیانہ جبری فرقے کے طور پر سامنے آئے چنانچہ علامہ اشعری اپنے اس عقیدے میں تین مراحل سے گزرے ہیں۔

تیسرے مرحلے میں ابو الحسن اشعری نے منہج سلف کو اپنایا اور جملہ صفات باری تعالیٰ کو بلا تحریف و تاویل ثابت مانا۔ علامہ اشعری نے بعد ازاں ان تمام عقائد سے رجوع کر کے اکابر و اسلاف کے منہج کو اختیار کیا جبکہ فقہ میں امام اشعری کا مذہب شافعی تھا۔[1]

ماتریدیہ بھی ایک نامور سنی متکلم مکتب فکر ہے جو امام ابو منصور الماتریدی کی جانب منسوب ہے ابتداءً ابو منصور ماتریدی نے عقائد اسلامیہ کے اثبات کے لئے کلامی و عقلی دلائل پر زیادہ انحصار کیا۔ یہ لوگ فروع میں امام ابو حنیفہ کے مقلد تھے۔ الماتریدیہ ایمان کے حوالے سے اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے۔ لیکن چند لوگوں نے زبانی اقرار کو بھی ایمان کی تعریف میں شامل کیا ہے اسی طرح ماتریدیہ آخرت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے دیدار کے قائل ہیں۔[2]

اسماعیلیہ فرقے کے مطابق حضرت جعفر الصادق کے بعد ان کے بڑے بیٹے اسماعیل یا ان کے بیٹے محمد امام ہیں اس فرقہ کا اہم عقیدہ مختلف آیات و روایات اور احکامات اسلامی میں تاویل ہے ان کے مطابق متون دینیہ و اسلامی معارف ظاہری و باطنی معانی رکھتے ہیں، امام ان کے سارے باطن کا علم رکھتا ہے اور فلسفہ امامت تعلیم باطن دین و بیان معارف باطنی ہے۔[3]

کتب سیرت میں کلامی مباحث کا تعارفی جائزہ:

سیرت طیبہ ﷺ کے کلامی مباحث یا کلامیات سیرت کی اصطلاح ان موضوعات کے لیے استعمال کی جاتی ہے کہ جن کا تعلق اصلاً علم کلام سے ہو مگر سیرت کے مختلف واقعات و حقائق سے بھی ان کی گہری مناسبت اور ربط ہو۔ اسی طرح کلامیات سیرت میں وہ تمام واقعات داخل ہیں کہ جن کا تعلق بظاہر تو سیرت کے ساتھ ہو لیکن ان کے مطالب و معنی کی تفہیم کلام کے مطالعہ کے بغیر دشوار ہو کیوں کہ سیرت کے بہت سے واقعات و مباحث کی کئی جہات اور پہلو ایسے ہیں کہ جن کا تعلق علم کلام سے ہے اور کلامی مباحث کو جانے اور سمجھے بغیر ان کی معنویت و

---

[1] النیسابوری، ابو عبد اللہ حاکم، المستدرک الحاکم، ص528

[2] خمیس، محمد بن عبد الرحمٰن، ڈاکٹر، منہج الماتریدیہ فی العقیدہ، دار احیاء التراث، بیروت، 2000ء، ص115-120

[3] الشہرستانی، محمد بن عبد الکریم، الملل والنحل، 171، 170/1

حقیقت کو سمجھنا کافی مشکل ہے چنانچہ ایسے تمام مشترکہ موضوعات جن کا تعلق علم کلام اور علم سیرت دونوں سے ہو ان کو سیرت کے کلامی مباحث یا کلامیات سیرت کہا جاتا ہے۔

نبوت اور تصورِ نبوت کے حوالے سے ایک اور پہلو بھی سیرت نگاروں کے ہاں زیرِ بحث ہے کہ سابقہ انبیاء کا سلسلہ نبوت نبی کریمؐ کی آمد کی تمہید و مقدمہ ہے۔ چنانچہ مختلف اقوام کو حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل دینی و فکری اور ذہنی و روحانی لحاظ سے ان کی تربیت کر کے تیار کرنے کا مقصد آنحضرت ﷺ کی نبوت کے لیے چوکس و تیار کرنا تھا بایں وجہ تمام قدیم و نامور سیرت نگاروں نے سیرت کی اپنی تصنیف کردہ کتب کا آغاز سابقہ انبیاء اور نبوت کے ذکر سے کیا ہے۔ جبکہ ماضی قریب کے ہر قابلِ ذکر سیرت نگار نے سلسلہ نبوت کو سیرت کا مقدمہ و تمہید ہی قرار دیا ہے جو کہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سلسلہ نبوت، منصبِ نبوت اور اس کے بلند رتبہ حاملین سیرت النبی کا مقدمہ و تمہید تھے، جس کو سمجھے بغیر سیرت طیبہ کو سمجھنے کی کوشش کرنا نبوت کے رتبہ و مقام کی تفہیم میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ تبھی دلائلِ نبوت اور کلامیاتِ سیرت علمِ سیرت کا ایک اہم جزو قرار پائے۔

سیرت نگاروں میں سے بعض کے ہاں صرف تاریخی واقعات ملحوظ خاطر تھے مثلاً ابن ہشامؒ کہ جنہوں نے اشارتاً اور ان کے شارحین نے صراحتاً ان تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ علامہ ابو القاسم سہیلیؒ نے اپنی کتاب الروض الانف جو کہ سیرت ابن ہشام کی معروف و مستند شرح ہے کلامی مسائل کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔ روح اور نفس کی بحث میں تفصیل کے متعلق آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ۸ صفات یہ ہیں حیات، قدرت، علم، ارادہ، سماعت، بصارت، کلام اور تخلیق۔

لہٰذا، تحقیق ہٰذا کے لیے موزوں ہے کہ ان کلامی مسائل کو جو سیرت طیبہ کے سیاق و سباق کے حوالے سے معروف ہیں، نشاندہی کر کے ان مسائل کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

1. رسالت و نبوت کی حقیقت اور ضرورت و اہمیت
2. نبی اور رسول کی ذمہ داریاں اور فرائض
3. حقیقت وحی، ضرورت اور اقسام
4. علم کے دیگر ذرائع
5. ختم نبوت اور حقانیت پیغمبر صلی اللہ علیہ علیہ وسلم
6. رسول اللہؐ کے خصائص و فضائل
7. کلام اللہ کی حقیقت اور مسئلہ خلق قرآن
8. معجزات نبوی ﷺ

9. واقعہ معراج، معراج اور اسراء سے متعلق مباحث

10. عصمت انبیاء اور بشائر الانبیاء

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں سیرت طیبہ کا مطالعہ ایک جدید جہت سے سامنے آیا کہ واقعات سیرت اور موضوعات کا مطالعہ عقلی و منطقی اور کلامی انداز سے کیا جانے لگا جس کے اس وقت کے مطابق دو بنیادی اسباب تھے ۔پہلا سبب تو یہ تھا کہ اس زمانے میں یونانی علوم و فنون کا وسیع پیمانے پر عربی ترجمے کا کام شروع ہوا مسلمان محققین و اہل علم نے یونانی قدیم منطق، فلسفہ اور دیگر یونانی علوم کا مطالعہ کیا اور بہت سے مسائل پر ان کے اسلوب فکر، یونانی انداز استدلال اور نقطہ نظر سے غور کرنا شروع کیا یہ وہی وقت تھا کہ جب بہت سارے غیر مسلم اہل علم کے علاوہ مسلم دانشوروں کا ایک کثیر طبقہ بھی یونانی منطق اور علوم و فنون سے متاثر ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس طبقہ کی جانب سے جس میں اس وقت کے مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل تھے مجموعی طور پر اسلام اور اس کے بنیادی عقائد کے حوالے سے ایسے ایسے سوالات اٹھائے گئے کہ جن کا جواب یونانی انداز استدلال کو اختیار کیے بغیر مشکل تھا اسی وجہ سے اس وقت کے علماء و محققین نے یونانی منطق اور فنون و علوم سے واقفیت حاصل کر کے انہی کے طرز استدلال کے مطابق اسلامی عقائد کا بیان اور ان عقائد پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات دینے کا طریقہ اختیار کیا چنانچہ ایسے حالات میں سیرت نگاران وقت نے یہ محسوس کیا کہ اب اس وقت سیرت کے عمومی، فقہی و تاریخی اور قانونی پہلوؤں سے ہٹ کر ان پہلوؤں پر بھی غور وخوض اور کام کی ضرورت ہے کہ جن کا تعلق عقائد اور کلام کے مسائل سے ہے۔

اس حوالے سے علمی کام کی ضرورت کا تب بھی زیادہ احساس کیا گیا کہ آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت کے دلائل و براہین اور شواہد و حقائق پر جب تصنیفی و تالیفی کام کا آغاز ہوا اور پھر انبیاء سابقہ کے معجزات اور ان کے فضائل کا تقابل کیا تو یہ واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ اس موضوع کو زیادہ موثر اور بلیغ و واضح انداز میں بیان کرنے کیلئے یہ بات زیادہ ضروری ہے کہ وحی، نبوت اور رسالت و دیگر متعلقہ موضوعات پر خالصتاً عقلی و منطقی انداز سے بھی غور وخوض کیا جائے اور قلبی اطمینان کیلئے دلائل عقلیہ کو مرتب کرنے کے کام کا آغاز کیا جائے اور ان لوگوں کی تسلی واطمینان کی ہر ممکن کوشش کی جائے جو صرف قرآن و سنت کے دلائل سے شرح صدر نہیں محسوس کر رہے تھے۔

لہٰذا، دوسری صدی ہجری کے خاتمے اور تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں مطالعہ سیرت کی نئی جہات سامنے آئیں چنانچہ اسی کے نتیجے میں سیرت طیبہ کے عنوانات و واقعات کا عقلی و کلامی انداز سے مطالعہ شروع ہوا ۔نبوت و رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل اور شواہد پر انبیاء سابقہ کے معجزات و دلائل سے تقابلی کام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔اس ضرورت بھی محسوس کیا گیا کہ اس موضوع کو زیادہ مؤثر اور بلیغ انداز میں بیان کرنے کے لیے ضروری

ہے کہ نبوت ورسالت اور وحی والہام کے حوالے سے منطقی و عقلی نقطہ نظر سے بھی غوروفکر کر کے ایسے دلائل کو مرتب کیا جائے تعقل پسند طبقات بھی کامل اطمینان اور شرح صدر محسوس کریں۔

موضوع تحقیق سے متعلق کام کا جائزہ: (*Literature Review*)

سیرت النبی سے متعلق کلامی مباحث کے حوالے سے مختلف جہات پر مبنی تحقیقی کاوشیں منصہ شہود پر آتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے سیرت النبی کے بنیادی مصادر سمجھی جانے والی ابتدائی عربی جلیل القدر تصانیف کا ذکر ضروری ہوگا۔ اس کے بعد اردو ادب سے سیرت اور مستشرقین کی چند کتب، پر بالترتیب تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے:

السیرۃ النبویۃ:

یہ کتاب سیرۃ النبی کی پہلی مکمل اور جامع تصنیف ہے جس میں عبدالملک ابن ہشام (691-743ء) نے سیرت طیبہؐ کو واقعاتی ترتیب میں لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے اشارتاً کلامی مباحث کی نشان دہی کی ہے جبکہ تفصیلی کلام سے گریز کیا ہے۔ ابن ہشام کا انداز مؤرخانہ زیادہ ہے کیونکہ تاریخی واقعات اور تفصیلات کے علاوہ دیگر موضوعات کی طرف جھکاؤ کم تھا۔ یہ کتاب دراصل سیرت ابن اسحاق کی تلخیص و تہذیب ہے۔

الطبقات الکبریٰ:

طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور اسلامی تاریخ کی یہ عظیم تصنیف محمد بن سعد البغدادی (784-845ء) کی کاوش ہے۔ اس کتاب میں صحابہ اور تابعین کے حالات زندگی ذکر کیے گئے ہیں۔ کتاب کا ابتدائی حصہ سیرت پر مشتمل ہے اور مکمل کتاب کے آٹھ حصوں میں ہے۔ یہ کتاب اسلام کی پہلی دو صدیوں کے مشاہیر کے حالات پر مشتمل ہے اور سیرت کے قدیم اور مستند مصادر و مآخذ میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی وجہ بھی یہ ہے کہ مصنف مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محدث بھی تھے۔ اس کتاب میں سیرت کے ان واقعات کی مستند تفصیل موجود ہے جن پر بعد کے کلامی موضوعات کا انحصار ہے۔

دلائل النبوۃ:

دلائل نبوت پر جن سیرت نگاروں نے کلامی استدلال کے ساتھ کام کیا ہے ان میں سے سب سے قدیم اور مستند کتاب علامہ ابونعیم (948-1038ء) کی ہے۔ جس میں آنحضرتؐ کے متعلق ذکر کردہ بشارات، فضائل اور قرآنی تاثیر وغیرہ کا تذکرہ تھا۔ بعد میں انھوں نے خود ہی دو جلدوں میں اپنی کتاب کا خلاصہ لکھا اور اس میں خصائص سیرت، حضورؐ کے ارشادات واحکامات سابقہ کتب آسمانی کی روشنی میں اور قرآن کریم میں مذکورہ فضائل کا تذکرہ

کیا۔ یہ کتاب جو تلخیص پر مبنی ہے موجود ہے۔ کتاب 35 ابواب اور فصول پر مشتمل ہے اور شروع میں جاندار مقدمہ ہے جس میں انسانی نفسیات اور انسانوں میں پائی جانے والی اخلاقی و روحانی صفات اور کمزوریوں کا تذکرہ ہے اور ایک اسکے بعد نبوت کی نفسیاتی اور روحانی تعبیر کرتے ہوئے فضائل قرآن، آپؐ کا انسانیت کا سردار ہونا، کتب سابقہ میں آپؐ کا تذکرہ، اخلاقِ کریمہ، صفات نبوی، وحی نبوت، تاثیر قرآن اور معجزات کو ذکر کیا گیا ہے۔

دلائل النبوۃ للبیہقی:

مذکورہ کتاب امام ابو بکر احمد بن حسین البیہقی (994-1066ء) کی مشہور کلامی تصنیف ہے جو معجزات النبیؐ، دلائل نبوت، آپؐ کی طہارت میلاد، اسماء وصفات اور حیات و ممات کے جملہ پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ امام بیہقیؒ اپنے معاصرین میں حفظ الحدیث، اتقان، علوم وفنون میں مہارت اور حسنِ تصنیف میں ممتاز و منفرد تھے تبھی ان کی تصنیف شدہ اس کتاب کو علامہ تاج الدین السبکیؒ نے بے نظیر و بے مثال قرار دیا ہے جبکہ علامہ ابن کثیرؒ سیرت و شمائل کے باب میں تصنیف کی گئی تمام کتابوں کا اس کتاب کو سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اس کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ امام بیہقیؒ نے سیرت کو احادیث کی روایاتِ صحیحہ کے ساتھ مزین کر کے ہر قول اور دعوی کے لیے سند پیش کی۔

الروض الأنف:

علامہ عبد الرحمٰن بن عبد اللہ السہیلیؒ (1114-1185ء) نے سیرت ابن ہشام کی یہ تاریخی شرح لکھی ہے اور مذکورہ کتاب کی دیگر شروحات میں سے اس شرح کو سب سے زیادہ قبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب اپنے علمی مواد کے لحاظ سے اب تک مختلف مطالعات اور علمی ابحاث کا مرجع وماخذ ہے جس میں سے لغت سمیت نحو، فقہ، تفسیر، بلاغت اور کلامی موضوعات ومباحث شامل ہیں۔

الشفاء في تعریف حقوق المصطفیٰؐ:

پانچویں صدی ہجری میں لکھی گئی قاضی عیاض مالکی (1083-1143ء) کی یہ تصنیف بھی اہل علم کے ہاں ابھی تک مقبول و معروف ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں آپؐ کے فضائل و شمائل کو صحیح اور مستند احادیث کے مجموعے سے بہت خلوص و محنت سے مرتب کیا جس سے بہت سے سیرت نگاروں اور محدثین نے خوب استفادہ کیا۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ کئی ابواب وفصول کو شامل ہے۔

عصمۃ الأنبیاء:

امام فخر الدین رازی (1150-1210ء) کی تحریر کردہ اس کتاب میں بھی مسئلہ عصمت انبیاء اور قرآن و

حدیث کے تمام دلائل کے حوالے سے تفضیلی بحث اور کلام کیا گیا ہے، کتاب کے نام اور مصنف کے مزاج سے ہر خاص وعام واقف ہے، کلامی استدلال کی بہت اچھی مثال یہ کتاب ہے۔

زاد المعاد:

حافظ ابن القیمؒ (1350-1292ء) کی یہ تصنیف، سیرت کے حوالے سے ایک اہم بنیادی مصدر ہے۔ اس تصنیف کو ادبیات سیرت کے لحاظ سے امتیازی و انفرادی مقام حاصل تھا۔ انھوں نے سیرت کے بعض ایسے پہلوؤں کو زیر بحث لایا ہے جو کسی سیرت نگار نے ذکر نہیں کیے جن میں سے کلامی استدلال کی روشنی میں فقہیات سیرت، روحانیات سیرت، قانونیات سیرت اور سیرت سے عملی راہنمائی کے پہلو شامل ہیں۔ جب کہ اس کے ساتھ ساتھ سیرت طیبہؐ کے کلامی مباحث سے متعلق بہت سے گوشوں پر بھی کام کیا ہے اور سیرت نگاروں کے مابین زیر بحث بعض خصوصی مسائل کو بھی تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

التمہید فی بیان التوحید:

بارہویں صدی کی یہ اہم کتاب علامہ ابو شکور السالمی کی تحریر کردہ اس کتاب میں دعوٰی و اثبات بسلسلہ انبیاء کیا گیا ہے کہ وہ انبیاء نزول وحی سے قبل بھی معصومین اور واجب العصمۃ تھے اور رسول بھی وحی سے قبل رسول ہی تھے اور نبی اور مامون تھے اور بعد از وفات بھی رسول ہی ہوں گے، دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

شامل الرسول، دلائل نبوتہ و فضائلہ و خصائصہ:

مذکورہ کتاب علامہ ابن کثیرؒ (1373-1301ء) کی تصنیف کردہ ہے جس میں آنحضرتؐ کے شمائل مبارک، آپؐ کی نبوت پر نقلی و عقلی دلائل اور نبوت کی خصوصیات و فضائل کا تذکرہ ہے۔ کتاب میں نبوت کے حوالے سے منطقی و عقلی انداز سے استدلال کرتے ہوئے قرآن و حدیث کے دلائل کو ذکر کیا گیا ہے۔

عیون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسیر:

مذکورہ کتاب کے مؤلف محمد بن عبد اللہ بن یحیی بن سید الناس الأشبیلي (1334-1272ء) ہیں۔ کتاب میں آنحضرتؐ کے شمائل، سیرت اور مغازی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مؤلف نے محدثانہ انداز اپناتے ہوئے سیرت اور مغازی پر کلام کیا اور چونکہ مولف خود ایک بڑے درجے کے محدث تھے اس بناء پر کتاب کو بہت مقبولیت حاصل رہی جس کی وجہ سے کتاب کو سیرت کا ایک بہترین ماخذ تصور کیا جاتا ہے۔

شواہد النبوت:

افغانستان کے معروف عالم دین مولانا نورالدین جامیؒ (1492-1414ء) کی تصنیف ہے جو عربی کے

معروف ادیب، مفسر، محدث اور نامور ماہر علم کلام تھے۔ انہوں نے اس کتاب میں حضورؐ کی صفات اور ذات مبارکہ کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے شواہد نبوت کو سات حصوں میں منقسم کیا ہے۔ جن میں شواہد نبوت قبل ولادت، شواہد نبوت وقت ولادت، شواہد نبوت از بعثت تا ہجرت، شواھد نبوت از ہجرت تا وصال، شواہد نبوت بعد از وصال، شواہد نوت بدست صحابہ کرام اور شواہد نبوت بدست تابعین، تبع تابعین اور صوفیائے کرام شامل ہیں۔ کتاب ادبی لحاظ سے بھی ایک بہترین شاہکار ہے جس سے مصنف کی ادبی و شاعرانہ صلاحیت عیاں ہے اور اس کے علاوہ معجزات پر بھی تفصیلی کلام ہے۔

الخصائص الکبری:

یہ کتاب علامہ جلال الدین سیوطیؒ (1505-1445ء) کی تصنیف کردہ ہے جس میں رسول اللہؐ کے معجزات کے حوالے سے معلومات موجود ہیں۔ علامہ سیوطیؒ علم و فضل کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں مگر چونکہ آپؐ سے محبت و عقیدت اور فرطِ جذبات سے جیسے بعض اوقات عام مسلمان دامن تحقیق کو چھوڑ دیتے ہیں انہوں نے بھی اس کتاب میں بعض روایات ایسی ذکر کی ہیں۔ جو روایتی اور درایتی استناد کے اصولوں کے خلاف ہیں۔

سیرت خاتم النبیین:

مذکورہ کتاب کو متاخرین کی کتب میں اہم مقام حاصل ہے جو شیخ ابوزھرہ مصری (1974-1898ء) کی تصنیف کردہ ہے۔ آپ بیسویں صدی کے ممتاز عالم دین اور ماہر اسلامی قانون تھے اور بیک وقت مفکر، محقق اور مصنف تھے جنہوں نے امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ پر کتب لکھیں۔ آپ نے اس کتاب میں سیرت طیبہؐ کے لیے جدید انداز کو اپناتے ہوئے سیرت کو نئے زاویے سے پیش کیا۔

محمدؐ کانک تراہ:

یہ کتاب دکتور عائض بن عبداللہ القرنی (پیدائش 1959ء) کی تصنیف ہے جسے مکتبہ دارابن حزم نے بیروت سے شائع کیا ہے۔ مذکورہ کتاب سیرت طیبہ پر ایک زبردست کتاب ہے جس کو دار ابن حزم نے لبنان سے شائع کیا ہے۔ مولف نے اس کے علاوہ بھی بیسیوں کتب تالیف کیں جو کہ حدیث، تفسیر، فقہ، ادب اور سیرت پر مشتمل ہیں۔

السیرۃ النبویہ:

دکتور علی محمد الصلابیؒ (پیدائش 1963ء) کی تصنیف کردہ سیرت پر ایک بہترین کتاب ہے جس کی تین جلدیں ہیں۔ یہ کتاب سیرت النبیؐ، سیرت صحابہ و صحابیات، سیرت سلف صالحین، ازواج الانبیاء اور اہل بیت کے

تذکرے پر مشتمل ہے جس کو متاخرین کی کتب سیرت میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کی خصوصیات میں سے ہے کہ سیرت و قرآن کریم کے ربط اور مناسبت، واقعات سیرت کے بیان میں اختلافات کے حل، اسلوب میں ادبی چاشنی وغیرہ صفات سے متصف کرنے کے ساتھ ساتھ واقعات سیرت کو قدیم مراجع سے اخذ کر کے موجودہ حالات پر منطبق کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور سیرت کے حوالے سے مستشرقین کے رکیک حملوں کا بھی موثر جواب دیا ہے جس کے لیے تقریباً 350 قدیم وجدید مصادر و مراجع کا استعمال کیا گیا۔

اللؤلؤ المکنون في سیرۃ النبیؐ المأمون:

یہ کتاب شیخ موسیٰ بن راشد العازمیؒ کی تالیف کردہ ہے۔ مصنف نے اس کے لکھنے میں دس سال کا عرصہ لگایا اور خوب جمع و تحقیق سے کام لیا۔ کتاب میں آنحضرتؐ کی پیدائش سے وفات تک تمام احوالِ زندگی کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے اور سیرت کے حوالے سے ایک لاجواب کتاب ہے جس میں تفہیم کے لیے مؤلف نے کئی مقامات پر نقشہ جات سے بھی کام لیا ہے جیسے آپؐ کے نسب نامے اور اولاد وازواج وغیرہ دیگر موضوعات پر انھوں نے نقشہ بنا کر موضوع کو سمجھایا ہے۔

برصغیر کی جدید تصانیف سیرت:

مدارج النبوۃ:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (1642-1551ء) کی لکھی ہوئی اس کتاب میں منصب نبوت کے مراحل یعنی قبل النبوت اور بعد النبوت کے ساتھ ساتھ مقامِ نبوت کو نقلی و عقلی دلائل سے بیان کیا گیا ہے۔

سیرت محمدؐ:

سر سید احمد خان (1817-1998ء) کی یہ کتاب سیرت النبی ﷺ نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ جس میں انھوں نے عقلی و کلامی اعتبار سے سیرت کے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے اور مستشرقین کے موقف کی مکمل تردید کی ہے۔

سیرت النبیؐ:

علامہ شبلی نعمانی (1914-1857ء): اور سید سلیمان ندوی کی تصنیف کردہ یہ کتاب سیرت کی اردو زبان میں اعلیٰ کتب میں سے ہے۔ جس پر اولاً علامہ شبلی نعمانی نے تالیف شروع کی اور پہلی ہی دو جلدیں لکھیں تھیں کہ 1914 میں ان کا انتقال ہو گیا، قبل از وفات انھوں نے اپنے ہونہار طالب علم سید سلمان ندوی کو وصیت کی تھی کہ وہ اس کام کو پایا تکمیل تک پہنچائیں۔ تاہم بقیہ پانچ جلدیں سوم تا ہفتم آپ کے ہونہار شاگرد نے مکمل کیں۔ کتاب کا

انداز بہت عالمانہ اور متکلمانہ ہے اور اس میں سیرت کو دلائل قرآن وحدیث اور عقلی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

رحمۃ للعالمینؐ:

سیرت طیبہ پر قاضی محمد سلیمان منصور پوری (1867-1930ء) کی تالیف کردہ کتاب ہے جو اپنے اسلوب بیان کی قدرت، شستہ تحریر اور سہیل انداز کے باعث ایک منفرد تصنیف ہے۔ اس کتاب میں موضوع و محل کا بطور خاص خیال رکھتے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہوئے اس کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل اس کتاب کو مصنف نے تئیس برس کی محنت اور جدوجہد سے ترتیب دیا۔ واقعات کی صحت کے التزام کے ساتھ سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے۔

سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم:

یہ کتاب مولانا ادریس کاندھلوی (1899-1974ء) کی ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے جس کو مصنف نے غیر معتبر اور غیر مستند روایات سے اجتناب کرتے ہوئے ترتیب دیا ہے کتاب کا بنیادی ماخذ احادیث مبارکہ کو قرار دیکر تمام ذخیرہ سیرت واحادیث کو اخذ کیا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب میں محدثین کے اصولوں اور استدلال کے طرز کو مد نظر رکھا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ مصنف خود ایک محدث ہیں۔

سیرتِ سرور عالمؐ:

مذکورہ کتاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979ء) کی تحریر کردہ دو جلدوں پر مشتمل کتاب ہے جو ادارہ ترجمان القرآن لاہور سے شائع ہوئی۔ جلد اول میں منصب نبوت، نظام وحی، بعثت نبویؐ، ما قبل بعثت کے ماحول اور مخاطب دعوت قوم اور عرب کے مختلف گروہوں کے حالات پر مشتمل ہے جبکہ دوسری جلد آنحضرتؐ کی پیدائش سے لیکر ہجرت مدینہ تک کے احوال وواقعات سے متعلق ہے۔

ضیاء النبیؐ:

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (1918-1998ء) کی لکھی ہوئی یہ کتاب ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی یہ کتاب سیرت طیبہ پر لکھی گئی ایک زبردست اور تفصیلی کتاب ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے اور انھوں نے انیس سال کے طویل عرصے میں اس کو مرتب کیا۔ اسلوب عام فہم اور سادہ ہے اور ان مقامات کی تفسیر کا خصوصی اہتمام کیا ہے جن میں اختلاف ہے۔ عصر حاضر کے لحاظ سے بھی ان کی یہ کتاب بے مثال اور بے نظیر ہے کہ مصنف نے اسکی جلد ہفتم مکمل مستشرقین کی سیرت کے حوالے سے افکار و نظریات اور ان کے اعتراضات کے رد میں تحریر کی ہے۔

انگریزی کتب:

Muhammad and Islam:

مذکورہ کتاب معروف مستشرق ولیم میور (William Muir: 1819-1905)نے لکھی ہے جس میں اس نے آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ اور دین اسلام کے حوالے سے اعتراضات اور تنقیدات کے موضوع پر مفصل انداز میں لکھی جس کا مقصد سیرت اور اسلام میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے۔

The Quran: An Introductory Essay

یہ تھیوڈور نولڈیکی(Theodore Noldeke: 1836-1930) کی کتاب ہے جس میں قرآن کریم اور سیرت کے پر واقعات نقد و جرح اور اعتراضات کا ذکر ہے۔

Muhammad at Mecca and Muhammad at Madina

یہ دونوں کتب معروف مغربی اسکالر اور مستشرق منٹگمری واٹ(William Montgomery Watt: 1909-2006) کی تصانیف ہیں۔ ایک آنحضرتؐ کی مکی زندگی کے حوالے سے لکھی ہے جو مکی سالوں سے لیکر ہجرت مدینہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب سیرت طیبہ پر اعتراضات اور مغالطات سے بھری پڑی ہے جس کو واٹ نے 1953 میں تحریر کیا۔ دوسری کتاب جو اُسنے 1956 میں تحریر کی آنحضرتؐ کی مدنی زندگی پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں بھی سیرت پر اعتراضات کیے گے ہیں۔

Muhammad: the Prophet and Statesman

سیرت پر یہ کتاب بھی منٹگمری واٹ(William Montgomery Watt)کی تحریر کردہ ہے جس میں اسنے آنحضرتؐ کی نبوت اور سیاسی زندگی کے حوالے سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے سیرت کے واقعات وحقائق کی من مانی تشریحات کرتے ہوئے مختلف سوالات اٹھائے ہیں۔

تحقیقی مقالہ جات:

- متکلمین کا تصور نبوت اور اس کے اثرات۔ مقالہ نگار محمد اسلم صدیقی شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی(2012)کام کیا گیا۔ مذکورہ مقالے میں معروف متکلمین کے نبوت کے حوالے سے تصور و افکار کا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

- سیرت نگاری میں مسلکی رجحانات کے اثرات اور عصری تقاضے (مقالہ نگار: نواب امیر خان۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی شعبہ اردو۔ پنجاب یونیورسٹی(2014)کام ہو چکا ہے۔ مذکورہ مقالہ مختلف مسالک کے سیرت نگاروں کے

علمی و تحقیقی کام پر مشتمل ہے۔ جس میں ہر مسلک کے سیرت پر علمی کام کو زیر بحث لا کر عصری تقاضوں کے مطابق جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

- بر صغیر اردو کتب سیرت میں کلامی مباحث کا تحقیقی و تقابلی مطالعہ (2013تا2018) مقالہ نگار شمائلہ اسحاق- علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)۔ اس مقالے میں سیرت طیبہ کے کلامی مباحث پر اُردو کتب سیرت پر بحث کی گئی ہے جس میں مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، پیر کرم شاہ الازہری اور مولانا ادریس کاندھلوی کی کتب شامل ہیں۔ مذکورہ تمام کتب کے کلامی مباحث کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ریسرچ پیپرز:

- عبد اللہ، محمد فاروق، ڈاکٹر، "تصور عصمت انبیاء: مصادر اسلام کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ، القلم، جلد 26، شمار 20 (2021)، ص 59-82
- عبد الغفار، عقیدہ ختم نبوت کی عصری معنویت اور ہماری ذمہ داریاں، ابحاث، جلد 6، شمار، 24، (2021)، ص 24-45
- محمد اسلام، سیرت نبوی کے منتخب موضوعات (نبوت، وحی اور معجزات) سے متعلق لزلے ہزلٹن کی آراء کا تحقیقی جائزہ، برجس، جلد 6، شمارہ 1، (2019) ص: 22-39
- عبد اللہ، فاروق، " آزادی اظہار کی حدود و قیود: مسئلہ عصمت انبیاء اور اقوام متحدہ جرنل آف اسلامک اینڈ ریلیجیس اسٹڈیز، جلد 3، شمارہ 2، (2008) ص: 82-57.
- سعدیہ بیگم المصادر الاسلامية في كتابة السيرة النبوية عند وات من خلال كتابيه (محمد في مكة) و (محمد في المدينة) برؤية نقدية، انکشاف، المجلد: ٢، (٢٠٢٤)، العدد: ٩، ص ١٥-٣٥
- سعدیہ بیگم، تفنيد شبهات وليام مونتجمري وات حول نبوة محمد صلى الله عليه وسلم، انکشاف، (٢٠٢٤) المجلد: ٤، العدد: ١٣، ص ١-١٦
- Al- Shafil, Muhammad muneer'deen Olodo, *William Muir on Qur'anic Composition: A Critical Evaluation of his Imagination*, International journal of Academic Research in Business and social sciences, Vol 14, issue 12,page: 201-210.

منہج تحقیق کی تفصیل

مسئلہ تحقیق کی وضاحت:(*Statement of the Problem*)

زیر نظر تحقیق سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق کلامی مباحث اور ان کی عصری معنویت پر مشتمل ہے۔ اس مقصد کے لیے متقدم اور معتبر عربی تصانیف منتخب کی گئی ہیں۔ سیرت کے موضوعات میں تحدید، نبوات کی کلامی مباحث کی صورت میں کی گئی ہے جس میں علم وحی ورسالت، عصمت انبیاء، عقیدہ ختم نبوت اور معجزات سے متعلق مباحث کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

مقاصدِ تحقیق:(*Objectives of the Study*)

1. سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق کلامی مباحث کا مطالعاتی جائزہ لینا۔
2. منتخب تصانیف سیرت میں موجود کلامی مباحث کی عصری معنویت کے لحاظ سے تجزیہ کرنا۔
3. علم الوحی، منصب رسالت، عصمت انبیاء اور عقیدہ ختم نبوت سے متعلق شبہات واعتراضات کا تجزیہ کرنا۔
4. معجزات کی عقلی تعبیر وتوضیح سے متعلق ابحاث واشکالات کا جائزہ لے کر زیر بحث لانا۔

سوالات تحقیق:(*Research Questions*)

1. منتخب کتب کی روشنی میں یہ مطالعہ کیا جائے کہ سیرت سے متعلق کلامی مباحث کی حیثیت ونوعیت کیا ہے؟
2. علم الوحی اور منصب رسالت سے متعلق عصری کلامی مباحث کس بنیاد پر استوار ہیں؟
3. عصمت انبیاء اور ختم نبوت کے عقائد میں عصری کلامی استدلال کس بنیاد پر قائم ہے؟
4. نبوی معجزات سے متعلق معاصر فکری اشکالات کا سلجھاؤ کیسے ممکن ہے؟

منہج تحقیق:(*Rescarch Method*)

1. یہ تحقیق معیاری نقطہ نظر (Qulitative Approach) کے ساتھ مکمل کی گئی ہے، جو کہ متون سیرت کے مطالعہ (Textual Study) پر مبنی ہے۔ اس مطالعہ میں نفس مضمون کا تجزیاتی اسلوب (Content Analysis) اختیار کیا گیا ہے۔
2. موضوع تحقیق (Topic of Study) کے لحاظ سے، منتخب متون (Selected Classic Text) زیر بحث لائے گئے یا بیان کئے گئے کلامی موضوعات ومباحث (Theological Debates) اور ان کی عصری معنویت (Contemporary Interpretations) پر محیط ہے۔

3. اس تحقیق میں بنیادی مصادر سے رجوع کیا گیا ہے:

ا۔ قرآنی آیات کے فہم کے لیے کلاسیکی تفاسیر الطبری، ابن کثیر اور روح المعانی، سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مزید بر آں تدبر قرآن اور تفہیم القرآن جیسی جدید اردو تفاسیر سے رجوع کیا گیا ہے۔

ب۔ احادیث مبارکہ کی تفہیم کے لیے الجامع الصحیح البخاری، الجامع الصحیح مسلم، السنن ابی داؤد جیسے مصادر سے رجوع کیا گیا ہے۔

ج- سیرت طیبہ کے حوالے سے مسلم سیرت نگاروں کی کتب زیر مطالعہ آئی ہیں جب کہ بنیادی مطالعہ، موضوع تحقیق کے لیے منتخب کتب سے کیا گیا ہے، یعنی: زاد المعاد، الشفاء، اور الروض الانف

د۔ مستشرقین کی آراء کے لیے ان کی اپنی تصانیف سے اخذ کی گئی ہیں، جیسے کہ:

Muhammad And Islam, What is Islam, Muhammad The Prophet and Statesman, Muhammad At Mecca, Muhammad at Madina etc.

ابواب وفصول کی تقسیم وترتیب: (*Chapterization of Research Theme*)

اس تحقیقی مقالے میں باب اول تعارفی مباحث پر مشتمل ہے جس میں موضوع تحقیق اور منہج تحقیق کی تمام تر تفصیلات پر بحث کی گئی۔

باب دوم میں سیرت نگاری اور کلامی موضوعات کا تعارفی مطالعہ شامل کیا گیا ہے۔ جس کی پہلی فصل سیرت نگاری کے مدارج ومراحل پر مشتمل ہے۔ فصل سوم میں منتخب اور مجوزہ عربی تصانیف کا تعارفی جائزہ اور منہج واسلوب کے ساتھ ساتھ ان کے مصنفین کے احوال اور علمی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم، کتب سیرت کے کلامی موضوعات و مباحث پر مشتمل ہے۔ جس میں سیرت طیبہ کے کلامی مباحث کی تحقیق اور اس سلسلہ میں مستشرقین کے اشکالات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

باب چہارم، وحی ورسالت سے متعلق کلامی مباحث اور عصری معنویت پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں علم الوحی، منصب رسالت کے حوالے سے کلامی مباحث اور ان پر مستشرقین ومتجددین کی افکار و نظریات کا جائزہ جبکہ دوسری فصل میں عصمت انبیاء کرام اور عقیدہ ختم نبوت کے حوالے سے عصری کلامی اشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب پنجم، معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق عصری اشکالات کے تجزیے پر مبنی ہے۔ فصل اول میں معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق عصری کلامی مباحث جائزہ لیا گیا ہے، فصل دوم میں معجزات سے متعلق اشکالات کا تجزیہ اور مستشرقین اور متجددین کے نظریات پر بحث کی گئی ہیں۔

فصل دوم:

سیرت نگاری کے مدارج و مناہج اور کلامی موضوعات سیرت

فصل دوم: سیرت نگاری کے مدارج ومناہج اور کلامی موضوعات سیرت

' السیر ''عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ (سارا یسیر سیر) سے مشتق ہے۔اس کے اصلی حروف س،ی،ر ہیں۔لغوی طور پر سیر کا معنیٰ الذھاب ہے۔ بعض اوقات اس سے ابلاغ کا معنیٰ مراد لیا جاتا ہے۔[1] اگر یہ حروف جر سے ملا ہو تو سار اوزال کے معانی مراد ہوتے ہیں۔ مثلاًتسار عنہ الشئی۔یعنی وہ چیز اس سے زائل ہو گئی۔

علامہ ابن منظور (1232 - 1311ء) کے مطابق اسی طرح السیر "کو اسم مفعول کے صیغوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ دابۃ مسیرۃ جبکہ سواری پر کوئی آدمی ہو یا اس کو چلا رہا ہو۔ مفعول کبھی معنیٰ مصدری میں استعمال ہوتا ہے جیسے المسیرۃ، مسافت اور فاصلے کے مفہوم میں بھی بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ جیسے کہ رسول کا فرمان مبارک ہے : (نصرت بالرعب مسیرۃ شھر) یہاں مسیرۃ بمعنی مسافت ہے۔ابن منظور کے مطابق ان سب سے صیغہ اسم السیرۃ" آتا ہے۔[2]

علمائے لغت کے ہاں لفظ سیرت ۴ معانی پر دلالت کرتا ہے:

١۔ ضرب من السیر

٢۔ السنة

٣۔ الطریقة

۴۔ الھئیة

سب سے پہلا معنیٰ جو الضرب من السیرۃ ہے۔ اس کی اصل ابن فارس کے مطابق الصیغۃ ہے۔ مثلاً کہتے ہیں : (ھذا من ضرب فلان، ای صیغته، لانه اذا صاغ شیئاً فقد ضربه) [3]ابن منظور کے مطابق الضرب کا معنی الصفۃ اور الصنف من الاشیاء مراد لیا جاتا ہے۔[4] اس طرح ضرب کا معنیٰ مثال بیان کرنا بھی استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے:(کذالك یضرب الله الحق والباطل۔ای یمثل الله الحق والباطل) ، . . . ومعنیٰ اضرب لھم مثلاً :مثل لھم مثلاً[5]۔

لفظ سیرت کا دوسرا مطلب سنت ہے اور لغات میں سنت سے مراد یہ معانی ہیں:

---

[1] الأفریقي، ابن منظور، جمال الدین ابو الفضل، لسان العرب، بیروت، داراحیاء التراث، 1999ء، 6/453

[2] أیضاً :ص454

[3] ابن فارس، ابو الحسین احمد، معجم مقاییس اللغہ، بیروت، دارالفکر، س،ن، ص3/120

[4] الأفریقي، لسان العرب، 8/39

[5] الأفریقي، لسان العرب: ص8/39

1. الطریقہ
2. السیرۃ
3. الوجہ
4. الصورۃ
5. الطریق القویم

جوہری(متوفی :1003ء)نے الصحاح میں الطریقہ کا معنٰی (اطول مایکون من النخل بلغة الیمامة) لکھا ہے۔(یعنی لغت اہل یمامہ کے تحت کھجور کے لمبے ترین درخت کا نام الطریقۃ ہے)۔ اور طریقۃ القوم سے مراد اماثلھم وخیارھم ہے۔جیسے مثلاً (ھذارجل من طریق قومة، ای شریفه وامثلهم) ۔[1] اس طرح ابن منظور کہتے ہیں کہ الطریقۃ حال کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: (ھوعلی طریقة حسنةة وطریقة سیئة) ۔[2] پنجگانہ طریقہ کی دلالت تین معانی پر ہوگی۔ الامتداد، الرفعۃ، الحالالھیئۃ، ابن منظور کے مطابق ہے (حال الشئ وکیفیة) [3] ۔ چنانچہ لفظ(سیرۃ کا ہئیۃ کے معنی پر دلالت کرنے کا باعث یہ ہے کہ فعلۃ کے وزن پر آتا ہے)۔ علامہ ابن ہشامؒ انصاری نے بھی یہی مفہوم لکھا ہے۔[4]

مولانا عبدالشکور لکھنوی یوں رقمطراز ہیں:(عربی لغت کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی مصدر فعلۃ(بہ کسر فا) کے وزن پر آئے گا تو اس کے معنی مادی کسی خاص صفت نوعیہ سے متصف ہوجاتے ہیں)۔[5] علامہ زمخشری نے مسند بزار کی روایت میں لفظ ہیئت رسول ﷺ کی سابقہ کتب سماویہ میں موجود صفات پر دلالت کرنے کے حوالے سے استدلال کیاہے۔اس روایت کے مطابق، نبیؐ کے سوال پر ایک شخص نے تورات سے شہادت دی تھی:

(ھل تجدنی فی التوراة والابخیل؟ قال: نجد مثك، ومثل ھیئتك، ومثل مخرجك) [6]

---

[1] الجوہری، اسماعیل بن حماد، الصحاح(تاج اللغۃ وصحاح العربیہ)، بیروت، دارالعلم للملایین1995، 4\1513
[2] الأفریقي، ابن منظور، لسان العرب، 8/155
[3] أیضا: 15/170
[4] ابن ہشام، ابوعبداللہ الانصاری، اوضح المسالک الیٰ الفیۃ ابن مالک، بیروت، المکتبۃ، س۔ن، 3/341
[5] لکھنوی، عبدالشکور، مولانا، مختصر سیرت نبوی، اردو بازار، لاہور، المکتبۃ العربیہ، س۔ن، ص7
[6] البزار، ابو بکر احمد بن عمرو، البحر الزخار، مدینہ منورہ، مکتبۃ العلوم والحکم، 1988ء، 9/144-145

(جناب رسول انبی کریمؐ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے تورات میں میرا ذکر پڑھا؟ تو اس
نے جواب دیا: میں نے آپ کی مثل، ہیت اور مخرج کی طرح پایا ہے)

چنانچہ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ لفظ "السیرۃ" ان جملہ معانی پر دال ہو گا: صفۃ السیر، صفۃ السیر، مثال السیر، سیرۃ السائر، سنۃ السائر، طریقۃ السائر، ھیئۃ السائر، صورۃ السائر، طبعیۃ السائر، سنۃ السائر۔[1]

متقدمین کے ہاں اصطلاح سیرت:

جب سیرت کا لفظ بولا جائے گا تو لغۃ اس میں ان ابحاث پر دلالت ہو گی: صفۃ سیر النبی، صنف سیر النبی، ، مثال السیر ، سنۃ النبی، طریقۃ النبی ، ھیئۃ اور صورۃ النبی، طبیعۃ النبی، اور وجہ النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم ۔ چنانچہ مذکورہ جملہ لغوی دلالت اور معانی کو مد نظر رکھتے ہوئے علم سیرت کی لغوی تعریف یوں کی جائے گی: علم سیرت ایسا علم ہے جس میں جناب رسول کریمؐ کی ہیت حسنۃ، طبیعت جمیلہ، احوال جلیلہ، اخلاق و خصائل کریمہ اور فضائل حمیدہ کا ذکر ہو۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لغوی اور اصطلاحی اطلاق میں وقت اور زمانہ کے مرور کے ساتھ ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے چنانچہ السیرۃ "السیر" بہ معنیٰ (چلنا) کا اسم ہے۔[2] اور لفظ سیر اسی معنیٰ کیلئے متعین کیا گیا ہے جسے ابن فارس کے ایک قول: السین، والیاء، والراء، اصل یدل علی المضي والجریان سے بھی واضح ہوتا ہے۔[3]

اسی طرح المضی والجریان پر دلالت کے بعد طریقہ کی جانب معنیٰ منتقل ہوا جو کہ معنی مناسبت ہے اور طریقہ کے معنیٰ میں موجود ہے چنانچہ اس مناسبت کے حوالے سے سیرت کا معنییوں ہو گا۔ السیرۃ: طریقہ فی الشئ والسنۃ، لانھا تسیر و تجری یعنی سیرت کا معنی کسی چیز میں طریقہ کار اور سنت کہلائے گا کیونکہ طریقہ اور سنت میں چلنا اور جاری ہونا پایا جاتا ہے۔[4]

اسلام کی ابتدائی پانچ صدیوں میں، ابن ہشامؒ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے سیرت کو سب سے پہلے بطور اصطلاح متعارف کروایا اگرچہ علم سیرت، حدیث اور سنت کا زمانہ ایک تھا مگر حدیث اور سنت کی اصطلاحات، سیرت کے اصطلاحی طور پر معروف و متداول ہونے سے قبل اپنی تمام حدود و قیود کے ساتھ استقرار پا چکی تھیں امام زہریؒ کے دور میں لفظ سیرت بطور اصطلاح مستعمل ہونے کی روایت "کتاب الاغانی" سے پتہ چلتا ہے لیکن زہریؒ (متوفی: 123 یا 124ھ) سے سیرت بطور اصطلاح استعمال ہونے کے حوالے سے کوئی ذکر نہیں ملتا اسی طرح ابن ہشامؒ نے تعریف

---

[1] مرزوک، عبد الرزاق، المنہج النقدی لتصنیف السیرۃ النبویۃ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ جامعۃ الازہر، مصر، ص119

[2] تھانوی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون، بیروت: مکتبہ، لبنان، 1996، 1\998

[3] ابن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، 3/120

[4] ایضا: 3/121

واصطلاح سے بڑھ کر اپنی کتاب میں منہج کے بیان کے علاوہ اجزاء علم سیرت بھی متعین کیے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

(وانا ان شاء الله مبتدي هذا الكتاب بذكر اسماعيل بن ابراهيم ومن ولد رسولؐ من ولده واولادهم لا صلا بهم ، الاول فالاول من اسماعيل الي رسول الله ۔ وما يعرض من حديثهم و تارك ذكر غيرهم من ولد اسماعيل على هذه الجهة للاختصار الیٰ حديث سيرة رسول الله صل الله عليه وسلم وترك بعض ما زكره ابن اسحاق في هذا الكتاب مماليس لرسول الله صل الله عليه وسلم فيه ذكر ولا نزل فيه من القران شيء وليس سببا لشيء من هذا الكتاب) [1]

(میں اگر اللہ نے چاہاتو اس کتاب کو اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے آغاز کر رہا ہوں پھر حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے انہیں کا تذکرہ کروں گا جو آپؐ کے نسبی سلسلے میں شامل ہیں اور باقی اولاد کا ذکر نہیں کروں گا ابن اسحاق نے اس کتاب میں کچھ ایسی چیزیں لائی ہیں جن میں رسولؐ کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی قرآنی آیات کا نزول ہوا ہے اور نہ اس کتاب میں سے کسی چیز کا سبب ہمیں لہذا میں نے مختصر آپؐ کی سیرت بیان کرنے کے لیے ایسی باتیں ذکر نہیں کیں).

ابن ہشام (متوفی:834ء) نے رسولؐ کی سیرت کے حوالے سے تین اہم نکات جو کہ سیرت کے اہم اجزاء کہلاتے ہیں، کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے:

1۔ ایسی اخبار جن میں آپؐ کا تذکرہ ہو۔

2۔ ایسا واقعہ یا خبر جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں ہو۔

3۔ سیرت کی تفہیم کے لیے واقعات بدرجہ سبب ہوں[2]

ابن ہشامؒ کے ان نکات ثلاثہ سے سیرت کی اصطلاح کے لیے قواعد وضوابط مقرر ہوئے ہیں۔ چناچہ انہوں نے متعین کر دیا کہ سیرت میں وہی باتیں ذکر ہوں گی جن کا حضورؐ سے تعلق ہے اور جو بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق نہیں، وہ ذکر نہیں ہو گی بایں وجہ ابن ہشام کو سیرت کی بطور اصطلاح توضیح کے باعث اولین

---

[1] ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، السیرۃ النبویہ، مطبوعہ: دار الصحابہ للتراث، 1995ء، 1/40-41

[2] ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، السیرۃ النبویہ، مطبوعہ: دار الصحابہ للتراث، 1995ء، 1/40-41

حیثیت حاصل ہو گی تبھی ان کی اس تعین و توضیح کے بعد سیرت کے مضامین کے لیے مغازی سے ہٹ کر سیرت کی ا صطلاح مستعمل ہوئی۔

اسی خصوصیت اور امتیاز کے باعث سیرت ابن اسحاق سیرت ابن ہشام سے مشہور ہو گئی اور اسی عمدہ ا سلوب کا بیج ڈالنے کے باعث ابن ہشام اس وقت تاہنوز سیرت نگاروں کے لئے مقتدا اور نمونہ بن گئے جن کے منہج وہ اسلوب کی ابھی تک تقلید جاری و ساری ہے۔ اس کے بعد علامہ ابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمتہ ا للہ علیہ کے واقعات سیرت کے بیان کے حوالے سے منہج کو ان الفاظ میں بیان کیا۔[1]

امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ (810-870ء) کے انداز بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ از اول تا آخر نبی ا کرمؐ کے جملہ امور کو جمع کرنے کا مطلب آپؐ کے حالات زندگی کا بیان ہے ترجمۃ النبویہ کے مقدمات سے شروع کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب اور متعلقہ امور کا ذکر فرمایا اس کے بعد قبائل و متعلقات اور بعد ازاں دعوٰی جاہلیت کی نہی کا تذکرہ کیا کیونکہ ان کے ہاں انساب ہی قابل فخر ہیں بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی صفات، شمائل اور معجزات کا تذکرہ کیا۔

احوال صحابہ کے بیان سے فارغ ہونے کے بعد احوال قبل از ہجرت اور مکہ مکرمہ میں حضور اقدس صلی ا للہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ پیش آمدہ واقعات اور بعثت کے حوالے سے روشنی ڈالی اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبولیت اسلام، ہجرت حبشہ، معراج النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم، وفود انصار، ہجرت مدینہ، اپنے انداز و تربیت کے تحت مغازی کا ذکر کر کے پھر آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا تذکرہ کیا۔ بخاری کے انداز بیان و منہج سے سیرت کی اصطلاح کے حوالے سے دو اہم باتوں کا تذکرہ ملتا ہے اول بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے واقعات سیرت کے بیان میں ترتیب زمانی کو مد نظر رکھا دوم مضامین سیرت اور اس کے ملحقات کے تعین کا بھی اشارۃ ذکر کر دیا۔

امام حاکم نیسا بوری کے مطابق علوم حدیث کی 48ویں نوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معرکہ جات، فوجی دستوں، فرستادوں اور مشرکین میں سے نامور قد آور افراد کے نام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خط و کتابت کے جاننے اور اس حوالے سے صحیح اور شاذ روایات کی پہچان کے حوالے سے ہے۔ اس کے علاوہ مختلف غزوا ت و سرایا میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے کیا کارہائے نمایاں سر انجام دیے، کس نے استقامت کا مظاہرہ کیا ا ور کون عدم استقامت کے راستے پر گیا، کس نے دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور کون نفاق کا شکار ہو گیا۔ اسی طرح یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کی تقسیم کیسے فرمائی اور کس کس کو

---

[1] العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، فتح الباری، المکتبۃ السلفیہ، س ن۔ 6/526

کمی بیشی کے ساتھ دیا اور مال غنیمت میں بصورت خیانت کیسے حد جاری فرمائی۔

علوم حدیث کی یہ قسم اس حد تک اہم ہے کہ اصحاب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ مغازی اور اس کے ملحقات و متعلقات کی تعریف کہنا زیادہ اچھا اور زیادہ بہتر ہو گا۔[1]

متوسطین (پانچویں سے دسویں ہجری تک) سیرت نگاروں میں سے حافظ جمال الدین المزی، صاحب تہذیب الکمال نے شروع میں اجمالا مضامین سیرت کو نہایت عمدہ اور مرتب انداز میں پیش کیا ہے۔ سیرت طیبہ کی یہ مختصر تصنیف ابو العباس عبد اللہ بن محمد الناشی کے 77 نعتیہ اشعار پر مشتمل ہے جو کہ پندرہ فصول پر مبنی ہے۔ ابتدا میں نسب النبیؐ سے شروع ہو کر آپ کے اسماء گرامی، خاندان، زندگی کی سرگرمیاں، اہل بیت کا ذکر اور خدام کی تفصیل، اسی طرح آپ کے شمائل، آپ کی صفات و اخلاق اور معجزات کا ذکر ہے۔[2]

اسی طرح علامہ ابن سید الناس (1334 - 1272ء): کی کتاب "عیون الاثر" میں آپؐ کا نسب مبارک، جائے پیدائش، مدت رضاعت و فصال اور بنو سعد میں قیام بعد ازاں شق صدر اور دیگر واقعات کا صدور پھر آپؐ کا اپنے چچا ابو طالب کی پرورش میں آنا، سفر شام اور وہاں سے واپس آنا، بادلوں کا آپؐ پر سایہ کرنا، نجومیوں اور کاہنیں کا آپ کی نبوت کے حوالے سے پیشگوئیاں کرنا، خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا، بعثت، نبوت اور نزول وحی کی ابتداء، قبولیت اسلام میں سابقین اولین کا تذکرہ، سرزمین حبشہ کی جانب کی گئی دونوں ہجرتوں کا تذکرہ، شق قمر کے معجزے کا صدور، واقعہ شعب ابی طالب طائف روانگی اور پھر واپس مکہ آمد، بیعت عقبہ کا بیان، انصار کا قبولیت اسلام، واقعہ اسراء معراج، فرضیت نماز کا بیان ہے۔

اس کے بعد ہجرت مدینہ کی معلومات، آپ ﷺ کا دخول مدینہ طیبہ، تعمیر مسجد نبوی ﷺ، تنصیب منبر، سیر و مغازی اور بعوث کا بیان، نزول وحی، آپ ﷺ کا ادائیگی عمرہ، رؤسائے وقت کو خطوط ارسال کرنا، مختلف وفود کا قبولیت، حجۃ الوداع اور وصال نبوی ﷺ اور دیگر بہت سی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ جبکہ ان من جملہ مضامین کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کے چچا، پھوپھیاں، ازواج النبیؐ، اولاد نبوی ﷺ، آپ کی صفات و اخلاق اور شمائل، غلام، کنیزیں اور آزاد شدہ غلام، گھوڑے، اسلحہ اور دیگر متعلقات جن کا تذکرہ کتب سیرت میں موجود ہے، مختصراً ان کو مرتب انداز سے ذکر کیا ہے۔[3]

---

[1] النیسابوری، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم، معرفۃ علوم الحدیث، بیروت، دار ابن حزم 2003، ص636

[2] المزی، جمال الدین ابو الحجاج یوسف، تہذیب الکمال، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ، 1994ء، 1\174

[3] ابن سید الناس، محمد بن محمد بن محمد، عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، بیروت، دار ابن کثیر، س۔ن، 1\52

دور متوسط کے ایک اور نامور سیرت نگار شیخ قاسم بن عبد اللہ القونوی الحنفیؒ (متوفی: 978ھ) کا سیرت کے بطور اصطلاح استعمال کے حوالے سے مؤقف یوں بیان کیا گیا ہے: "سیر "سیرت لفظ کی جمع ہے اور اس کا مفہوم ہے چلنے کی حالت، مثلاً جلسہ اور رکبہ کا معنیٰ بیٹھنا اور سواری کرنا ہے۔ پھر سیرت کا انتقال طریق اور مذہب کی جانب ہوا اور اصطلاح شریعت میں مجموعی و عمومی لحاظ سے اس کا اطلاق مغازی اور اس کے متعلقات پر ہوتا ہے کیونکہ مغازی میں پہلا کام دشمن کی جانب چلنا ہوتا ہے اور اس کا مفہوم امام کا چلنا اور کفار و دشمنان اور غازیوں و مددگاروں کے ساتھ امام و حاکم کے جملہ معاملات ہیں۔[1]

متاخرین کے ہاں اصطلاحِ سیرت:

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:

(وآں چہ متعلق کوبوجوہ وباوجود پیغمبرؐ وصحابہ کرام و آل عظام اوست از ابتدائے تولد آں جناب تا غایت وفات آں را سیرت تامند، سیرۃ ابن اسحاق وسیرۃ ابن ہشام وسیرۃ ملا عمر و دیگر کتب بسیار دریں باب مصنف شدہ)[2]

(یعنی وہ احادیث مبارکہ جو پیغمبر ﷺ کی ولادت سے وصال تک آپ ﷺ صحابہ کرام اور آل عظام سے متعلق ہوں وہ سیرت کہلائیں گی۔ سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ملا عمر و اور دیگر کثیر تعداد میں کتب اس باب میں تصنیف شدہ ہیں)۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ (1899-1974ء) کے ہاں سیرت سے مراد اصلاً پوری حدیث ہے۔ مگر متقدمین کے ہاں صرف غزوات و سرایا کے احوال اور مجموعہ واقعات کا نام سیرت ہے۔ لیکن متاخرین اور اس زمانے میں سیرت کا اطلاق سوانح عمری پر کیا جاتا ہے۔[3]

مولانا عبد الشکور لکھنویؒ (1877-1962ء) کے نزدیک لفظ "سیرۃ" جب مطلقاً بولا جائے تو اس سے رسول اللہؐ کی سیرت یعنی آپؐ کے اقوال وافعال اور احوال مراد لئے جاتے ہیں۔ سیرت کے اصل معانی یہی ہیں اور انہی معانی کے اعتبار سے قرآن حکیم کو آنحضرتؐ کی سیرت پر متضمن قرار دیا جاتا ہے جبکہ تمام کتب حدیث کو

---

[1] القونوی، قاسم بن عبد اللہ، انیس الفقہاء، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 2004ء، ص64

[2] دہلوی، شاہ عبد العزیز، عجالہ نافعہ، مترجم وشارح: ڈاکٹر عبد الحلیم وچشتی، کراچی، مکتبہ الکوثر، 2012ء، ص79

[3] کاندھلوی، محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰ، دہلی، فرید بک ڈپو، 1999ء، 1\3

سیرت بھی اسی معنیٰ کے تحت کہا گیا ہے۔[1]

محقق دکتور عبد الرزاق ھرماسؒ لکھتے ہیں کہ علم سیرت میں آپ ﷺ کی پیدائش سے وصال تک کے احوال، حضورؐ کے آباؤ اجداد، نسب و پرورش، بعثت، معجزات رسول ﷺ، دعوت و تبلیغ، اخلاق کریمانہ اور جہاد سے متعلق امور شامل ہیں۔[2]

دکتور محمد بن صامل السلمیؒ سیرت کی اصطلاح کی وضاحت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سیرت طیبہ میں ہر وہ چیز داخل ہو گی جس کا تعلق رسول اللہؐ کے ساتھ آپ ﷺ کے زمانہ وحالات کے ساتھ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے احوال کے ساتھ خاص ہو کیونکہ سیرت آپ ﷺ کا فعل اور صحابہ کرام کے فعل کی بارگاہ نبویؐ سے توثیق ہے۔[3] دکتور یاسر بن احمد نور کہتے ہیں کہ: (السيرة" تعنى لغة الطريقه" وفى الا صطلاح تعنى الحقبةالتاريخيه التى تدريس حياة الرسول ﷺ واحواله)[4]

(لغوی طور پر سیرت کا معنی طریقہ ہے اور اصطلاح میں اس سے مراد تاریخ کا ایسا حصہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی حیات طیبہ اور احوال مبارکہ کو ذکر کیا گیا ہو۔)

دکتور محمود محمد الطناحیؒ سیرت نبویہ کی اصطلاح کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سیرت نبویہ ﷺ سے مراد وہ مضامین ہیں کہ جن کا آپؐ سے تعلق ہو۔ جیسے حضور ﷺ کا نسب نامہ، کفالت، پرورش، بعثت، صفات و معجزات اور وفات مبارکہ تک کے مختلف حالات کہ آپؐ رسالت کی تبلیغ اور امانت کی ادائیگی کے بعد رب کائنات کے سامنے اس حالت میں پیش ہوئے کہ دونوں آپس میں رضامند تھے اور آپؐ کا اپنی امت کو راہ ہدایت اور سیدھے راستے پر چھوڑ جانا، یہی دراصل سیرت نبویؐ کی اصطلاح کا معنیٰ و مفہوم ہے۔ البتہ کبھی سیرت سے مراد وہ مغازی بھی ہوتے ہیں کہ جن میں آپؐ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے حصہ لیا ہے اور ان دونوں اصطلاحات کا ایک موضوع کے لیے اطلاق ہوتا رہتا ہے یعنی کبھی سیرت کا اطلاق مغازی پر اور کبھی اس کے برعکس۔[5]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم سیرت کے مختلف اجزاء ہیں جن میں مغازی، شمائل، دلائل وخصائل اور بہت سے

---

[1] لکھنوی، مولانا عبد الشکور، مختصر سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ الفصیل ناشران، لاہور، ص 7-8

[2] عبد الرزاق، دکتور، مصادر السیرۃ النبویہ بین المحدثین والمورخین، 2007ء ص 13

[3] السلمی، محمد بن صامل، السیرۃ النبویۃ، ریاض، دار ابن الجوزی، ص 8

[4] محمد یسری، الدکتور، التجدید فی عرض السیرۃ النبویہ، قاہرہ، دار الیسر، 2009ء، ص 14

[5] الطناحی، الدکتور محمود محمد، الموجز فی مراجع التراجم والبلدان والمصنفات وتعریفات العلوم، قاہرۃ، المکتبۃ الخانجی، 1985ء، ص 42-43

مزید مضمون شامل ہیں، ابتدأزمانہ متقدمین میں سیرت طیبہ کے ہر جزو پر مستقل طور پر مرتب انداز میں جمع و تصنیف کی گئی تھی جیسا کہ امام حاکم نیشاپوریؒ کی عبارت سے واضح ہے کہ انہوں نے مغازی کی وضاحت میں فقط غزوات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ غزوات سے متعلقہ تمام معاملات کو بھی ذکر کیا ہے۔ ابتدائی زمانے میں اگرچہ روایاتِ مغازی کو خصوصی اہمیت و درجہ حاصل تھا لیکن اھل مغازی، مغازی کے علاوہ سیرت کے باقی مضامین سے متعلق روایات بھی بیان کرتے تھے۔ مغازی سے پہلے غزوات کے لیے باقاعدہ "مشاہد" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جیسا کی امام بخاری روایت بیان فرماتے ہیں :

(ان رسول الله ﷺ: كان في بعض المشاهد وقد دميت إصبعه، فقال: " هل انت إلا إصبع دميت؛ وفي سبيل الله ما لقيت)[1]

چنانچہ غزوات اور اس کے متلعقات پر مشاہد کے مد مقابل مغازی کا لفظ معنوی اعتبار سے جہاں وسعت کا حامل ہے۔ وہاں اپنے مدلول پر مکمل دال بھی ہے تبھی محققین نے مغازی کو غزوات کے لیے عام طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یعینہ یہی صورتِ حال لفظ سیرت اور لفظ مغازی کے درمیان پائی جاتی ہے۔

ابتدائی زمانے میں مغازی کے تحت مغازی ہی کے واقعات لکھے جاتے تھے لیکن بعد ازاں بدلتے زمانے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ سے متعلقہ جملہ دیگر معلومات پر بھی مغازی کا لفظ بولا اور لکھا جانے لگا۔ اور چونکہ لفظ سیرت بنسبت مغازی کے زیادہ وسیع تھا لہذا بائیں وجہ ان معلومات کے مجموعہ کے لیے سیرت کی اصطلاح رائج ہوئی اور علامہ ابن ہشام نے سب سے پہلے اس اصطلاح کا باقاعدہ استعمال کیا۔

بعد ازاں متوسطین سیرت نگاروں نے ابن ہشامؒ کے ضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے حوالے سے وہ معلومات جمع کرنے کی سعی کی جو متقدمین کی کتب میں منتشر انداز میں موجود تھیں۔

سیرت نگاروں میں سے متاخرین کے سامنے علم سیرت ایک مکمل علم کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود ان کے مابین اصطلاحِ سیرت میں اختلاف تھا اور اس اختلاف کی اصل وجہ سیرت کی تعریف میں تعریف کے مکمل اجزاء کا ذکر نہ ہونا تھا۔ جس کی وجہ سے سیرت کی تعریف جامع مانع نہیں ہو سکتی تھی لہذا سیرت کی تعریف کی جامعیت و معنونیت کے لیے سیرت کے چند اجزاء کا تعریف میں تذکرہ ضروری ہے جو کہ حسب ذیل ہیں:

1. ارہاصات سے وفات تک کے حالات
2. فضائل و شمائل

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد، باب من ینکب فی سبیل اللہ، دار الفکر، بیروت، رقم الحدیث 2802

3. دلائل و معجزات
4. اخلاق کریم و اوصاف حمیدہ
5. ازواج مطہرات، اصحاب، اولاد اور خاندان کا تذکرہ
6. ناصرین و معاندین کا تذکرہ
7. رسول اللہؐ سے متعلقہ جاندار اور بے جان اشیاء کا تذکرہ
8. سیر، مغازی، بعثت اور آپؐ کے اسفار
9. مذکورہ بالا تمام امور کے متعلقات و ملحقات

مذکورہ بالا اجزاء کی تفصیل کے بعد علم سیرت کی جامع تعریف یوں ہو گی:

علم سیرت میں آنحضرتؐ کے ارہاصات سے وصال تک کے حالات، فضائل و شمائل، دلائل و معجزات، اخلاق کریمہ اور جملہ اوصاف نبوی ﷺ ، من جملہ ازواجِ مطہرات، اصحاب اور اولاد و خاندان کا تذکرہ، بمعہ ناصرین و معاندین، آپ ﷺ سے متعلقہ جاندار اور بے جان اشیاء کا بیان، سیر و مغازی اور بعوث و دیگر اسفار اور بیان کردہ مضامین کے ملحقات اور متعلقات سے بحث کی جاتی ہے۔

سیرت نگاری کا آغاز و ارتقاء:

سیرت نگاری یا تدوین سیرت کا ابتدائی مرحلہ معلومات اور مواد کی فراہمی اور اس کے جمع کا تھا۔ اس مرحلہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آنحضرتؐ کی ذات اقدس کے حوالے سے جملہ معلومات و مواد کو یکجا کر کے اس کے ضیاع اور فراموش ہونے کے خطرے سے محفوظ کر لیا جائے تا کہ آمدہ امت تک یہ عظیم ذخیرہ اور معلومات با آسانی پہنچ سکیں۔

یہ ابتدائی مرحلہ دو اجزاء پر مشتمل تھا۔ اس کا پہلا جزو تو وہ تھا کہ جو رب کریم کی حکمت بالغہ اور تکوینی مصالح کے پیشِ نظر آپؐ کے آباؤ اجداد، خاندان، امہات، آپؐ کی جدّات کے حوالے سے معلومات یکجا و جمع کرنے کا کام پہلے سے شروع کیا جا چکا تھا اور ان تمام معلومات کے مرتبین کے دماغوں میں کہیں دور دور تک بھی یہ خیالات نہیں تھے کہ ان کو جمع کرنے کے مقاصد کیا ہیں۔

چنانچہ وہ یہ تمام ذخیرہ اکٹھا کرتے رہے لیکن ان کے فہم و ادراک سے یہ بات مکمل طور پر مخفی رہی کہ ان تفصیلات کے یکجا کرنے سے کس کے جمال کو سامنے لانا مقصود ہے کہ جس کے باعث تمام پردے ہٹتے چلے جا رہے ہیں چنانچہ یہ سلسلہ آنحضرت ﷺ کے وصال تک جاری رہا۔ چنانچہ ابتدائی مرحلے کا جزو دوم آپؐ کے اس جہان فانی

سے تشریف لے جانے کے فورا بعد یہ شروع ہوا جو کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی اس دنیا میں موجودگی تک جاری رہا۔

105 تا106 ہجری (بنابر اختلاف روایاتِ محدثین) میں جب آخری صحابی رسولؐ کا انتقال ہوا[1] تو اس کے بعد محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی وساطت سے آمدہ معلومات و ذخائر کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سیرت نگاری کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس کو تدوین وترتیب کا زمانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ امر زیادہ پر زور دیا رہا کہ حضور ﷺ کے خاندان، جغرافیہ عرب، خاندان اور برادری کے حوالے سے جو معلومات کا ذخیرہ ویسے جمع تھا یا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے جو مواد و معلومات جمع ہوئی تھیں ان سب کو اس انداز سے ترتیب و تدوین دی جائے کہ حسب موضوع مرتب ہونے سے آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کا وہ نقشہ مکمل طور پر نمایاں ہو جائے جو کہ آج تاریخ میں موجود ہے۔

ترتیب و تدوین کا مرحلہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں پایہ تکمیل کو پہنچا جو کہ تقریباً 210ھ میں اختتام پذیر ہوا۔ حضرات محدثین کے مطابق تابعین کرام کا زمانہ اختتام 170ھ تا 175ھ جبکہ تبع تابعین کا آخری زمانہ 210ھ تا 215ھ تقریباً قرار دیا گیا ہے۔ گویا 210ھ تا 215ھ کے درمیان یہ مرحلہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا تھا اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دست ہائے مبارک سے مرتب شدہ مجموعے اس زمانے میں باقاعدہ مرتب ہو چکے تھے۔ اور وہ جملہ معلومات کا ذخیرہ محفوظ ہو چکا تھا۔

تدوین سیرت کا تیسرا مرحلہ سیرت طیبہ کی تصنیف و تالیف کا مرحلہ اور دور تھا۔ اور یہ مرحلہ سن 200 ہجری کے قریب شروع ہوا اور اس کے بعد قریباً دو سو سال تک جاری رہا۔ اور یوں سن 400 ہجری میں یہ مرحلہ بھی پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اس مرحلے میں ابتدائی دونوں مراحل کے مرتب شدہ تمام چھوٹے بڑے مجموعہ جات کو یکجا کر کے مختلف کتب اور تفصیلی نسخہ جات ترتیب دیئے گئے اور یوں سیرت باقاعدہ ایک علم کے طور پر منظم و مرتب انداز میں بطور ذخیرہ آگے والے لوگوں تک پہنچا۔ اسی زمانے کی سب سے اول اور اہم ترین کتاب جو خلیفہ عبدالملک بن ہشام نے لکھی اور جس کو انھوں نے ابن اسحاق کے کام کی روشنی میں مرتب کیا۔ یہ تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں کیا گیا جس کے بعد سیرت طیبہ کی تدوین وترتیب کا یہ تیسرا مرحلہ اور زمانہ مزید آگے تقریباً دو سو سال تک جاری رہا۔[2]

مرحلہ چہارم سن 400 ہجری سے جس کی ابتدا ہوئی اس کے بارے میں بھی سیرت نگار یہی لکھتے ہیں کہ وہ

---

[1] العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، التقریب، المکتبہ السلفیہ، س۔ن، 1\288

[2] العسقلانی، ابن حجر، تہذیب التہذیب، مجلس دائرہ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، 1326ھ، 1\90-91

مزید تقریباً دو صدیوں کے عرصے پر محیط رہا۔ سیرت نگار کے نزدیک یہ استیعاب واستقصاء کا دور ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ سیرت کے حوالے سے جملہ ایسی معلومات جو بغیر واسطے کے منتقل ہوئی تھیں ان کی مکمل طور پر جانچ پرکھ اور پڑتال وغیرہ کرنا شامل تھا۔ اس مرحلے کو سیرت مبارکہ کی بڑی کتابوں کا زمانہ بھی کہا جاتا ہے جس کے بعد چھ، اٹھ اور دس جلدوں پر مشتمل مفصل اور جامع کتب ترتیب دی گئیں جس میں سے کافی تعداد میں کتب آج بھی مطبوعات و مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔[1]

پانچواں مرحلہ جو کہ تقریباً 600ھ کے لگ بھگ شروع ہو کر آج سے تقریباً دو سو سال قبل تک جاری رہا اس کو سیرت کا تجزیاتی و مطالعاتی زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس مرحلے اور زمانے سے سیرت طیبہ کے مختلف زاویوں اور پہلوؤں کے حوالے سے تحقیقی کام سامنے آئے۔ چنانچہ وثائق نبویؐ، کتاب النبیؐ، آنحضرتؐ کے دور کے مختلف پہلوؤں اور احوال، مدینہ طیبہ اور مکۃ المکرمہ سے متعلق اور حضرات صحابہ کرام کے علیحدہ علیحدہ طبقات و مجموعہ جات پر بہت سا علمی کام تقریباً اسی دور میں مکمل ہوا۔ چنانچہ سیرت طیبہ کے حوالے سے میسر معلومات تحقیقات کو محدثین و سیرت نگاروں اور محققین نے یوں منقح کر کے رکھ دیا کہ تمام پہلو الگ الگ واضح ہو گئے۔

چھٹا مرحلہ جس کا آغاز تقریباً انیسویں صدی کے نصف اخیر سے ہوا جو کہ 1280ھ کے قریب کا زمانہ تھا اور جس کو علوم سیرت میں تجدید کا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں مغربی مصنفین نے تفصیلاً بڑھ چڑھ کر اظہار خیال کیا اور ایسے ایسے سوالات سیرت کے حوالے سے اٹھائے کہ جو اس سے قبل سیرت نگاروں کے تذکرے میں نہیں ملتے۔ ان میں سے بعض سوالات حقیقی اور علمی تھے جن کو سیرت نگاروں اور محققین نے حقیقت پسندانہ انداز میں مد نظر رکھتے ہوئے خاطر خواہ جوابات دے کر بات سمجھانے کی کوشش کی، اور یوں فن حدیث سیرت کو ایک نئی جہت عطا ہوئی۔

مغربی مفکرین واہل علم کی جانب سے کثیر تعداد میں شبہات واعتراضات کا بھی اظہار کیا گیا جس کو مسلم محققین اور سیرت نگاروں نے جوابی انداز اختیار کر کے عقلی و منطقی انداز سے ان شبہات واعتراضات کا رد اور ازالہ کیا۔ چنانچہ تجدید سیرت طیبہ کے اس مرحلے میں بالخصوص مستشرقین نے بہت سارے سوالات و ابہام اٹھا کر اس علم سیرت کو جدید جہات سے روشناس کروایا اور مسلم محققین کے لیے نئے چیلنجز اور اہداف سامنے آتے گئے۔

ساتواں مرحلہ جس کو عہد حاضر کہا جاتا ہے کے آغاز اور تعین کے حوالے سے کوئی بات کرنا مشکل ہے۔ ماضی قریب میں سیرت النبیؐ کے حوالے سے جتنا علمی و تحقیقی کام ہوا اور مستقبل قریب میں کو کچھ مزید علمی کام

---

[1] ایضاً، 1\931

ہونے کے امکانات و شواہد موجود ہیں۔اسی طرح سیرت کے آٹھویں مرحلے سے مراد آئندہ مستقبل بعید میں علم سیرت کو پیش آمدہ جدید اور نت نئے چیلنجز کے مطابق دور جدید کے افکار و نظریات اور منطقی و سائنسی انداز وسوچ کے حوالے سے سیرت طیبہ پر اٹھنے والے اعتراضات اور شکوک وشبہات کی روشنی میں اس علم کی توضیح و تحقیق ہے جو کہ آمدہ جدید مسلم محققین اور سیرت نگاروں کے لیے بہت مشکل چیلنج ہو گا۔

مذکورہ ادوار و مراحل متعین اور حتمی ہر گز نہیں ہیں بلکہ ان میں اکثر سیرت نگاروں اور مورخین کے ہاں تداخل پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین ان مراحل کے آغاز واختتام کو اپنے انداز میں ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ابتداً علم حدیث اور علم مغازی ایک ہی علم اور فن سمجھے جاتے تھے جو کہ اہل سیر اور محدثین کے باہم دلچسپی کے موضوعات تھے صحابہ اپنی مرویات حدیث جو بیان کرتے تھے وہ باب مغازی میں بھی کرتے تھے مگر مرور زمانہ اور تغیرات کے ساتھ ساتھ یہ دونوں علوم ترقی کی منازل عبور کرتے کرتے الگ الگ ہو گئے اور یوں علم حدیث الگ اور علم مغازی الگ شکل میں مرتب ہونے شروع ہوئے اور کچھ حضرات حدیث جبکہ دیگر مغازی کے متخصصین قرار پائے۔

بعد ازآں، علم مغازی دو پہلوؤں میں منقسم ہوا بعض حضرات نے اس کا مطالعہ واقعاتی و تاریخی کے اعتبار سے کیا جبکہ بعض نے اسلام کے قانون جنگ و صلح کو بیان کرنا شروع کیا چنانچہ اسلامی بین الاقوامی قانون اولاً مغازی کی صورت میں سامنے آیا کہ آنحضرتؐ نے کیا کیا احکامات فرمائے، معاملات کیسے ہوئے، قیدیوں کے ساتھ آپؐ کا کیا برتاؤ رہا معاہدات اور ان کی پاسداری کے حوالے سے کیا انداز اختیار کیا۔اس وجہ سے پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری ہجری کی ابتداء میں یہ دو الگ فن کی حیثیت اختیار کر گئے اور اسلام کے بین الاقوامی قانون پر مبنی علم کو علم سیر جبکہ سیرت پر مبنی علوم کو علم مغازی کو ایک شعبہ قرار دیا گیا اور اس کے بعد مغازی میں مزید کئی موضوعات کی شمولیت کے باعث اس کو علم سیرت کا نام دیا گیا۔[1]

اولین علماء سیرت:

ویسے تو کم و بیش ایک درجن سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ایسی تھی کہ جو آنحضرت ﷺ کی جنگوں اور مہمات عسکریہ کی معلومات کے ماہر تھے لیکن بعض حضرات صحابہ سیرت طیبہ ﷺ ، آپ ﷺ کی ذات مبارک اور شمائل و خصائل نبوی ﷺ کے حوالے سے متخصصین میں شمار ہوتے تھے جبکہ تابعین کرام میں سے بھی بہت سے حضرات نے اس معاملہ میں خصوصی دلچسپی دکھائی اور ان صحابہ کرام سے ان معلومات کو حاصل

[1] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، 1960ء، 5\224

کر کے محفوظ کیا ان کی تعداد بھی کافی ہے۔

اس سلسلے میں جن دو بزرگوں کو نمایاں مقام حاصل ہے اور ان دونوں حضرات کا تعلق بھی دو کبار صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم سے ہے چنانچہ ایک ان میں سے حضرت ابان بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جن کو فن مغازی کا متخصص کہا جاتا ہے۔ انہوں نے مغازی کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو مغازی ابان ابن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہلاتا ہے طلباء کو اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے اور اس مجموعے کو باقاعدہ املا بھی کروایا کرتے تھے اسی املا کے باعث ان کے شاگردوں کے پاس ان معلومات کے کئی نسخہ تیار ہو گئے تھے۔

تابعین میں سے دوسری بزرگ شخصیت اور نمایاں ترین نام حضرت عروہ بن زبیرؓ کا ہے جو کہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نواسے ہیں ان کی تربیت علمی طور پر زیادہ حضرت عائشہؓ نے کی انہوں نے بھی سیرت اور مغازی کا مجموعہ مرتب کر کے اپنے شاگردوں کو پڑھایا۔ یہ مجموعہ ایک سے زائد بار مرتب ہوا ان کا اپنا ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ تو ہم تک نہیں پہنچ سکا مگر ان کے شاگردوں کے ذریعے، نامور مورخین طبری، ابن سعدؒ اور واقدیؒ تک پہنچا۔ اکثر محققین جو یہ کہتے ہیں کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی کی تصنیف کردہ ہے وہ اسی مجموعے کے حوالے سے ہے[1] عروہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سن 94ھ میں فوت ہوئے۔

تابعین کرام میں مزید ایسے حضرات ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ سے سیرت و مغازی سے ملنے والی معلومات کو مرتب کرنے میں بہت محنت اور دلچسپی سے کام لیا، ان میں سے ایک وہب بن منبہ (۱۲۸) ہیں جو کہ 128ھ میں وفات پا گئے تھے یہ ہمام بن منبہؒ کے برادر صغیر ہیں جو کہ سیدنا ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے، اس کتاب کا نسخہ آپ کے وصال کے قریبا سو سال بعد 228ھ میں لکھا گیا جو جرمنی کے مکتبہ میں آج بھی موجود ہے۔

وہب بن منبہؒ اولین سیرت نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں آپ عظیم مورخ اور کتب قدیمہ و اسرائیلیات کے بھی زبردست عالم تھے اصلاً عجمی النسل اور ایرانی تھے اور آپ کے والد نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں دوسرے نامور تابعی جو تدوین سیرت کا ایک روشن ستارہ ہیں وہ شرحبیل بن سعد کے نام سے پہچانے جاتے ہیں آپ ابتداً انصار کے آزاد کردہ غلام تھے اور فن مغازی اور اصحاب بدر کے احوال سے اچھے واقف و عالم اور صاحب فتوی بھی تھے۔[2]

تابعین کرام میں تیسرا نام محمد بن شہاب زہریؒ کا ہے آپ کا زمانہ سن 85ھ سے 124ھ تک ہے 124ھ میں آپ کی وفات ہوئی آپ امام مالک سمیت کبار محدثین کے استاد محترم تھے۔ سیرت کی ابتدائی تالیفات میں جن کو

---

[1] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، 5\134

[2] الزرکلی، خیر الدین، الاعلام، دار العلم للملایین، بیروت، 2002ء، 8/125

تابعین نے مرتب کیا ہے ان میں سے ایک تابعی سلیمان بن طرخان(46ھ تا143ھ) تھے جنکی کنیت ابو المعتم تھی آپ اصلاً تیمی نہیں تھے بلکہ وہاں سکونت کے باعث تیمی مشہور ہو گئے تھے۔[1]

مذکورہ حضرات کے علاوہ ایک اور محترم نام مشہور تابعی حضرت امام علی ابن حسین زین العابدین کا بھی ہے جنہوں نے سیر و مغازی کا ایک مجموعہ اپنی یاداشت کے طور پر قلم بند کیا تھا آپ اہل تشیع میں امامیہ کے بارہ اماموں میں چوتھے امام ہیں آپ کو علی اصغر بھی کہا جاتا ہے۔ واقدیؒ (747—823ء) اورابن کثیرؒ (701ھ-774ھ)دونوں کی تصریح موجود ہے کہ آپ کا یہ نسخہ یاداشت جو سیرت و مغازی کے موضوع پر مشتمل تھا اور روز آپ اس نسخے کی قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے غالبا یا تو آپ کے تلامذہ نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو انہوں نے یہ نسخہ دوسروں تک نہیں پہنچایا اور اگر پہنچایا تھا تو بعد والوں تک نہیں پہنچ سکا تبھی کتب سیرت میں امام زین العابدین کے نسخہ کے حوالہ جات بہت کم ملتے ہیں۔[2]

محدثین، سیرت نگار اور مؤرخین شروع سے یہ لکھتے آئے ہیں کہ سیرت نگاری میں سب سے اولین کام امام زہری رحمتہ اللہ علیہ کا ہے اور ایک زمانے تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ سیرت اور مغازی پر کتاب لکھنے والے سب سے پہلے آدمی امام زہری ہیں چنانچہ ان کی ایک کتاب مشاہد النبیؐ کا بہت سے سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن عروہ بن زبیرؓ کی کتاب کی دستیابی، ابان ابن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرویات کے تحریری طور پر مرتب ہونے کا علم اور عاصم بن عمر بن قتادہ کی کتاب کے بعد یہ کہنا کہ امام زہریؒ پہلے مصنف ہیں۔

جدید تحقیقات سیرت کی روشنی میں قدیم ترین سیرت نگار حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں جن کے متعلق امام زہریؒ اور کئی لوگوں کا قول یہ ہے کہ (کان عروۃ بحر الا تکدرہ الدلا (یعنی عروہ بن زبیر یک ایسا سمندر ہے کہ جس کے جتنا چاہو پانی نکالو گدلا نہیں ہوتا)۔[3]

عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم عصر ایک اور تابعی بھی ہیں جن کو عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ کے نام سے پکارا جاتا ہے آپ بھی صحابی رسول ﷺ کے صاحب زادے تھے اور آپ اشعر الفقہاء یعنی شاعروں میں سے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ آپ کا شمار مدینہ طیبہ کے 7نامور ترین فقہا میں ہوتا تھا، عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مانند انہوں نے بھی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دیگر کثیر صحابہ کرام سے اکتساب فیض کیا۔ دونوں کے

---

[1] العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، تہذیب التہذیب،4\201

[2] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت،1960ء،5/166

[3] ابن کثیر، ابو الفداء، اسماعیل بن عمرو، البدایہ والنہایہ، مکتبہ المعارف، بیروت،1990ء،13\136

مشترکہ شاگردوں میں امام محمد بن مسلم بن شہاب زہریؒ تاریخ سیرت میں بہت اونچی شہرت اور نمایاں مقام کا حامل ہے۔

تاہم پہلی ضخیم کتاب امام زہری رحمتہ اللہ نے مرتب کی اگرچہ وہ کتاب براہ راست نہیں آسکی بلکہ ان کے تلامذہ کے ذریعے آگے ہم تک پہنچی اور بعد ازاں ان ہی معلومات کو سیرت نگاروں نے اپنی کتب میں مرتب کیا۔ زہری نے وقت کے بڑے بڑے شیوخ واکابر سے استفادہ کیا، انہوں نے طویل عرصے تک مدینہ طیبہ میں قیام کیا اور امام مالک نے بھی ان سے فیض حاصل کیا تبھی ان کی کتاب موطا میں امام زہری کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ امام زہریؒ کے بارے لیث بن سعد کہتے ہیں کہ وہ جس فن پر بھی گفتگو کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ اسی فن کے متخصص ہیں۔[1]

لیث بن سعد جو امام مالکؒ (93ھ – 179ھ) اور امام شافعیؒ (767-820ء) کے استاد ہیں وہ بھی ان کے خصوصی تلمیذ ہیں جبکہ علم سیرت میں ان کے شاگردوں میں سے تین بڑے اور نمایاں نام ہیں جن میں موسی بن عقبہؒ، معمر بن راشدؒ، اور محمد بن اسحاقؒ شامل ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام محمد بن اسحاق کا ہے جو اپنے وقت کے ایک بڑے محدث اور سیر و مغازی کے ماہر تھے۔

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کہتے تھے: (علیکم بمغازی موسی بن عقبه فانه ثقه) [2](یعنی موسی بن عقبہؒ سے علم مغازی سیکھو اس لیے کہ وہ مستند اور ثقہ ہیں)۔ امام الجرح و التعدیل اور عظیم محدث یحی بن معینؒ (متوفی: 233ھ) نے بھی موسی بن عقبہؒ (متوفی: 141ھ) کی اس کتاب کو سیرت کی مستند ترین کتاب قرار دیا[3]۔

امام زہریؒ کے شاگردوں میں دوسرا معروف نام محمد بن راشد الازدی کا ہے جو کہ 154ھ میں فوت ہوئے اور المغازی پر انہوں نے "کتاب المغازی" کے نام سے تالیف کی، اور ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کی اس کتاب کے اقتباسات امام طبری (224-310ھ)، واقدیؒ، ابن سعدؒ (168ھ-230ھ)، بلاذریؒ (806 -889ء) اور دیگر اہل علم کی کتب میں ملتے ہیں۔

امام زہریؒ کی جملہ معلومات مغازی معمر بن راشد نے حاصل کیں اور ایک کتابی شکل میں مرتب کیں۔ امام

---

[1] ابن کثیر، ابو الفداء، اسماعیل بن عمرو، البدایہ والنہایہ، ص137

[2] ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، دار صادر، بیروت، 1998ء، 1\22

[3] أیضاً، ص23-24

ابو زکریا یحیی بن معینؒ امام الجرح والتعدیل نے کہا کہ زہری کے شاگردوں میں سے معمر بن راشدؒ مستند حیثیت اور مقام رکھتے ہیں اور ان سے منقول معلومات بھی استناد و ثقاہت کے معیار پر فائز ہیں۔ معمر بن راشد الازدیؒ کے تلامذہ میں سے نامور امام عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی ہیں جو کہ 211ھ میں فوت ہوئے، انہوں نے بھی کتاب المغازی کے نام سے کتاب لکھی۔

متقدمین سیرت نگار:

امام زہریؒ کے اہم ترین اور آخری تلمیذ محمد ابن اسحاق ہیں جو کہ فن سیرت کا اتنا نامور اور ثقہ کا نام ہے کہ جس نے دیگر تمام سیرت نگاروں کے کارہائے نمایاں فراموش کروا دیئے[1] انہوں نے 3 مفصل جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب سیرت کے موضوع پر لکھی۔ وہ امام زہریؒ کے خصوصی شاگرد تھے لیکن انہوں نے زیادہ تر علوم دیگر علمائے سیرت سے بھی کیا جن میں ایک عبد اللہ بن ابو بکر بن عمر ابن حزم ہیں۔ یہ وہی عمر ابن حزم ہیں کہ جنہیں نبی اکرمؐ نے یمن کی جانب بھیجتے ہوئے ایک تحریر دی تھی اور ان کے پاس دور نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام کی کئی اور دستاویزات بھی موجود تھی ابن حزم کے پوتے عبد اللہ بھی بہت بڑے عالم اور فقیہ و محدث تھے۔

محمد ابن اسحاقؒ نے براہ راست صحابہ کرام سے علم حاصل تو نہیں کیا لیکن ان کو کئی صحابہ کرام کی زیارت ہوئی، وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر تھے امام صاحب 150ھ میں اور ابن اسحاق 151ھ میں فوت ہوئے انہوں نے انس بن مالک، سعید بن مسیب، ابان بن عثمان، عاصم بن محمد (صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے) اور امام باقر سے استفادہ کیا محمد بن اسحاقؒ نے فن سیرت اور علم مغازی کو اتنا گہرائی اور وسعت کے ساتھ پایا کہ ان کے استاد امام زہری فرمایا کرتے تھے کہ (هذا اعلم الناس بها) (میرا یہ شاگرد اس موضوع کا سب سے اچھا اور بڑا عالم ہے)۔[2]

امام زہریؒ کے ایک اور شاگرد اور واقدی کے استاد محمد بن صالح بن دینار التمارؒ بھی سیرت نگار تھے جن کی وفات 168ھ میں ہوئی۔ اکثر محدثین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ایک بلند پایہ محدث ابو زناد کہتے ہیں کہ اگر مغازی درست طریقے سے سیکھنا ہو تو محمد ابن صالح سے استفادہ کرو۔

اسی طرح متقدمین سیرت نگاروں میں وطن عزیز کے ایک نامور عالم دین علامہ ابو معشر نجیحؒ (متوفی 170ھ) بھی شامل ہیں۔ انہوں نے مغازی پر ایک کتاب مرتب کی تھی جو کہ بطور کتاب تو اپنی اصل حالت میں دستیاب نہیں ہے مگر اس کے بعض حصے علامہ واقدیؒ اور ابن سعدؒ کے ہاں موجود ہیں۔ امام احمد انَ بصیر فی المغازی (یعنی علم سیر میں

---

[1] العسقلانی، تہذیب التہذیب، 4\320

[2] العسقلانی، تہذیب التہذیب، 4\320

صاحب بصیرت) قرار دیتے ہیں ابن الندیم نے بھی ان کی کتاب علم مغازی کا تذکرہ کیا ہے۔

عبد اللہ ابن جعفر المخزومیؒ (متوفی 180ھ) جو کہ فن حدیث میں خصوصی مقام کے حامل تھے وہ بھی سیرت کے اکابر میں سے شمار ہوتے ہیں اور ابن سعد نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ (من رجال اهل المدينه عالماً بالمغازی) (کہ وہ اہل مدینہ کے ان لوگوں میں سے ہیں جو مغازی (علم سیرت) کے عالم کہلاتے ہیں)۔[1] زیاد بن عبد اللہ بن الطفیل البکائیؒ (متوفی 183ھ) جو کہ ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ھشامؒ کے شیخ تھے یہ سیرت طیبہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی محبت میں اپنا گھر بار فروخت کر کے اپنے استاد کی معیت میں نکل گئے تھے اور ایک طویل عرصہ تک ان کے سفر و حضر میں شریک رہے، کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر ترین رواۃ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔[2]

انہی متقدمین سیرت نگاروں میں ایک نام سلمہ بن الفضل الأبرش الانصاری کا بھی ہے کہ جن کی وفات 191ھ میں ہوئی تھی "سلمہ" ابن اسحاق کے خصوصی مصاحب اور ان کی روایاتِ سیرت کے راوی ہیں۔ رے کے قاضی کے منصب پر فائز رہے اہل نقد کے ہاں حجت نہیں ہیں مگر یحیی بن معین مغازی میں ان کی توثیق بھی کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت ہائے نبوی بیان کرتے ہیں طبری بھی ان کے واسطے سے بہت سی روایات بیان کرتے ہیں۔

انہی سیرت نگاروں میں ابو محمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی متوفی 195ھ کا نام بھی شامل ہے جن کو ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے شرف تلمذ رہا گو کہ آپ قلیل الروایت تھے مگر آپ کی ثقاہت مسلمہ ہے صاحب کشف الظنون نے مصنفین مغازی میں ان کا نام بیان کیا ہے۔[3] ابن سعدؒ نے الطبقات میں دیگر سیرت نگاروں میں شام کے نامور محدث ولید بن مسلمؒ، یونس بن بکیرؒ تھا اور وہ ہشام بن عروہ اور ابن اسحاقؒ کے مایہ ناز شاگرد تھے۔

ان متقدمین سیرت نگاروں میں سے ایک معروف نام محمد بن عمر الواقدی الاسلمیؒ کا ہے۔ جن کی سن وفات 207ھ ہے۔ سیرت کے حوالے سے ان کی دو معروف کتب ہیں جن میں سے ایک کا نام "الکتاب السیرت" جبکہ دوسری کا نام "کتاب التاریخ والمغازی والمبعث" ہے۔ امام شافعی نے واقدی کی جملہ تصانیف کو جھوٹ کا انبار قرار دیا ہے جبکہ ایک محدث نے بطور ظرافت یہ کہا کہ واقدی اگر سچا ہے تو اس کا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں اور اگر کذاب ہے تب بھی وہ لاجواب ہے۔[4]

---

[1] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، 1960ء، 5\175

[2] أیضاً، 4/329

[3] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، 1960ء، 5\175

[4] العسقلانی، ابن حجر، تہذیب التہذیب، 4\336

ایک سیرت نگار علی بن محمد المدائنیؒ کا نام بھی ہے جو 225ھ میں فوت ہوئے۔ابو معمشر نجیح اور ابن الفضل وغیرہ کے شاگرد خاص تھے۔ علم تاریخ اور علم الانساب میں خصوصی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ان کو محدثین میں شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن مؤرخین کے ہاں امامت کے درجہ پر فائز ہیں۔ تاریخ وانساب میں کثیر التصانیف ہیں۔ آنحضرتؐ کے احوال میں ان کی کتاب نہایت مفصل ہے۔ جس میں کثیر اقسام کے متعدد و متنوع عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔[1]

انہی متقدمین میں سے ایک محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ (متوفی 279ھ) تھے۔ جو کہ نامور محدث ہیں اور صحاح ستہ میں ان کی کتاب تیسرا درجہ رکھتی ہے۔ سیرت میں ان کا اہم رسالہ ہے جس کا موضوع سابقہ مذکورہ تصانیف سے علیٰحدہ ہے اور اس کا نام کتاب الشمائل ہے جس میں آپ ﷺ کے ذاتی احوال اور عادات واخلاق کا تذکرہ ہے۔ اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ مذکورہ روایات معتبر اور صحیح ہوں۔ ان کے اس رسالے پر متعدد اہل علم نے شروحات وحواشی لکھے۔[2]

متاخرین علمائے سیرت اور ان کی تصانیف:

متقدمین علمائے سیرت کے اسمائے گرامی اور ان کی تصنیفات کے تذکرے کے بعد اہم متاخرین سیرت نگاروں کے اسماء گرامی اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ حسب ذیل ہے۔[3]

سیرت ابن اسحاق کی معروف شرح الروض الانف ہے ، جس کے مصنف شیخ عبدالرحمن السہیلیؒ جو کہ 581ھ میں فوت ہوئے۔ یہ اکابر محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور سیرت طیبہ کے جملہ مصنفین جو ان کے بعد آئے وہ سب تقریباً ان کی معلومات کے حوالے سے خوشہ چیں ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب 120 کتب کی مدد سے لکھی ہے۔ تفصیلی حالات وتعارف فصل اول میں گذر چکے ہیں۔

سیرت الدمیاطی، علامہ عبدالمؤمن الدمیاطیؒ (وفات 705ھ) کی لکھی گئی کتاب ہے جس کے حوالہ جات مختلف کتب میں بکثرت آئے ہیں۔ اس کتاب کا نام "المختصر فی سیرت سید البشر" ہے اور یہ تقریباً ایک سو صفحات پر مبنی ہے۔

شرف المصطفیٰ، ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی 8 جلدوں پر مشتمل تصنیف ہے۔امام ابن حجر نے بھی الاصابہ میں بکثرت اس کے حوالے دیئے ہیں۔ مگر جو روایات حافظ ابو سعید نے ذکر کی ہیں۔ ان میں بعض نہایت

---

[1] الذہبی، ابوعبداللہ شمس الدین محمد، تذکرہ الحفاظ، بیروت، دارالکتاب العربی، 1990ء، 1\129

[2] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، 5\183

[3] الجلبیی، حاجی خلیفہ، مصطفیٰ عبداللہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، 2007ء، 5\121

مہمل اور لغو قسم کی روایات ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رطب ویابس میں کوئی فرق نہیں کیا۔

ابن سید الناس کی تصنیف کردہ کتاب عیون الاثر ہے جو کہ اندلس کے مشہور عالم ہیں 734ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ نہایت جامع اور معتبر کتاب ہے۔ منقولہ اقوال کو سند کے ساتھ ذکر کرنے کا التزام واہتمام کیا ہے۔ نورالنبراس کے مصنف کا نام ابراہیم بن محمد ہے اور انھوں نے یہ عیون الاثر کی شرح کے طور پر کتاب لکھی ہے۔ انداز نہایت ہی محققانہ ہے اور معلومات کا خزینہ ہے جس کی دو ضخیم مجلدات ہیں۔

مواہب لدنیہ کو متاخرین کی اکثریت بطور ماخذ استعمال کرتی ہے۔ اس کے مصنف بخاری کے نامور شارح علامہ قسطلانی ہیں۔ یہ علامہ ابن حجرؒ کے ہم عصر اور ہم پلہ تھے۔ کتاب انتہائی مفصل ہے مگر موضوع اور غلط روایات بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ زرقانی علی المواہب، مواہب لدنیہ کی شرح ہے اور درحقیقت علامہ سہیلیؒ کے بعد یہ واحد کتاب ہے جس کو انتہائی جامع اور محققانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کی آٹھ ضخیم جلدیں ہیں اور مصر میں اس کو چھاپا گیا ہے۔

فصل سوم:
منتخب عربی تصانیف اور ان کے کلامی موضوعات کا جائزہ

فصل سوم: منتخب عربی تصانیف اور ان کے کلامی موضوعات کا جائزہ

علم کلام چونکہ، دینی عقائد و معاملات کی عقلی استدلال سے مزین بحث ہے، اس لیے تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لیکر اب تک تقریبا ہر بڑے سیرت نگار نے ایسے مسائل پر ضرور گفتگو کی ہے جن کا تعلق کلامی مباحث سے ہے۔

کلامی مباحث کے حوالے سے لکھی گئی تین کتب جن میں قاضی عیاض مالکیؒ کی الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، ابو القاسم السہیلیؒ کی الروض الأنف اور حافظ ابن القیمؒ کی زاد المعاد خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ چونکہ مذکورہ تینوں کتب میں اس زمانے کے کلامی و عقلی مباحث اور شکوک و شبہات کو نہایت ہی مدلل و مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے اس حوالے سے ضرورت محسوس کی گئی کہ عصر حاضر کے کلامی و عقلی مباحث کا ان قدیم مباحث کی روشنی میں جائزہ لیکر عہد حاضر میں بالخصوص اسکی معنویت اور نبوات کے حوالے سے جدید عقلی و منطقی شبہات کا یہ تفصیلی و تحقیقی جائز ورد پیش کیا جائے۔

تیسری صدی ہجری کی ابتدا سے اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور ایک طویل عرصے تک یہ موضوعات سیرت کا ایک اہم حصہ رہے بلکہ ابھی تک ان مباحث کو سیرت کا ایک اہم باب سمجھتے ہوئے تقریبا اکثر نامور سیرت نگاروں نے اس سے متعلقہ اہم مسائل پر گفتگو اور بحث کی ہے۔

اس کے بعد نبوت و رسالت کی حقیقت، نبی و رسول میں فرق، نبی اور رسول کس کو کہا جاتا ہے ان کے ذرائع علم، ذرائع علم کی اقسام، وحی اور الہام میں فرق، وحی کا ماخذ علم، پھر حضورؐ کی ختم نبوت، ختم نبوت کی حکمت و فلسفہ، آنحضرتؐ کی امتیازی خصائص و فضائل اور وہ امتیازی اوصاف جو آپؐ کو انبیاء دیگر سے ممتاز کرتے ہیں وہ کیا ہیں؟ ان تمام سوالات کے حوالے سے بہت سی کتب لکھی گئی ہیں چنانچہ جب امتیازی خصوصیات و اوصاف پر بحث کا آغاز ہوا تو معجزہ زیر بحث آیا اور پھر معجزات کی حقیقت اور انبیاءؑ اور آنحضرتؐ کے معجزات میں اگر کوئی باہمی جوہری فرق ہے تو وہ کیا ہے؟

آنحضرتؐ کے ویسے تو بہت سے معجزات ہیں مگر ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ کہ جس کو آپؐ نے اپنی نبوت کے اثبات میں بطور معجزہ و دلیل پیش فرمایا اور پھر خود قرآن حکیم میں آنحضرتؐ کے متعدد معجزات کا ذکر ہے جس میں سب سے بڑا معجزہ اسراء معراج ہے اسراء معراج کے حوالے سے مسلم و غیر مسلم اہل علم کے مابین طویل عرصہ سے غور و خوض اور بحث کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ معراج کے روحانی، کلامی، فقہی اور ادبی سمیت ہر ہر پہلو کے حوالے سے اکابرین اسلام نے بہت کچھ تحریر کیا جس میں برصغیر کے اہل علم کا ایک وقیع و غیر معمولی حصہ

بھی شامل ہے جبکہ واقعہ معراج سے متاثر ہو کر بہت سے غیر مسلم مفکرین و مصنفین نے بھی کثرت سے کتب مرتب کیں۔

قاضی عیاض اندلسی (1083-1149) اور ان کی تصنیف الشفاء:

سیرت طیبہ کے حوالے سے جن سیرت نگاروں کا نام نمایاں نظر آتا ہے ان میں پانچویں صدی ہجری کے معروف عالم قاضی عیاض مالکی کا نام بھی صفِ اول میں شامل ہے۔ آپ کا اصل نام عیاض جبکہ آپ کی کنیت ابو الفضل ہے۔ آپ کا مکمل نسب یوں بیان کیا گیا ہے: عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض۔[1]

قاضی عیاضؒ 476ھ بمطابق 1083ء میں اندلس کے علاقے سبتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق یمن کے معروف قبیلہ حمیر سے تھا اور اسی خاندان کے ایک فرد یحصب بن مالک کی نسبت سے آپ کو "یحصبی" کہا جاتا ہے۔[2] آپ کے خاندان کی علمی لحاظ سے انتہائی ممتاز حیثیت تھی، چنانچہ اس خاندان میں قاضی عیاض رحمہ اللہ سے قبل اور ان کے بعد بہت سارے اصحابِ علم و فضل آئے۔

آپ کے جدِ امجد پہلے فارس منتقل ہوئے اور اس کے بعد ساحلِ اندلس کے سمندر کے مغرب پر مشہور شہر سبتہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ چنانچہ قاضی عیاض رحمہ اللہ یہیں پیدا ہوئے اور اسی علاقے کی نسبت سے ان کو "سبتی" کہا جاتا ہے جبکہ ان کے نام کے ساتھ زیادہ تر اندلسی کی نسبت لگائی جاتی ہے۔

آپ نے اپنے علاقے کے علماء سے ابتداءً استفادہ کیا اور اس کے بعد 508ھ میں اندلس تشریف لے گئے اور وہاں قرطبہ کے شیوخ و اکابر اہلِ علم سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں مزید علمی پیاس بجھانے کے لیے آپ نے مشرق کا سفر کیا اور اپنے زمانے کے معروف اور جید علماءِ فن سے اکتسابِ فیض کیا اور علم و عمل کا منبع و ماخذ بن گئے۔ ان کی زیادہ دلچسپی علمِ حدیث سے تھی چنانچہ حدیث کے جمع و ضبط کے سلسلے میں بہت زیادہ توجہ دی اور ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ علمی لحاظ سے حد یقین کو پہنچے ہوئے تھے۔ اعلیٰ درجہ کی فطانت و ذہانت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ بصیرت و فراست کے ملکہ سے سرشار تھے۔ مسائلِ فقہیہ میں امام مالک رحمہ اللہ کے مقلد تھے چنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ بڑے علماء میں سے ایک زبردست عالم تھے۔[3]

قاضی عیاض رحمہ اللہ کے اساتذہ و مشائخ کے حوالے سے منقول ہے کہ ان کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔[4]

---

[1] ابن خلکان، شمس الدین احمد بن محمد، وفیات الاعیان (منشورات الرضی، قم) 3\483

[2] أیضاً: 3\484

[3] الذہبی، شمس الدین، تذکرۃ الحفاظ، 4\166

[4] ابن خلکان، شمس الدین احمد بن محمد، وفیات الاعیان، 3\485

جن میں سے چند ایک اساتذہ کرام کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:
قاضی ابو علی غسانی صدفی، محمد بن حمدین الشیخ، ابو علی بن سکرہ، ابوالحسین سراج، ابو محمد ابن عثمان، ہشام بن احمد، ابو بحرین العاص، ابو عبداللہ محمد بن عیسیٰ تمیمی اور قاضی ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ المسیلی۔ علامہ ذہبی نے آپ کے اساتذہ کرام میں ابو محمد بن عتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔[1] اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ابن رشد اور ابن الحاج کو بھی شمار کیا ہے۔[2]

قاضی عیاض رحمہ اللہ کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، چنانچہ ان کے شاگردوں میں ابوالقاسم خلف بن بشکوال، ابو جعفر بن قیصر الغرناطی، عبداللہ بن احمد عصیری، ابو محمد عیسیٰ بن الحجری، محمد بن حسن الحائری، فقیہ ابو محمد الاشیری، عبداللہ بن محمد المغربی اور ابو بکر عبداللہ بن طلحہ بن احمد بن عطیہ المحاربی الغرناطی المالکی انتہائی معروف حیثیت کے حامل ہیں جن کو ان کے خصوصی تلامذہ کا درجہ اور شرف حاصل رہا ہے۔[3]

قاضی عیاض رحمہ اللہ کو علمِ حدیث سے بہت شغف تھا اور ان کی اس فن میں مہارت اور ادراک معروف تھا۔ علامہ ابن خلکان کے مطابق آپ حدیث اور علومِ حدیث میں نابغۂ روزگار اور وقت کے امام تھے۔ احادیث کے ضبط و تحریر اور جمع و کتابت پر مکمل توجہ دیا کرتے تھے، تبھی آپ کے پاس احادیث و روایات کا وسیع ذخیرہ تھا۔[4]

اس طرح آپ کو تفسیر، علومِ تفسیر، فقہ اور احکام و شرائع کے علوم پر بڑی دسترس حاصل تھی اس کے علاوہ علم النحو، لغت، کلامِ عرب، علم الانساب اور وقائع کا بھی گہرا علم رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ لامحدود اوصاف اور خوبیوں اور محاسن و کمالات کی عملی تصویر تھے جو کہ علوم و فنون کے جامع، وقت کے امام اور اجل علماء میں سے تھے۔ علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں: (احد الائمة الحفاظ الفقهاء المحدثين الأدباء و تواليفه و اشعاره شاهدة بذلك)[5]
(وہ اکابر ائمہ، حفاظ و محدثین اور افاضل فقہاء و ادباء میں سے ایک تھے اور ان کی تصنیفات اور اشعار اس کے شاہد ہیں)
تبھی ان اوصاف و کمالات کی وجہ سے ان کی شہرت و مقبولیت مقامِ ثریا تک پہنچ چکی تھی۔ اسی طرح علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کو ان کے اپنے علاقے میں جو غیر معمولی رتبہ و مقام اور عزت و وقار حاصل ہوا وہ اہلِ علم میں سے

---

[1] الذہبی، شمس الدین، تذکرۃ الحفاظ، 4\68
[2] دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، بستان المحدثین، (مطبع مجتبائی دہلی 1898ء)، ص346
[3] الذہبی، شمس الدین، تذکرۃ الحفاظ، 4\68
[4] ابن خلکان، وفیات الاعیان، 3\485
[5] أیضاً: 3\486

کسی کو بھی نہ اس سے قبل ملا نہ ان کے بعد یہ مقام کسی نے پایا۔[1]

قاضی عیاض رحمہ اللہ کا شمار مالکی مذہب کے اکابر میں ہوتا ہے۔ ان کی نظر مالکی مذہب کے اصول و فروع پر بہت وسیع تھی اور وہ اس فقہی مسلک کی جملہ جزئیات کے زبردست حافظ تھے۔ چنانچہ مالکیہ اکثر مسائل اور فقہی جزئیات میں انہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور آپ کو تمام باریکیاں ازبر تھیں۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ خطابت کے لحاظ سے نہایت فصیح و بلیغ اور شیریں کلام تھے۔ آپ کے درس میں عوام الناس کا جمِ غفیر رہتا تھا اور سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ابن خلکان نے ان کو "کبیر الشان اور غزیر البیان" کے القابات دیے ہیں۔[2] اور عمر رضا کحالہ نے آپ کو "خطیب" کا لقب دیا ہے۔[3]

جبکہ آپ نے باقاعدہ تعلیم سے فراغت کے بعد تدریسی شعبے کا انتخاب کیا اور آپ کے حلقہ علم سے کثرت سے اہلِ علم و طلباء مستفید ہوئے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ علوم فقہ و حدیث اور نحو و بلاغت کے ساتھ ساتھ اہلِ عرب کے انساب و ایام کی معرفت و ادراک کامل رکھتے تھے بایں وجہ آپ انتہائی لطیف ادبی ذوق اور شاعرانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔ چنانچہ آپ کے بہت سارے اشعار اور قصائد نے شہرت اور قبولیت حاصل کی۔[4]

آپ کے حالات میں اکثر مؤرخین لکھتے ہیں کہ آپ انتہائی کم عمر میں منصب قضا پر مامور ہوئے چنانچہ سبتہ اور پھر غرناطہ میں آپ کو قاضی مقرر کیا گیا اور ایک عرصہ تک آپ نے بڑے انصاف و عدل کے ساتھ اس منصب کے تقاضوں کے عین مطابق خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ محمد بن حماد سبتی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض اٹھائیس سال کی عمر میں بہت بڑے مناظر بن گئے تھے، اور جب آپ پینتیس برس کو پہنچے تو آپ منصبِ قضا کی زینت بن گئے۔[5]

قاضی عیاض 9 / جمادی الاخریٰ 544ھ (1149ء) میں مراکش میں انتقال فرما گیے۔ آپ کو بابِ ایلان میں سپردِ خاک کیا گیا۔[6] آپ کی مکمل زندگی تحصیلِ علم، تدریس و مناظرہ، قضاء اور تصوف و ارشاد کے علاوہ تصنیفی و تالیفی خدمات میں گذری۔ آپ کی تصنیفات کا معیار کماً و کیفاً ہر دونوں لحاظ سے بہت اعلیٰ اور علمی میدان کا عظیم سرمایہ تھا بایں وجہ ان تصانیف نے شہرت کی معراج کو پالیا۔ اور ہر زمانہ کے اہلِ علم میں ان کتب کی مقبولیت رہی۔ چنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں:

---

[1] الذہبی، شمس الدین، تذکرۃ الحفاظ، 4\68

[2] ابن خلکان، وفیات الاعیان، 3\484

[3] کحالہ، عمر رضا، معجم المؤلفین، (بیروت: لبنان، ادارہ احیاء التراث العربی) 8\16

[4] دہلوی، شاہ عبد العزیز محدث، بستان المحدثین، ص346

[5] الذہبی، شمس الدین، تذکرۃ الحفاظ، 4\68

[6] ابن خلکان، وفیات الاعیان، 3\485

(و صنف التصانيف التي سارت بها الركبان و اشتهر اسمه و بعد ميته---و لم يكن احد بسبتة في عصره اكثر تواليف منه) [1]

(آپ نے بہت سی کتابوں کو لکھا جس کی شہرت چاروں اطراف میں پھیل گئی ان کی بدولت مصنف کا نام روشن ہوا اور خوب چرچا ہوا۔۔۔ان کے وطن سبتہ میں کوئی ایسا صاحبِ علم نہیں گذرا جس کی تصنیفات اس قدر زیادہ ہوں۔)

قاضی عیاض رحمہ اللہ کی مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

الشفاء بتعريف حقوق المصطفى، الالماع فى اصول الرواية و السماع، مشارق الانوار على صحاح الآثار فى تفسير غريب الحديث المؤطا و البخارى والمسلم ، العقيده،جامع التاريخ،العيون السنة فى اخبار سبتة،التنبيهات المستنبطة فى شرح مشكلات المدونة فى فروع الفقه المالكى،الاكمال فى شرح كتاب مسلم،ترتيب المدارك و تقريب المسالك فى ذكر فقهاء مذهب مالك ،كتاب المعلم فى شرح المسلم،السيف المسلول على من سب اصحاب الرسول،نظم البرهان علىٰ صحة جزم الاذان،غريب الشهاب . [2]

الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ کا کلامی منہج واسلوب:

قاضی عیاض رحمہ اللہ کی تمام تصانیف علمی و ادبی لحاظ سے انتہائی قیمتی خزینہ ہیں۔ اہلِ علم و مشائخ نے انہیں خوب قدر دانی سے نوازا اور ہر ممکن استفادہ کیا تاہم من جملہ کتب میں سب سے زیادہ جس کتاب نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا وہ ان کی کتاب "الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ" ہے۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے اپنی اس کتاب میں جنابِ رسول ﷺ کے فضائل و شمائل کو صحیح اور مستند احادیث کے مجموعے سے انتہائی عقیدت و احترام اور خلوص و محبت سے ضبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ بیشتر محدثین اور سیرت نگاروں نے اس کتاب سے بطورِ ماخذ استفادہ کیا۔ اس کتاب کا مختصر خلاصہ اور تجزیہ حسبِ ذیل ہے۔

کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر حصے کے کئی ابواب اور فصول ہیں۔ حصہ اول جنابِ رسول

---

[1] الذہبی، شمس الدین، تذکرۃ الحفاظ، 4\68

[2] أیضاً، 4\68-69

اکرم ﷺ کی توصیف و ثناء، عظمتِ شان، کمالات و فضائل کی جامعیت اور معجزات و کرامات پر مشتمل ہے۔ جو کہ ربِ کریم نے بیان فرمایا ہے۔ حصہ دوم اس میں آپ ﷺ کے وہ حقوق بیان کیے گیے ہیں جو کہ جملہ مخلوق پر وجوب کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ پر ایمان لانا، آپ ﷺ کی کامل اطاعت کرنا، آپ ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت کرنا، آپ ﷺ کے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھنا اور آپ ﷺ کی شانِ اقدس میں درود و سلام بھیجنا وغیرہ۔

حصہ سوم اس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ کن بشری اوصاف و خصوصیات اور خصائل کو آپ ﷺ سے منسوب کرنا آپ کے شایانِ شان ہے اور کون کون سے امور و اوصاف آپ ﷺ کی عظمت و شان کے منافی ہیں۔ اس حوالے سے تفصیلی بحث اس حصے میں موجود ہے۔ چنانچہ مصنف علیہ الرحمۃ کے ہاں کتاب کا یہ حصہ دوسرے حصوں کے مقابلے میں مہتم بالشان اور اس کتاب کی تصنیف کی اصل غرض و غایت ہے چنانچہ یہ حصہ ابتدائی حصوں کا دیباچہ اور آخری مباحث کا تکملہ ہے۔

حصہ چہارم اس آنحضرت ﷺ کی تنقیص و توہین اور سب و شتم کرنے والے لوگوں کے احکام پر مشتمل ہے جبکہ اس حصہ کے اخیر میں اللہ رب العزت، ملائکہ، اور اصحاب رسول ﷺ اور اہلِ بیت کرام کی توہین و گستاخی اور سب و شتم کرنے والوں کے احکامات کے حوالے سے تفصیلات پر مشتمل ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ کا اندازِ تحریر انتہائی جاندار، سادہ اور عام فہم ہے۔ سیرتِ طیبہ کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کی بے پناہ محبت و عقیدت اور ان کا عاجزانہ و منکسرانہ مزاج و جذبات خوب واضح اور اظہر من الشمس ہیں۔ علامہ موصوف علیہ الرحمۃ نے جہاں آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر و تاویل کی ہے، وہاں اس کے ضمن میں اعراب و ترکیب، اختلاف قرءآت اور مفسرین کرام کے تفسیری اقوال کو خوب بیان کیا ہے۔

اسی طرح کتاب الشفاء کے حوالے سے علامہ خفاجی کے مطابق شفاء شریف کا ماخذ شفاء ابن سبع ہے۔[1]

اس کی اتباع میں کتاب الشفاء للقاضی عیاض میں بھی بعض مقامات پر ضعیف احادیث ہیں، مگر بہت کم لوگوں نے ان کو موضوع قرار دیا ہے۔ امام جلال الدین السیوطی نے اپنی کتاب "مناھل الصفافی تخریج احادیث الشفاء" میں ان جملہ احادیث کی نشان دہی کی ہے۔[2]

کتاب الشفاء کو بتعریف حقوق المصطفیٰ کو ربِ کریم نے مصنف کے غیر معمولی اخلاص اور حبِ رسول ﷺ کے باعث انتہائی مقبولیتِ عامہ عطا فرمائی چنانچہ اسی وجہ سے اس کی کثیر تعداد میں شروحات و تعلیقات اور مختصرات و تلخیصات

---

[1] علامہ خفاجی، احمد شہاب الدین، نسیم الریاض، شرح الشفاء للقاضی عیاضؒ، 1/52، مطبوعہ بیروت 1053ھ۔
[2] ایضاً، 1/52

وغیرہ تحریر کی گئیں۔ ان میں سے چند ایک شروحات و تلخیصات کے نام درج ذیل ہیں۔[1]

1۔ المنھل الاصفیٰ فی شرح ما تمس الحاجۃ الیہ من الفاظ الشفاء لابی عبد اللہ محمد ابن ابی شریف تلسمانی۔ 917ھ میں اس کی تصنیف مکمل ہوئی۔

2۔ امام جلال الدین السیوطی نے "مناھل الصفافی تخریج احادیث الشفاء" کے نام سے شرح لکھی۔

3۔ حافظ برہان الدین بن ابراہیم بن محمد الحلبی نے "المقتفیٰ فی حل الفاظ الشفاء" کے نام سے شرح لکھی۔

4۔ علامہ تقی الدین ابولعباس احمد بن محمد الشمنی نے "مزیل الخفاء عن الفاظ الشفاء" کے نام سے حاشیہ تحریر کیا۔

5۔ محمد بن خلیل بن ابی بکر ابی عبد اللہ الحلبی نے "زبدۃ المقتضیٰ فی تحریر الفاظ الشفاء" نامی شرح تحریر کی۔

6۔ شہاب الدین احمد خفاجی نے "نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض" کے نام سے مفصل اور تحقیقی شرح لکھی۔

7۔ حافظ عبد اللہ بن احمد بن سعید بن یحیٰ الزموری نے بھی شرح لکھی۔

8۔ شیخ استاد ابو عبد اللہ محمد بن حسن بن مخلوف الراشدی المعروف بابرکان نے کتاب الشفاء کی تین شروحات تحریر کیں۔ 1۔ الغنیہ: دو جلدوں میں بڑی شرح ہے۔ 2۔ الغنیہ الوسطیٰ، 3۔ چھوٹی شرح ایک جلد میں لکھی۔

9۔ شیخ محمد بن احمد اسنوی الشافعی (م 763ھ) نے شفاء کا اختصار کیا اور اس کی تلخیص لکھی۔

10۔ علامہ علی بن سلطان محمد القاری (ملا علی قاری) نے بھی "شرح الشفاء حضرت ملا علی قاری" کے نام سے شرح لکھی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ کی مذکورہ کتاب نہایت مفید، حد درجہ مقبولیت و شہرت پانے والی بے نظیر تصنیف ہے۔ اس کتاب کی جدت و ندرت تمام مسالک و طبقات میں یکساں مقبولیت کی حامل ہے۔ ان کے دل نشین اور عام فہم انداز کی تعریف نہ صرف اہلِ سیر اور اصحابِ فن نے کی ہے بلکہ ان کے معاصرین بھی ان کے اس کمال کے خوب معترف ہیں۔

چنانچہ صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں: (یہ نہایت قیمتی اور نافع کتاب ہے۔ تاریخ اسلامی میں اس سے قبل اتنی اچھی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔)[2] اسی طرح علامہ لسان الدین خطیب تلمسانی کے مطابق شفاء قاضی عیاض دلوں کی شفاء ہے اور اس کی فضیلت کسی سے ڈھکی چھپی اور مخفی نہیں۔ یہ بہت بزرگ اور صالح شخصیت کا تحفہ و ھدیہ ہے جس کا بدلہ محض ثواب اور ذکر ہے۔[3]

علامہ شہاب الدین خفاجی کے بقول کتاب الشفاء کا نام اس کے مسمی کے عین موافق ہے کیونکہ اسلاف کے نزدیک

---

[1] الچلپپی، خلیفہ حاجی، کشف الظنون، مطبوعہ بیروت، ص1053

[2] خلیفہ، حاجی، کشف الظنون، 2\1053

[3] دھلوی، شاہ عبد العزیز محدث، بستان المحدثین، ص342-343

اس کا پڑھنا مشکلات کی گرہیں کھولنے میں مجرب ہے وہاں رسول اللہ ﷺ کی برکت سے ڈوبنے اور طاعون وغیرہ مصائب سے حفاظت کا باعث ہے۔ جبکہ سلف کے مطابق اگر اعتقاد درست ہو تو آدمی کی مراد بھی پوری ہو جاتی ہے۔[1]

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غرض یہ بڑی اہم، انتہائی معروف و مقبول کتب میں سے ہے۔ بعض شعراء نے اس کتاب کی تعریف بذریعہ اشعار و منظوم کلام کی ہے۔[2]

یقیناً یہ کتاب قلوب کا نور اور رونقِ ایمان ہے، کیونکہ اس کتاب میں جنابِ رسول اللہ ﷺ کے شمائل و فضائل کو احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اور آپ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ، آپ ﷺ کا مقام و رتبہ نہایت ہی مؤدبانہ اور مؤقرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو کہ اس عظیم کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔

علامہ السہیلی (1114-1185) اور ان کی تصنیف الروض الانف

علامہ ابن ہشام کی معروف کتاب "السیرۃ النبویہ" رسول اقدس ﷺ کی سیرت طیبہ کے حوالے سے بیش بہا تاریخی و تمدنی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ جس کی قبولیت و افادیت کے باعث اس کتاب کی بہت سی شروحات تحریر کی گئیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت کا مقام "الروض الانف" کو حاصل ہوا۔

یہ کتاب سیرت طیبہ کے حوالے سے ایسی گراں قدر معلومات اور نادر افادات کا علمی خزینہ ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کے بقول ابن ہشامؒ کی وہ شرح جو علامہ سہیلیؒ نے الروض الانف کے نام سے لکھی وہ بہت جلد مقبول ہو گئی اور دنیائے اسلام کے ہر علاقے میں مقبول اور متداول رہی۔[3]

السہیلی کا اصل نام عبد الرحمٰن بن عبد اللہ ہے۔ آپ ابو رویحہ خثعمی کی اولاد میں سے تھے جن کو اہل سیر کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے سال علم عطا فرمایا تھا۔[4] آپ کی ذاتی زندگی اور خاندانی حالات کے حوالے سے تذکرہ نگاروں نے سکوت اختیار کیا ہے۔ علامہ ابن دحیہ کے مطابق انہوں نے قرطبہ کا سفر کیا۔۔۔ سات قراءت سے قرآن پڑھا اور مجھ سے فرمایا وہ میرے والد کا بہت احترام فرماتے تھے۔ (اللہ تعالیٰ دونوں پر رحم فرمائے)۔[5]

علامہ سہیلیؒ کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ علامہ یاقوت حموی لکھتے ہیں: وادی سہیل اندلس کے ضلع مالقہ میں ہے

---

[1] علامہ خفاجی، احمد شہاب الدین، نسیم الریاض، جلد اول، مقدمۃ الکتاب۔

[2] دھلوی، شاہ عبد العزیز محدث، بستان المحدثین، ص 343

[3] غازی، محمود احمد، محاضرات سیرت، (الفیصل لاہور، جنوری 2017ء)، ص 244

[4] الذھبی، ابو عبد اللہ شمس الدین بن محمد (748ھ)، تذکرۃ الحفاظ (بیروت: لبنان، دار احیاء التراث العربی 1334ھ)، 4\1384

[5] الابیاری، ابراہیم، المطرب من اشعار اہل المغرب، (بیروت: دار العلم للجمیع)، ص 231

جس کے ایک گاؤں سے الروض الانف نامی سیرت کے شارح عبد الرحمٰن سہیلی کا تعلق ہے۔[1] ابن خطیب کے ہاں اس کی حیثیت ایک قلعہ کی سی ہے۔[2] حمیری نے لکھا ہے کہ: وہاں پر بلند و بالا پہاڑ ہے جس کے باشندوں کے ہاں سہیل نامی تارہ اس کی بلندی سے نظر آتا ہے بایں وجہ الروض الانف کے مؤلف حافظ ابو القاسم کی نسبت سہیلی ہے۔[3]

محقق شیخ عبد اللہ عنان لکھتے ہیں کے مطابق سہیل قدیمی شہر ہے، اس کی تاریخ رومن عہد تک پہنچتی ہے۔۔۔ ابھی یہ شہر (Fuengirola) کے نام سے معروف ہے جو کہ مالقہ سے تیس کلو میٹر دور ہے۔[4]

علامہ سہیلیؒ کی پیدائش 508ء میں ہوئی۔[5]

سترہ سال کی عمر میں اپنی بینائی و بصارت کھو چکے تھے۔[6] ان کے شاگرد خبی نے تو صراحتاً لکھا ہے کہ وہ بینائی سے محروم تھے اور ابن عربی خاتمی صوفی نے اپنی کتاب محاضرات الابرار کے مآخذ کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً یہی بتایا ہے۔[7] تاہم ایک مقام ایسا بھی ہے کہ جس سے علامہ سہیلیؒ کی بصارت کھونے والی بات قطعاً شک پیدا کرتی ہے۔۔۔ موصوف علیہ الرحمۃ ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی اپنی بصارت سے کام لینے پر مکمل قدرت رکھتے تھے، کیوں کہ خود موصوف کے مطابق وہ الروض الانف کی تالیف سے جمادی الاولیٰ 569ھ میں فارغ ہوئے۔[8]

ابن دحیہ کے مطابق علامہ سہیلی مالقہ میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی و بنیادی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ قرآن حکیم کی تحفیظ سے فارغ ہوئے بعد ازاں علوم عربیہ اور اس کے قواعد سے متعلق اولین مبادیات سے استفادہ کیا۔ علم فقہ، حدیث، اور نحو وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ اس وقت کے علمی حلقوں میں مذکورہ تمام شخصیات کا سہیلی کی متنوع تعلیم و تربیت پر اثر معلوم ہوتا ہے۔[9]

یہ چھٹی صدی ہجری کا زمانہ تھا جس میں علامہ سہیلی نے زندگی گزاری اور یہ صدی علم و تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے اندلس کی سرسبز و زرخیز صدیوں میں سے تھی۔ اس وقت کے علمی حلقوں میں علم و معرفت کے متنوع فنون و علوم کا

---

[1] الحموی، یاقوت، معجم البلدان (بیروت: دار صادر غیر مؤرخ)، 3\291

[2] شبانہ، محمد کمال، معیار الاختیار فی ذکر المعاہد والدیار (ناشر وزارۃ الاوقاف المغرب)، ص85

[3] احسان عباس، دکتور، رحلۃ التجانی، (طبع دار العربیہ للکتاب، 1998ء)، ص59

[4] عنان، عبد اللہ، الآثار الاندلسیہ الباقیہ فی اسبانیۃ والبرتغال، (مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، طبع دوم 1966ء)، ص257

[5] المطرب، ص، 233، ابن ابار، تکملۃ الصلۃ، (بیروت: دار العلم، 1410ھ)، 2\572، الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، 4\1348

[6] ابن ابار، تکملہ الصلۃ، (بیروت: دار العلم، 1410ھ)، 2\571

[7] حاتمی، ابن عربی، محاضرات الابرار و مسامرات الاخیار فی الادبیات والنوادر والاخبار، (بیروت: دار صادر، غیر مؤرخ)، 1\14

[8] السہیلی، ابو القاسم، الروض الانف، 1\5

[9] الصحراوی، محمد الامین، الارتجال فی مناقب سبعۃ رجال، مخطوط الخزانۃ الحسینہ نمبر 194

شہرہ تھا جن میں سے زیادہ تر رجحان لغوی و نحوی علوم کی طرف تھا۔ علامہ سہیلیؒ اپنے مضبوط حافظے اور غیر معمولی ذہانت کے باعث مختلف علوم و فنون میں مہارت تامہ اور اختصاص کے درجے تک پہنچے علم قرات کے حوالے سے تو اتنی قابلیت رکھتے تھے کہ اس کے امام شمار ہوئے۔ مشہور قول کے مطابق 581ھ میں ان کی وفات ہوئی جہاں ان کی قبر مشہور ہے۔[1]

علاوہ ازیں سیرت، تاریخ، اور انساب کے حوالے سے بھی وہ بہت معروف حیثیت کے حامل رہے۔ جس پر ان کی معروف تالیف الروض الانف شاہد ہے جو کہ علوم و معارف کا خزینہ بے بہا ہے۔ مذکورہ تالیف میں تاریخی واقعات، فقہی استنباطات، نحوی و لغوی تحقیقات اور نکات و دقائق ملتے ہیں جو ان کی کتاب کے ابواب و فصول سے مزین ہیں اور مؤلف کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کا درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ موصوف کی تصنیفات انتخاب موضوع کے لحاظ سے جدت اور اس پر بحث کے طریقہ میں مہارت کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر مبہمات القرآن کے موضوع پر ان سے قبل کسی نے طبع آزمائی نہیں کی اور سیرت طیبہ کے شارح کی حیثیت سے بھی وہ سب سے اول تھے۔ اکثر مسائل میں ان کی بحث میں جدت نظر آتی ہے چاہے ان مسائل کا تعلق نحو و صرف، لغت، فقہ اور بلاغت سے ہو۔ ان کی الروض الانف خصوصاً ایسے مسائل کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ جو انہوں نے انتہائی جلد علمی مہارت حاصل کر کے لکھی ہے۔

علامہ موصوف کی معروف تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ الروض الانف:

علامہ سہیلیؒ کی عظیم ترین تصنیف ہے جو کہ قدیم و جدید زمانہ میں اہل علم میں معروف رہی ہے۔ انہوں نے خود بتلایا ہے کہ: میں نے اس املاء میں سیرت میں وارد نامانوس الفاظ، مبہم اعراب، پیچیدہ کلام، مشکل نسب، قابل توجہ مسائل فقہیہ یا قابل تکمیل نامکمل اخبار سے آگاہ کیا ہے۔[2] یہ کتاب اپنے علمی مرتبے اور مباحث کی قدر و قیمت کے باعث اب تک مختلف مطالعات اور علمی ابحاث کا مرجع و ماخذ ہے، اہل لغت نے اپنا مقصد اس میں پایا تو اس سے مواد نقل کر کے استفادہ کیا۔ اسی طرح نحو، فقہ، تفسیر، بلاغت وغیرہ علوم و فنون کے دیگر مراجع و مصادر اس کے اقتباسات سے بھرے پڑے ہیں۔

2۔ کتاب الفرائض و شرح آیات الوصیۃ

ڈاکٹر محمد ابراہیم بنا کی تحقیق سے قاریونس یونیورسٹی لیبیا نے 1980ء میں پہلی بار شائع کی۔ اس کے اول حصہ میں کتاب و سنت اور اقوال صحابہؓ کی روشنی میں وراثت کے مصادر پر کلام ہے جب کہ دوسرے حصے کو چار ابواب میں یوں تقسیم

---

[1] الصحراوی، محمد الامین، الارتجال فی مناقب سبعۃ رجال: نمبر 194

[2] السہیلی، الروض الانف، 1\171

کیا گیا ہے۔ ا: میراث کے اصول اور حصہ دار۔ ب: میراث کے وہ حصے جن میں کمی و زیادتی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ج: میراث کے وہ حصے جن میں کمی و زیادتی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ (اسی باب میں دادا کی وراثت پر بھی ایک فصل ہے)، د: میراث سے مانع اسباب۔

3۔ نتائج الفکر

یہ بھی دکتور محمد ابراہیم بنا کی تحقیق سے دو مرتبہ لیبیا سے اولاً 1978ء اور ثانیاً مصر سے 1984ء میں شائع ہوئی۔ اس میں دلالت، علت، عامل، نظم قرآن اور مصطلحات و تعریفات کی تنقید پر بحث ہے۔[1]

4۔ التعریف والاعلام بما ابھم فی القرآن من الاسماء والاعلام:

مذکورہ بالا کتاب کا موضوع قرآن حکیم میں مبہم اسماء و اعلام کی وضاحت پر مبنی ہے۔ چنانچہ مؤلف خود لکھتے ہیں کہ: اس مختصر کتاب میں میرا مقصد ان انبیاء، اولیاء، انسانوں، فرشتوں، جنات، ملکوں، تاروں، درختوں یا حیوانات کے اسمائے اعلام بیان کرنا ہے کہ جن کا ذکر کتاب اللہ میں ان کے اسم علم کے بغیر آیا ہے۔ مگر اہل کتاب علماء اور ناقلین اخبار کے ہاں وہ معروف ہیں۔[2]

5۔ مجموعۃ من الامالی والمسائل المفردات:

ڈاکٹر محمد ابراہیم بنا نے علامہ سہیلیؒ کے املاء شدہ مجموعہ کا ایک حصہ امالی السہیلی کے نام سے شائع کروایا۔ جس کے نام پر ڈاکٹر طٰہٰ محسن کو اعتراض ہے۔[3] یہ پانچ مسائل پر مشتمل ہے۔

6۔ مسائل فی النحو واللغۃ والحدیث والفقہ:

دکتور طٰہٰ محسن کو یہ مخطوط مکتبہ فاتح، استنبول کے مجموعہ نمبر 469 کے ضمن میں ملا تو موصوف نے تحقیق کر کے عراق سے شائع شدہ مجلہ المورد میں شائع کروایا، وہ یقینی طور پر اس بات کے قائل ہیں کہ یہ ڈاکٹر بنا کے شائع کردہ مجموعہ (مذکورہ بالا) کا حصہ دوم ہے۔ بعض مسائل پر تو بہت طوالت پر مبنی کلام ہے جب کہ بعض پر انتہائی مختصر کلام کیا گیا ہے۔[4]

الروض الانف کی خصوصیات:

یہ کتاب بیش قیمت افادات و معلومات کا نادر خزانہ ہے۔ چنانچہ یہ 1332ھ میں مطبع جمالیہ مصر سے دو حصوں میں

---

[1] النجار، عبد الحلیم، تاریخ الادب العربی لبروکلمان (دار المعارف، مصر، طبع چہارم)، 3\13

[2] اصلاحی، محمد اجمل، ابن ہشام اور سیرت ابن ہشام، مقالہ مشمولہ نقوش رسول نمبر، شمارہ نمبر 13 ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1982، 1\484-485

[3] طٰہٰ محسن، ڈاکٹر، مجلۃ المورد العراقیہ، مطبوعہ 1989ء، 18\84

[4] ایضاً

شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن عبد الرحمٰن وکیل کی تعلیق و تحقیق سے دار الکتب الحدیثہ قاہرہ سے تین حصوں میں (1967 تا1970ء) شائع کیا گیا جب کہ تیسرا ایڈیشن طٰہٰ عبد الرؤف سعد کی کاوش سے 1973ء میں مکتبہ الکلیات الازہریہ قاہرہ سے چار حصوں میں سیرت ابن ہشامؒ کے ساتھ شائع کروایا گیا۔ مؤلف رحمہ اللہ نے اپنی اس تالیف میں متفرق مباحث بیان کیے ہیں جن کی توضیح انہوں نے خود کتاب کے مقدمہ میں فرمائی ہے۔ چنانچہ مقدمہ کے چند نکات حسب ذیل ہیں:

مقدمہ کا آغاز خالق کائنات کی حمد و ثناء سے کیا ہے۔ مؤلف کی للّٰہیت اور رب کریم سے گہرے تعلق اور رجوع الی اللہ کا اظہار ان کے الفاظ سے واضح ہے۔[1] رب کائنات کی تسبیح و حمد اور خلیفہ وقت کی تعریف کو ابتداءً بیان کرنے کے بعد مؤلف علیہ الرحمۃ نے سرکار دوعالم رحمت للعالمین ﷺ کی مدح و نعت کو بہت احسن انداز میں بیان کیا ہے۔[2]

مذکورہ تالیف کے مقدمہ کا اصل حسن مؤلف کا محبت سے لبریز بیان ہے۔ اس کتاب میں علمی و جذباتی گہرائی کا اندازہ ان کی اپنی وضاحت سے ہوتا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ: اس تصنیف سے علوم و آداب، اسماء الرجال، انساب، باطن کے خالص نکات، نحو کی تعلیلات، اعراب کی تصحیح جیسے فوائد حاصل ہوں گے۔ جو ایک سو بیس سے زائد کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض میرے سینے میں پیدا ہوئے انہیں میرے غور و فکر نے خوشبو میں بسایا ہے۔ میرے غور و خوض ے ان کی نگرانی کی ہے۔۔۔ یوں یہ کتاب حجم کے اعتبار سے تمام کتابوں سے مختصر ہے مگر یہ علم سے لبریز جام ہے۔[3] السہیلیؒ نے مذکورہ کتاب کا آغاز محرم الحرام 569ھ میں کیا اور اسی سال جمادہ الاولیٰ میں یہ تالیف مکمل کی۔ چنانچہ صرف پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں اس عظیم علمی و تحقیقی کاوش کو سرانجام دیا۔[4]

الروض الانف کا کلامی منہج واسلوب:

1۔ جناب رسول اللہ ﷺ سے محبت وعقیدت کے لحاظ سے ہی بلکہ دیگر کتب کے مقابلے میں اسلوب اور طرز بیان کے لحاظ سے بھی امتیازی اور منفرد ہے۔ موصوف مؤلف نے سیرت ابن ہشامؒ میں پائے گئے قصائد کے غریب و مشکل الفاظ کی توضیح و تشریح کی۔

2۔ علامہ سہیلیؒ خود ایک بلند پایہ ادیب اور نحوی تھے بایں وجہ انہوں نے نحوی قواعد و ضوابط کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ جس قصیدے کے کسی شعر سے کوئی نحوی اصول اخذ کیا جا سکتا ہو اس جانب بھی توجہ مبذول کروائی ہے۔ یوں علامہ سہیلیؒ نے "سیرت ابن ہشام" کو بہت آسان بنا دیا۔

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1\15

[2] أیضاً: 1\16

[3] السہیلیؒ، الروض الانف، 1\18

[4] ایضا: 1\18

3۔ علامہ ابو القاسم السہیلی نے سیرت ابن ہشام میں لکھے گئے غریب الفاظ کی تشریح کی ہے، مثال کے طور پر لفظ "الصلٰوۃ" کے لغوی معانی پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اہل عرب کہتے ہیں کہ صلیٰ علیہ یعنی وہ اس کی طرف مڑا۔ پھر رحمت و شفقت کو انہوں نے "صلٰوۃ" سے تعبیر کیا اور رحمت کو صلٰوۃ تب کہا جاتا ہے جب اس میں بہت زیادہ مبالغہ مقصود ہو۔[1]

4۔ مؤلف نے ابتدائے کتاب میں حضور اقدس ﷺ کے نسب کی مکمل تفصیلات بیان فرمائیں۔ سیرت ابن ہشامؒ میں آپ ﷺ کا نسب حضرت آدمؑ تک بیان کیا گیا ہے۔ علامہ سہیلیؒ نے اس سارے نسب نامے میں شامل ہر ہر فرد کے نام کے اعراب، تلفظ اور اس کی تاریخی حوالے سے حیثیت کی توضیح کی ہے۔[2] مفصل فقہی بحث کرنے کے مختلف فقہاء کے نقطہ نظر کو بیان کیا ہے اور قرآن و حدیث کو مستدل بنایا ہے۔ اور اس کے ساتھ تورات کا بھی حوالہ دیا ہے۔[3]

5۔ ابن ہشامؒ نے جہاں مختلف مقامات پر اپنی کتاب میں اختصار سے کام لیا ہے علامہ سہیلیؒ نے وہاں معلومات کو تفصیلاً اور وضاحت سے پیش کیا ہے مثال کے طور پر غزوہ احد کے واقعات کے ضمن میں جبل احد کی فضیلت کو بیان کیا ہے اور اس میں جبل احد کی اغراض توحید کے ساتھ مطابقت و موافقت کو قدرے تفصیل سے واضح کرتے ہیں۔

6۔ علامہ سہیلیؒ نے اپنی اس کتاب کے اندر صرفی و نحوی ابحاث کا خوب اہتمام کیا۔ مثال کے طور پر آنحضرت ﷺ کے نسب مبارک میں "عبد مناف" کے تعارف میں فرماتے ہیں کہ ان کا نام مغیرہ تھا۔۔۔ یونہی مغیرہ کے آخر میں بھی ھاء لگا دی گئی ہے۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مغیرہ میں ھاء تانیث کے لیے ہو یا لشکر کے وصف یا غارت گری کرنے والے گھوڑوں سے مشتق ہو جیسا کہ اہل عرب "عسکر" عموماً رکھتے ہیں[4]

نحوی ابحاث کے حوالے سے لفظ "الجلالۃ" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو "یاایھا" سے نہیں پکارتے۔۔۔ اس کے علاوہ بہت سے اور احکام بھی ہیں کہ جنہیں اس نام کا حکم دوسرے معرفہ بنائے ہوئے اسماء سے مختلف ہے۔[5] اس طرح صفت مشبہ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے علامہ موصوف سیبویہ کی بیان کردہ صورتوں کو پیش کر کے لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اسرار و رموز ہیں، صفت کے باب میں تعلیل کے انوکھے عجائبات ہیں۔[6]

7۔ مؤلف نے بعض مقامات پر کلام کی وضاحت عربی اشعار سے بھی کی ہے۔ جیسے مثال کے طور پر لفظ "عمرو" کی وضاحت

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف: 2\3-4

[2] أیضاً: 1\23-37

[3] أیضاً: 2\423-431

[4] السہیلیؒ، الروض الانف، 1\24-25

[5] السہیلیؒ، الروض الانف: 1\260

[6] أیضاً: 1\240-241

کے لیے تنوخی کے اس شعر کو بیان کیا ہے:

ے (وعمرو هند كان لله منوره عمرو بن هند يسوم الناس تعنينا)

(ہند کی بالی اس قدر حسین ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کو صورت بخشی ہے۔ عمرو بن ہند لوگوں کو مشکلات میں ڈال دیتا)۔[1]

8۔ مؤلف موصوف نے اہل علم کے درمیان اختلاف کو کسی خاص مسئلہ میں بڑی صراحت سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً حضور پاک ﷺ کے شجرہ نسب میں سیرت نگار علماء کے مابین اختلاف کی وضاحت علامہ ان الفاظ سے کی ہے کہ عدنان کا نسب بیان کرنے والوں کے مابین اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ میدعہ کے بیٹے تھے، دار قطنی کے علاوہ کسی اور حدیث میں زند کا تذکرہ نہیں ہے اور زند بن الجون سے مراد ابو دلامہ شاعر ہے۔[2]

9۔ علامہ سہیلیؒ نے معارض احادیث سے پیدا ہونے والی مشکلات کو علم مختلف الحدیث کی مدد سے حل کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ام سلمیٰ رضی اللہ عنہ دونوں کی روایات درست ہیں کیوں کہ ان میں تاویل کی گنجائش موجود ہے۔[3]

10۔ مؤلف نے جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کے مختلف القابات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ بعض انبیاء نے آپ ﷺ کو "النبی الصالح" اور بعض نے "الاخ الصالح" کہہ کر استقبال کیا۔ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ نے "الابن الصالح" اور "النبی الصالح" کے دل نواز القابات سے آپ ﷺ کو پکارا اور مرحبا کہا جب کہ حضرت ادریسؑ نے آپ کو "الاخ الصالح" کہہ کر پکارا"[4] آنحضرت ﷺ کے القابات کے ساتھ ساتھ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے القابات کا بھی مؤلف نے ذکر کیا ہے۔ مثلاً خلافت صدیق اکبر کے دلائل بیان فرماتے ہوئے آپ کا لقب "امیر الشاکرین" بیان کرتے ہیں جب کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی وجوہات پر بھی سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔[5]

11۔ مؤلفؒ نے عربی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ مثلاً بیان کرتے ہیں کہ ابن شیث کو سریانی زبان میں "شاث" اور عبرانی زبان میں "شیث" کہتے ہیں۔ جب کہ اس کا معنی "عطیۃ اللہ" یعنی نعمت خداوندی ہے۔[6]

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف:1\24
[2] أیضاً:1\31-32
[3] أیضاً:1\50
[4] السہیلی، الروض الانف،1\36
[5] السہیلی، الروض الانف:13\294
[6] أیضاً:1\37

12۔ مولف موصوف نے ذخیرہ احادیث سے مکمل استفادہ کیا اور بہت سے مقامات پر کئی الفاظ و کلمات کی وضاحت و شرح حدیث کے متن کی مدد سے کی۔ مثلاً قحطان کے حوالے سے ان کا اسماعیلؑ کی اولاد ہونے کے استدلال کے لیے اس حدیث مبارکہ کو پیش کیا:

(ارموا یا بنی اسماعیل فان اباکم کان رامیاً)

(اے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد! تیر اندازی کرو، تمہارے والد بھی تیر انداز تھے۔)

13۔ بعض مواقع پر صحابہ کرام سے فرامین و اقوال سے بھی کلام کی توضیح فرماتے ہیں۔ بعض جگہوں پر مشکل مقامات کی وضاحت میں عربی محاورات سے بھی مدد لیتے ہیں جیسا کہ نسب نامہ انصار کے تذکرہ میں سباء اور سیل العرم کی تشریح اس عربی محاورے سے لیتے ہیں : (تفرقوا ایدی سباء و ایادی سبا) [1]

14۔ مؤلف نے اپنے دلائل کی قوت کو مزید مضبوط و مستند بنانے کے لیے حوالہ جات و اسناد کا بھرپور اہتمام فرمایا ہے مثلاً آنحضرت ﷺ کے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر مبارک پر حاضری کے واقعہ کو علامہ قرطبی کی "تذکرہ" اور ابو بکر الخطیب کی "السابق الاحق" اور ابو حفص عمر بن شاہین کی "ناسخ و منسوخ" جیسی کتب کے حوالہ جات لے کر آئے ہیں۔ علامہ موصوف نے نبوت سے قبل کے حالات و واقعات کو بڑی تحقیق و جستجو سے ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً جنگ فجار کے ضمن میں لفظ فجار پر مفصل و مدلل بحث فرماتے ہوئے اہل عرب کی مزید تین جنگوں کا بیان فرمایا ہے جو فجار کے نام سے موسوم ہیں۔[2]

مؤلف نے کلام کی توضیح کے لیے قرآن حکیم کی تفسیر سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً منافقین کا تذکرہ فرماتے ہوئے مختلف آیات کے حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی تفسیر میں معروف مفسرین امام ترمذی الکشی اور الطبری کے اقوال لے کر آتے ہیں۔[3]

15۔ الروض الانف کے مصادر میں درج ذیل شامل ہیں:

(القرآن الکریم، الاحکام السلطانیہ از الماوردی، کتاب المغازی، از ابن ابی الدنیاہ، کتاب المغازی، از ابو اسحاق الزجاج، المسند از دکیع بن الجراح، الجامع از ابن وہب، کتاب النبات از الدینوری، الامالی از ابو علی القالی، فضائل مکہ از ازین، کتاب الصحابہ از ابو عمر، المؤلف والمختلف از ابن حبیب، غریب الحدیث از ابو عبیدہ، تاریخ الامم والملوک،

---

[1] السہیلی، الروض الانف: 1\50

[2] ایضا: 1\319

[3] السہیلیؒ، الروض الانف، 2\382

المعروف تاریخ طبری از امام طبری، غریب الحدیث از قاسم بن ثابت، ای العاطش و انس الواحش از احمد بن عمار، المصنف از امام ابی داؤد، المسند از ابن ابی شیبہ، تفسیر القرآن از بقی بن مخلد، کتاب النساء از ابو عمر، کتاب البستان از علی القیروانی، المسند از البزاز، التذکرہ از امام قرطبی، السابق الاحق از ابو بکر الخطیب، الناسخ والمنسوخ از ابو حفص عمر بن شاہین، السیر از امام زہری، المعارف از ابن قتیبہ، المصنف از امام ترمذی، الکامل از المبرد، السنن از امام ترمذی، الجامع از معمر بن راشد اور کتاب الاموال از ابو عبید بن القاسم)۔

حافظ ابن قیمؒ (1292-1350) کی تصنیف زاد المعاد:

حافظ ابن قیمؒ کا پورا نام شیخ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن بکر بن ایوب سعد زرعی الدمشقی ہے۔ آپ ابن القیم الجوزیہ کے نام سے اہل علم میں معروف ہیں۔ جوزیہ ایک مدرسے کا نام تھا جو امام جوزی کا قائم کردہ تھا، اس مدرسے میں آپ کے والد محترم قیم و نگران اور ناظم الامور تھے۔ آپ بلند پایہ مفسر قرآن، علم الکلام اور علم النحو کے اپنے زمانے کے معروف مدرس و شیخ تھے۔ اور اپنے وقت کے بہت بڑے متکلم و فلسفی تھے۔

اسی طرح حدیث و فقہ میں انتہائی گہری نظر تھی اور استنباط و استخراج مسائل میں علامہ موصوف یکتائے روزگار تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ طب میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے چنانچہ علمائے طب کے مطابق علامہ موصوف نے اپنی کتاب طب نبوی میں جو فوائد طبیہ، نادر تجربات اور نسخے پیش کیے ہیں وہ طبی دنیا میں ایک انمول اضافہ ہے، جو صرف انہی کا خاصہ وہ امتیاز ہے۔[1]

علامہ موصوف کے ہم درس علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ: علامہ ابن القیم نے حدیث کی سماعت کے بعد زندگی بھر علمی مشغلہ اپنائے رکھا ان کو متعدد علوم عقلیہ و نقلیہ میں کمال حاصل تھا جبکہ خصوصا تفسیر و حدیث میں غیر معمولی مہارت و دسترس رکھتے تھے، جس کی وجہ سے قلیل عرصے میں ایک نابغۂ روزگار شخصیت بن گئے۔ وہ اپنے استاد شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کے علوم و معارف کے حقیقی جانشین اور ان کی مسند تدریس کے صحیح وارث تھے[2]۔ چنانچہ انہوں نے اپنے استاد علامہ ابن تیمیہ کے علمی کارہائے نمایاں کی ترویج و اشاعت اور توسیع میں غیر معمولی حصہ لیا۔ ان کی علمی تصنیفات کے مطالعے سے ان کی فکری گہرائی، قوت استدلال، حسن ترتیب و تدوین اور بیان کا انداز نمایاں نظر آتا ہے۔

---

[1] الآلوسیؒ، سید نعمان، جلاء العینین، مطبوعہ مصر، 1\32

[2] ابن کثیرؒ، عماد الدین ابو الفداء اسماعیل (774ھ)، البدایۃ والنہایہ، بیروت،: مکتبۃ المعارف، 1406ھ، 14\237

حافظ ابن قیمؒ الجوزیہ 491ء میں پیدا ہوئے۔ جب شعور کی عمر کو پہنچے تو شیخ تقی الدین ابن تیمیہؒ سے علمی وابستگی اختیار کر لی اور انہی سے اکثر علومِ اسلامیہ کا اکتساب کیا۔ جہاں آپ فنِ تفسیر میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے وہاں آپ اصولِ دین کے زبردست عالم وماہر تھے اور تصوف وسلوک سے بھی گہری مناسبت تھی۔ اپنے بعض عقائد کی پاداش میں قید وبند کی صعوبتوں سے بھی نبرد آزما رہے چنانچہ موصوف کعبۃ اللہ کے علاوہ روضۂ اقدس کی زیارت کے لئے بھی سفر کرنے کے عدم جواز کے قائل تھے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ حد درجہ عبادت گزار اور تہجد کے انتہائی پابند تھے۔ آپ عبادت ونماز میں اس قدر مستغرق ومنہمک ہوا کرتے تھے کہ محبتِ خداوندی میں گم ہو جایا کرتے تھے۔

ان کے شاگرد ابن رجب کے مطابق: قرآن وحدیث اور حقائقِ ایمان کا علم تو گویا انہی کے لیے تھا، وہ معصوم تو نہ تھے لیکن ان جیسی کوئی ہستی میری نگاہ سے نہیں گذری۔ کئی دفعہ ابتلاء وآزمائش کے سخت مراحل سے گزرنے کے باوجود کبھی ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ وہ آخری دفعہ اپنے استاد وشیخ، شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ کے ساتھ قلعہ میں مقید ہوئے، مگر ان کے استاد وشیخ سے ان کو علیحدہ رکھا گیا اور بعد میں شیخ الاسلام کی وفات کے بعد ان کو رہا کیا گیا۔[1]

علامہ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے متعدد دفعہ حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اور بہت عرصہ مکہ مکرمہ میں بھی قیام کیا۔ چنانچہ اہلِ مکہ ان کی کثرتِ ریاضت وعبادت اور طواف وغیرہ پر سخت حیران رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے علمی فیض کا عالم یہ تھا کہ ان کے شیخ کی زندگی میں بھی ان کو عوام الناس کی اکثریت اپنا مرجع ومقتدا سمجھتی تھی۔ جبکہ شیخ کی وفات کے بعد ان کو مزید استناد کا درجہ مل گیا اور وہ شیخ ابنِ تیمیہؒ کے حقیقی علمی جانشین اور خلف الرشید ثابت ہوئے۔ چنانچہ جہاں وہ تحریر وتالیف کے لحاظ سے بہت اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے وہاں وہ مجادلہ ومناظرہ کے اعتبار سے بھی معروف تھے۔

اپنے شیخ ابنِ تیمیہؒ (1274ء-1348ء) سے عمر میں تیس سال چھوٹے تھے اور علامہ ابنِ تیمیہؒ ان کے لیے بطورِ مربی ومشفق تھے۔ اپنے شیخ کی طرح ان کی پیدائش بھی ایسے گھرانے میں ہوئی، جو علم وعرفان کا گہوارہ اور مرکز سمجھا جاتا تھا جبکہ بعد ازاں شیخ کی علمی تربیت اور سرپرستی نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے، چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ اپنے استاد کے علم کو بڑھانے، پروان چڑھانے اور اس کی توسیع واشاعت میں انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اپنے استاد کا علمی حوالے سے خوب دفاع بھی کرتے رہے، اور ان کے اقوال کی تحقیق وتنقیح کے لیے کوشاں رہے۔

---

[1] زین الدین، عبدالرحمن بن شہاب الدین احمد (م 795ھ) الذیل علی طبقات الحنابلہ لابن رجب، (بیروت: دارالکتب العلمیہ، 1418ھ/1997ء) 3\243

سب سے زیادہ انہوں نے ابنِ تیمیہ کی فقہ کے حوالے سے بہت زیادہ توجہ اور انہماک کا مظاہرہ کیا، چنانچہ مسئلہ طلاق کے حوالے سے ابنِ قیم الجوزیہؒ نے اپنے استاد کی آراء و نقطۂ نظر کی خوب پشت پناہی کرتے ہوئے ان کے فتاویٰ جات کو بہت اہتمام سے یکجا کیا جس کا بڑا ثبوت ان کی دو بڑی کتب "اعلام الموقعین" اور "زاد المعاد" وغیرہ میں فقہِ ابنِ تیمیہ کا کثرت سے ذکر ہے۔ ان کے فتاویٰ جات کے تذکرے کے باوجود علامہ ابن القیمؒ نے حریتِ فکر و رائے کو باوجود عقیدت و احترام کے متاثر نہیں ہونے دیا۔

جب ابنِ تیمیہؒ کی مصر 712ء سے واپسی ہوئی تو ابن قیمؒ ان کے درس میں باقاعدگی سے جانے لگے۔ اس وقت تک ان میں علمی و فکری پختگی کم تھی چنانچہ شیخ کا دامن جونہی تھاما تو پھر انہی کے منہج و انداز کو اختیار کیا۔ جس کا اعتراف ان کے ہم سبق علامہ ابن کثیرؒ نے بھی کیا ہے۔[1]

علامہ موصوف کو ربِ کریم نے بہت خوبیوں سے مالامال کیا تھا، چنانچہ آپ انتہائی نرم مزاج، قوی الخلق، اور اخلاص و عمل سے متصف تھے۔ وہ سب سے محبت کرنے والے تھے، جبکہ حسد ان کے قریب تک بھی نہیں آئی تھی۔ کسی کی عیب جوئی، طعنہ زنی اور نقصان سے بہت ماوراء رہتے تھے۔ نماز بڑی طوالت والی پڑھتے تھے۔ لمبے لمبے رکوع اور سجود کرنے کے باعث بہت ہی قریبی دوست ان کو ملامت کرتے تھے لیکن آپ نے نہ کبھی ان کو جواب دیا اور نہ کبھی اپنے معمول کو چھوڑا۔[2]

علامہ ابن قیمؒ کا تصوف سے بہت گہرا تعلق تھا جس کا ثبوت ان کی اس موضوع پر مشتمل کتاب "مدارج السالکین الیٰ منازل ایاک نعبد و ایاک نستعین" ہے، اس کتاب میں میں انہوں نے علمِ حقیقت اور علمِ شریعت کے رموز و اسرار کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ اس کتاب میں سلف کا مسلک و مشرب، خلقِ قویم اور فکرِ حکیم وغیرہ تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب کو مطالعہ کرنے سے ان کے تصوف کے تعلق اور مناسبت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ کی تصنیفات کی تعداد ویسے تو ساٹھ سے زائد ہے، لیکن ان میں سے جو کتب شہرت کے مقام تک پہنچیں ان کے نام یہ ہیں: اعلام الموقعین، مدارج السالکین، زاد المعاد، حاوی الارواح، بدائع الفوائد، مفتاح دارالسعادۃ، الطرق الحکمیہ، الصراط المستقیم، زادالمسافرین، التحفۃ المکیہ، نزہۃ المشاقین، مراحل السائرین، کتاب الروح، تہذیب سنن ابوداؤد و ایضاح مشکلات۔

حافظ ابن قیمؒ کی تحریرات اپنے شیخ و استاد امام ابن تیمیہ کی طرح جارحانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ان میں نرمی

---

[1] جعفری، رئیس احمد، اردو ترجمہ زادالمعاد فی ھدی خیر العباد، (کراچی: نفیس اکیڈمی، 1990ء)، 1\41

[2] أیضاً: 1\42

اور تحمل و بردباری نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تحریر میں اپنے استاد کی مانند فکری گہرائی، قوتِ استدلال اور جوشِ بیان مکمل واضح اور نمایاں ہے۔ اسی طرح ان کی کتب و تصانیف حسنِ ترتیب، عمدہ تبویب، نظمِ افکار اور روانی عبارت پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ ان کی کتب میں اسلاف کا نور و نسبت اور اکابرین کی حکمت موجود ہے۔ اسی لیے وہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے زیادہ استدلال کرتے ہیں، جبکہ بعض مقامات پر اپنے استادو شیخ کی آراءواقوال کو بھی نقل کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ جملہ فیض اور علمی تسلسل ان کے استاد شیخ ابنِ تیمیہؒ ہی کا ہے۔

زادالمعاد کا کلامی اسلوب و منہج:

ادبیاتِ سیرت میں اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو علامہ ابن قیمؒ کی یہ کتاب "زاد المعاد" ادبیاتِ سیرت کی چند منتخب روزگار اور مایہ ناز کتب میں سے ایک ہے۔ ابن قیم بہت بڑے درجے کے فقیہہ تھے، جس کا اندازہ ان کی کتاب "اعلام الموقعین" سے کیا جاسکتا ہے، جہاں ان کے غیر معمولی تفقہ کا اظہار موجود ہے۔ اس طرح ان کی تصوف اور روحانیات کے ساتھ وابستگی اور تعلق کو ان کی معروف کتاب "مدارج السالکین" سے سمجھا جاسکتا ہے، لیکن "زاد المعاد" ان کی ایسی کتاب ہے جس میں ان کی غیر معمولی بصیرت اور اسلامی فہم کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ اور روحانیت سے گہری اور پختہ مناسبت ان کی اس کتاب کے ہر ہر صفحے سے نمایاں ہے۔ مصنف نے فقہ کے تمام ابواب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ذخیرۂ احادیث اور سیرتِ طیبہ سے ہدی خیر العباد مرتب کی ہے۔

1۔ یہ کتاب اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ پہلے سیرت کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس کے بعد اس سے متعلقہ احادیث کو بیان کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے بعد آخر میں "فصل فی فقہ ہذا الباب" (یعنی اس باب کے اصل فہم و ادراک کے بیان میں) کا عنوان قائم کرکے اس باب کی جملہ حکمتیں، بصائر اور عبرتیں ذکر کردیتے ہیں۔ اس طرح اس مسئلہ کے دقیق و باریک پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور یوں ایک ایک کرکے علامہ ابن قیمؒ ان مسائل کو تفصیلاً ذکر کرتے ہیں۔

2۔ اس کتاب کے اندر جہاد و مغازی کے حوالے سے بھی تفصیلی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یوں تو پوری کتاب ہی بہت عمدہ ہے لیکن مغازی کے حوالے سے انہوں نے خصوصی انداز اپنایا ہے جو کہ انہی کا خاصہ ہے۔ چنانچہ مغازی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلموں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے حوالے سے بھی ہدایات بیان کی ہیں اور یوں یہ کتاب مغازی کے ساتھ ساتھ علم سیر یعنی بین الاقوامی قوانین کے حوالے سے بھی ایک اہم کتاب ہے۔ اسی طرح انہوں نے ان تمام موضوعات کے ساتھ ساتھ سیرتِ طیبہ کے ایک نئے اور انوکھے موضوع "کلامیاتِ سیرت" کے حوالے سے بھی اس کتاب میں انتہائی پر مغز گفتگو کی ہے۔

3۔ مسئلہ معراج، شقِ صدر اور دیگر معجزاتِ نبوی کے حوالے سے بہت مضبوط کلام کرکے تمام عقلی شبہات کو رد کرکے عقلی دلائل سے ان تمام موضوعات کے اثبات کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کے علاوہ علامہ موصوف نے بعض عبادات کے پہلوؤں پر روحانی حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً روزہ کے روحانی پہلوؤں پر تفصیلاً اور نفیس کلام کیا ہے۔

یہ ساری چیزیں روحانیاتِ سیرت سے تعلق رکھتی ہیں چونکہ آپ ﷺ دراصل مزکی و مربی تھے لہٰذا آپ ﷺ کا تمام افواج کی قیادت کرنا، حکومتی سربراہی، سفراء کا مختلف ممالک میں بھیجنا اور مختلف حکام و گورنرز کی تقرری یہ سب آپ ﷺ کے اصل مقاصد کے حصول کے سلسلے کے اہم ذرائع تھے۔ چنانچہ یہ نبوت کا مقصد ہرگز نہ تھا کہ حکومت بنائی جائے لیکن اسلام کی ضرورت ضرور تھا چونکہ اقتدار اسلامی ضروریات کی تکمیل کا سبب ہے اس لیے حضورِ اکرم ﷺ کی دی گئی تربیت، اخلاق اور کردار سازی ہی اصل شئ ہے بایں وجہ علامہ ابن قیم نے اپنی اس کتاب زاد المعاد میں سیرتِ طیبہ کی روشنی میں تزکیۂ نفس اور اخلاق و کردار کی تعمیر سازی پر مضبوط اور مفصل بحث کی ہے۔

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دیگر بزرگوں نے اس حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ علامہ ابن قیمؒ کے ہاں بھی کثرت سے موجود ہے۔ بایں وجہ اس کتاب کو روحانیات سیرت کے حوالے سے بھی ایک مستند و مفصل کتاب کہا جاتا ہے۔[1]

4۔ علامہ ابن قیمؒ نے یہ کتاب ان لوگوں کے لیے زیادہ لکھی ہے کہ جو سیرت طیبہ کا تاریخی و تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں تفسیر و حدیث کے ساتھ ساتھ راویانِ حدیث پر جرح بھی کی ہے۔ اور مسائلِ فقہیہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مکی و مدنی زندگی کے حالات و واقعات اور تاریخی حوالہ جات کا تفصیلاً ذکر موجود ہے۔

علامہ ابنِ قیمؒ اپنے گرامی قدر استاد شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی اکثر باتوں کی تائید کرتے ہیں، چنانچہ بعض مختلف فیہ علمی مسائل کا ذکر کرنے کے بعد کہیں ایسا بھی کرتے ہیں کہ امام ابنِ تیمیہؒ کا قول و مسلک بیان کرکے اسے حرفِ آخر اور قولِ فیصل قرار دے کر موضوع کا اختتام اور بحث کو انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔ اپنے استاد سے کسی ہونہار شاگرد کا ایسا والہانہ اندازِ محبت و عقیدت دلچسپ اور مشعلِ راہ ہے اگرچہ تحقیقی اصولوں کے مطابق یہ بات درست نہیں ہے۔

5۔ امام ابن تیمیہؒ کا مسلک و مشرب بہت سے مسائل میں جمہور علماء کرام اور ائمہ مجتہدین سے الگ ہے، جبکہ اس طرح کے مقامات پر حافظ ابن قیمؒ نے اپنے استاد کے مسلک کو اپنایا ہے۔ لیکن اس مسلک کو اپنانے کے حوالے سے فکری اسباب و عوامل کا تذکرہ نہیں کرتے۔ علامہ موصوف علیہ الرحمۃ کا اندازِ تحریر انتہائی سادہ، عام فہم اور دلکش ہے مگر بعض مقامات پر

---

[1] غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضراتِ سیرت، ص250

صرفی ونحوی ابحاث اور معانی وبیان اور بلاغت کے دقیق مباحث ومسائل سے عام قاری کا استفادہ مشکل نظر آتا ہے۔

6۔ علامہ ابن قیمؒ چونکہ معقولات و منقولات کے امام تھے، اس وجہ سے وہ اپنے مدعا اور مؤقف کو دلائل و براہین کے سہارے سے زورِ قوت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے دلائل وزن اور قوت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ بھی ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والوں کے لیے وہ سخت الفاظ کا چناؤ اور استعمال بھی کرتے ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں بحث و مناظرہ میں متحارب فریقین ایک دوسرے کے ساتھ مصلحت و حکمت سے پیش آنے کے روادار نہیں تھے، یہ چیز ان کی جلالتِ علمی اور محققانہ عظمت کے خلاف ہے۔ اسی طرح متبع سنت اور بدعت کے مخالف ہونے کی بناء پر سنت سے مطابق چیزوں کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور جو چیز خلافِ سنت نظر آئے اس کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتے ہیں اور اس حوالے سے کسی حکمت و مصلحت اور رعایت سے کام نہیں لیتے۔[1]

7۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ سے ان کی محبت اس کتاب سے بطورِ خاص نظر آتی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل کس قدر حبِ رسول ﷺ سے سرشار تھا۔ لیکن وہ حبِ رسول ﷺ کو عقیدۂ توحید سے کسی صورت بھی متصادم نہیں ہونے دیتے۔ اسی وجہ سے ان کے عقیدۂ توحید میں سختی اور استقامت کے باعث ان کے مخالفین نے ان دونوں استاد و شاگرد کو ہدفِ تنقید بنایا اور اس کے علاوہ ان کو قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے پڑے لیکن ان کے پایۂ استقلال میں کوئی لغزش و جنبش تک دکھائی نہیں دی۔ اس عقیدۂ توحید کی پختگی ان کی کتاب سے بخوبی عیاں ہوتی ہے۔

8۔ اسی طرح اپنی اس کتاب میں وہ جہاں اپنے مؤقف کو قرآن و حدیث اور جملہ عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں وہاں وہ اپنے ہم پلہ مخالفین کے نقطۂ نظر کو بھی بغیر کسی بخل اور تعصب سے کام لیے بغیر ان کے افکار و خیالات، دلائل و معتقدات اور اسلوبِ فکر کو ذکر کرتے ہیں۔ اور کہیں بھی انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جس کا فائدہ یہ ہے کہ عام قاری جہاں ان کی علمی شان کا قائل ہوتا نظر آتا ہے وہاں اس کے سامنے مخالف کا نقطۂ نظر بھی پوری طرح تفصیل و وضاحت کے ساتھ آجاتا ہے۔ جس کی روشنی میں کوئی قاری تحقیق کے اصولوں کے مطابق کوئی دوسری رائے بھی اپنی فہم و بصیرت کی بنیاد پر قائم کر سکتا ہے۔

9۔ چنانچہ مناظرانہ و مجادلانہ انداز کے مطابق مناظر کا مقصد محض مخالف کو خاموش کرنا ہوتا ہے اور کسی بھی قیمت پر حریف کو لاجواب کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کے دلائل کو غلط ثابت کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ایک محقق کا یہ انداز نہیں ہوتا بلکہ محقق میں اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے ساتھ دوسرے کی بات سننے کی سکت و طاقت رکھتا ہے۔ اور وہ اپنی فکر و

---

[1] الصفدی، صلاح الدین خلیل، الوافی بالوفیات، 2\198-197

بصیرت کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا بلکہ دوسروں کو بھی ان کا جائز استحقاق دیتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے اپنی اس کتاب زاد المعاد فی ھدی خیر العباد میں تمام امور کا التزام و اہتمام کیا ہے۔

10۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کتاب کے موضوعات پر اگر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ کتاب درج ذیل موضوعات و عنوانات پر مشتمل ہے:

1۔ السیرۃ النبویہ

2۔ الھدی النبوی فی العبادات

3۔ الطب النبوی ﷺ

4۔ القضیۃ النبی ﷺ

5۔ الفضائل و الآداب

11۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے بعض جگہوں پر خصائص النبی ﷺ کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کتاب میں خصائص نبوی کے حوالے سے کلام و ابحاث کو نہیں لایا گیا، بایں وجہ بعض مصنفین کی رائے کے مطابق مصنف نے یہ کتاب سفر کی حالت میں تصنیف کی ہے۔[1] بہر کیف اپنے منفرد اسلوب اور مختلف الانواع مباحث کے حوالے سے اس کتاب کو کتبِ سیرت میں اگر سیرتِ طیبہ کے انسائیکلوپیڈیا کا نام دیا جائے تو مبالغہ نہیں ہو گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر اس کتاب میں بحث نہ ہو۔

12۔ کتاب میں مضامینِ سیرت اور مباحث متفرق انداز میں بکھرے ہوئے ہیں اور دیگر کتبِ سیرت کے برعکس زمانی ترتیب سے ایک ہی مقام پر بیان نہیں کیے گیے۔ جیسے حضور اکرم ﷺ کے نام مبارک، نسب نامہ مبارک، پیدائش اور بہت سے دوسرے واقعات سیرت میں کافی فاصلہ ہے۔ چنانچہ پہلا موضوع کتاب کا حصہ اول جبکہ دوسرا موضوع کتاب کے حصہ سوم میں ہے۔

13۔ اسی طرح غزوات کی بحث ذکر کرنے سے قبل ہی نتائج غزوات کو نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح غنائم حاصل کرنے کی بات ان غزوات سے قبل لکھی گئی ہے، جن میں ان غنائم کا حصول ہوا تھا۔ اسی طرح رؤسا اور امراء کو خطوط و مکاتیب لکھنے کی بات کتاب کے پہلے حصے میں جبکہ ان کا متن تیسرے جزء کے اخیر میں ہے۔ یوں اسی طرح ایک عام قاری پر سیرتِ طیبہ کا نقشہ مکمل طور پر واضح نہیں ہوتا۔

14۔ علامہ ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

---

[1] الندوی، ابو الحسن علی، (1420ھ)، تاریخ دعوت و عزیمت، (کراچی،: مجلس نشریاتِ اسلام)2\365

اس کتاب کا قابلِ تنقید پہلو یہ ہے کہ اس میں سیرت، حدیث، فقہ، تاریخ، کلام، نحو و صرف اور جملہ علوم اسلامیہ مخلوط طور پر شامل ہیں۔[1] اسی وجہ سے اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شیخ صالح احمد الشامی نے زاد المعاد فی ھدی خیر العباد سے سیرت النبی ﷺ کو "سیرۃ خیر العباد" کے نام سے الگ کرکے ترتیب دیا ہے۔ جسے باقاعدہ المکتب الاسلامی بیروت نے 1441ھ /2000 میں شائع کیا اور یوں کتاب میں سیرت کے حوالے سے جملہ مباحث کو روایتی ترتیب کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے، جو کہ زاد المعاد میں مفقود نظر آتی تھی۔

15۔ الھدی النبوی، الطب النبوی، اقضیۃ النبی ﷺ اور فضائل و آداب سے ہٹ کر بالخصوص واقعاتی انداز سیرت پر نگاہ ڈالی جائے تو علامہ ابن قیم نے واقعات سیرت سے سینکڑوں کی تعداد میں مسائل کا استنباط و استخراج کیا ہے اور ایسے ایسے علمی نکات اخذ کیے ہیں کہ جو ان کی بیک وقت تمام علوم اور بالخصوص حدیث، سیرت اور فقہ میں یکساں مہارت کی دلیل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیرتِ طیبہ کی مقصدیت اور پیغام کو اپنی اصل صورت میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

خاص مباحث سیرت میں سے غزوات و سرایا اور آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں آنے والے وفود کے تذکرے سے علامہ ابن قیم نے انتہائی عمدہ اور کثیر تعداد میں مسائل فقہیہ، دروس و عبر اور حکمتوں کو اخذ کیا ہے اور ان میں فقہاء کرام کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے بھی خوب اہتمام سے بیان کرتے ہیں۔ غزوات میں بدر و حنین سمیت جملہ غزوات میں اخذ و استنباط کا اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ اذنِ قتال، مشروعیتِ جہاد، فضیلت و احکامِ جہاد، غنائم، قیدی، عقد الذمہ، جزیہ اور عقود الصلح جیسے مباحث و عنوانات بھی غزوات سے قبل ہی زیرِ بحث لائے ہیں۔

---

[1] ابن القیم، ابی عبد اللہ محمد بن ابی بکر (751ھ)، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، تحقیق شعیب الارنؤوط دمشق: مؤسسۃ الرسالہ ناشرون، 1431ھ)، ص313

باب دوم:
سیرت کے اہم کلامی مباحث کی کلاسیکی اور عصری معنویت

فصل اول: کتب سیرت میں کلاسیکی اور جدید کلامی مباحث

فصل دوم: قرآن اور سیرت سے متعلق مستشرقین کے اشکالات

فصل اول: کتب سیرت میں کلاسیکی اور جدید کلامی مباحث

تیسری صدی ہجری کی ابتدا سے اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور ایک طویل عرصے تک یہ موضوعات سیرت کا ایک اہم حصہ رہے بلکہ ابھی تک ان مباحث کو سیرت کا ایک اہم باب سمجھتے ہوئے تقریباً اکثر نامور سیرت نگاروں نے اس سے متعلقہ اہم مسائل پر گفتگو اور بحث کی ہے۔

اس کے بعد نبوت ورسالت کی حقیقت، نبی ورسول میں فرق، نبی اور رسول کس کو کہا جاتا ہے ان کے ذرائع علم، ذرائع علم کی اقسام، وحی اور الہام میں فرق، وحی کا ماخذ علم، پھر حضورؐ کی ختم نبوت، ختم نبوت کی حکمت وفلسفہ، آنحضرتؐ کی امتیازی خصائص وفضائل اور وہ امتیازی اوصاف جو آپؐ کو انبیاء دیگر سے ممتاز کرتے ہیں وہ کیا ہیں؟ ان تمام سوالات کے حوالے سے بہت سی کتب لکھی گئی ہیں چنانچہ جب امتیازی خصوصیات واوصاف پر بحث کا آغاز ہوا تو معجزہ زیر بحث آیا اور پھر معجزات کی حقیقت اور انبیاءؑ اور آنحضرتؐ کے معجزات میں اگر کوئی باہمی جوہری فرق ہے تو وہ کیا ہے؟

آنحضرتؐ کے ویسے تو بہت سے **معجزات** ہیں مگر ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ کہ جس کو آپؐ نے اپنی نبوت کے اثبات میں بطور معجزہ ودلیل پیش فرمایا اور پھر خود قرآن حکیم میں آنحضرتؐ کے متعدد معجزات کا ذکر ہے جس میں سب سے بڑا معجزہ **اسراء معراج** ہے اسراء معراج کے حوالے سے مسلم وغیر مسلم اہل علم کے مابین طویل عرصہ سے غور وخوض اور بحث کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ معراج کے روحانی، کلامی، فقہی اور ادبی سمیت ہر ہر پہلو کے حوالے سے اکابرین اسلام نے بہت کچھ تحریر کیا جس میں برصغیر کے اہل علم کا ایک وقیع وغیر معمولی حصہ بھی شامل ہے جبکہ واقعہ معراج سے متاثر ہو کر بہت سے غیر مسلم مفکرین ومصنفین نے بھی کثرت سے کتب مرتب کیں۔

منتخب کتب میں کلامی ابحاث کا اسلوب

سیرت نگاروں میں سے بعض کے ہاں صرف تاریخی واقعات ملحوظ خاطر تھے مثلاً ابن ہشام۔ لہٰذا انہوں نے کلامی مضامین کا ذکر اشارتاً کیا جب کہ ان کے شارحین نے صراحتاً ان تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ علامہ ابوالقاسم السہیلی (1114-1185ء) نے اپنی کتاب الروض الانف میں جو کہ سیرت ابن ہشام کی معروف شرح ہے کلامی مسائل کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔

علامہ سہیلی نے **روح اور نفس** کی بحث میں یہ واضح کیا ہے کہ روح اور نفس سے کیا مراد ہے اسراء ومعراج

کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی ہے[1] اور محکمات و متشابہات کا سیرت سے تعلق واضح کیا ہے۔ ابن ہشام کا انداز سیرت میں مورخانہ زیادہ ہے[2] اور ان کو تاریخی واقعات اور تفصیلات سے ہٹ کر دیگر موضوعات سے لگاؤ نہیں تھا مگر ان کے شارح نے ان کلامی مسائل کا بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ ہے ان کا تعلق سیرت سے لازم و ضروری ہے۔[3]

اسی لیے قاضی عیاض کی کتاب "الشفاء فی تعریف حقوق المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" کا اکثر حصے سے زائد کلامیات سیرت پر مشتمل ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب میں جناب رسول اللہؐ کی حفاظت کے حوالے سے قرآنی وعدے کے حوالے سے وضاحت وکلام سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے کہ اس وعدے سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ جواباً وہ لکھتے ہیں کہ[4] اس وعدے سے مراد حفاظت کی چار اقسام ہیں جن میں اول جسمانی حفاظت تھی کہ آپؐ کا دشمن آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے دوم عقلی ضمانت و حفاظت کہ آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب قرآن حکیم مکمل و درست طریقے سے انسانوں تک پہنچ سکے اور آپؐ کی سنت بھی بغیر کسی تبدیلی و مداخلت کے لوگوں تک پہنچ جائے۔

سوم یہ کہ **روحانی تحفظ** کہ آنحضرت ﷺ کا جو رتبہ و مقام ہے اس کا تحفظ کیا جا سکے، اس کو بیان کیا جا سکے اور اس کی تمام تر تفصیلات کو محفوظ انداز میں امت تک پہنچایا جا سکے جبکہ چہارم آنحضرت ﷺ کی قلبی عصمت و تحفظ۔ قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے ان چاروں میں سے ہر ایک کو تفصیلاً ذکر کے بسط و شرح سے مکمل بحث و گفتگو کی ہے۔[5]

علامہ ابن قیمؒ (1292-1350ء) نے اپنی کتاب زاد المعاد میں ان میں سے بعض مسائل پر مفصل انداز سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی کتاب ادبیات سیرت کے حوالے سے امتیاز و انفرادیت پر مبنی تصنیف ہے۔

ابن قیم نے سیرت کے بعض ایسے پہلوؤں اور جہات کے حوالے سے بحث کی ہے کہ جو بقیہ سیرت نگاروں نے بیان نہیں کیے جن میں فقہیات سیرت، **روحانیات سیرت**، قانونیات سیرت اور سیرت کی عملی رہنمائی شامل

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 2\76-75

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، 1/133-114

[3] السہیلیؒ، الروض الانف، 2\382

[4] قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی ، 1/433

[5] ایضاً، 1/434 -435

ہیں۔[1]

لیکن اس کے علاوہ انہوں نے کلامی مباحث سے متعلق بہت سے گوشوں پر بھی کلام کیا ہے بلکہ بعض خصوصی مسائل جو سیرت نگاروں کے نزدیک زیر بحث رہے ہیں ابن قیم نے اس حوالے سے بھی روشنی ڈالی ہے۔

موضوعات کلام میں سے ایک اہم مسئلہ آنحضرت ﷺ کے معجزات اور خصوصاً معجزہ کبیرہ معراج و اسراء کی کیفیت و نوعیت کا بھی ہے اور خصوصاً سفر معراج روحانی تھا یا جسمانی۔ واقعہ معراج کے حوالے سے متقدمین اور صحابہ کرامؓ کے دور سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ معراج کی نوعیت کیا تھی اس حوالے سے بعض لوگوں کا خیالیہ ہے کہ معراج کی حقیقت بس ایک خواب کی سی ہے جس میں آپؐ نے بہت سے مناظر کا مشاہدہ فرمایا اور یہ خواب بھی عام لوگوں کی طرح کا ایک خواب تھا جو آنحضرتؐ نے دیکھا تھا اور آپؐ کو بہت سے مناظر دکھلائے گئے۔

اہل علم کے یہ بات کہنے کی وجہ یہ تھی کہ سیدہ عائشہؓ سے ایک روایت ہے کہ آپؐ جب معراج پر تشریف لے گئے تو (مافقده جسمه) کہ آپؐ کا جسم اطہر مبارک یہاں موجود رہا اور مفقود نہیں رہا ۔ اس کی بعض لوگوں نے خواب سے تعبیر بیان کی مگر اہل علم کی اکثریت دور صحابہ سے لے کر آج تک اس بات کی قائل ہے کہ واقعہ معراج کوئی خواب نہیں تھا کیونکہ معراج و اسراء آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک واضح و نمایاں معجزہ کا نام ہے اور اگر اس کو خواب مان لیا جائے تو صرف خواب کو کوئی معجزہ یا علامت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

خواب میں تو کوئی بھی شخص کہیں بھی سفر کر کے جاسکتا ہے اور قرآن حکیم کا اپنا انداز:

﴿سُبۡحَٰنَ ٱلَّذِيٓ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ لَيۡلٗا مِّنَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ إِلَى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡأَقۡصَا ٱلَّذِي بَٰرَكۡنَا حَوۡلَهُۥ لِنُرِيَهُۥ مِنۡ ءَايَٰتِنَآۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ﴾[2]

(پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصی لے گئی جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے)

چنانچہ یہ محض خواب ہی تصور کیا جائے تو پھر تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے جب کہ قرآن حکیم کا تذکرہ یہاں غیر معمولی طور پر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے تبھی محدثین و مفسرین صراحتاً

---

[1] ابن قیم، زادالمعاد، 2/42 -43

[2] بنی اسرائیل:1

لکھتے ہیں کہ یہ محض خواب نہیں تھا۔سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول کا جہاں تک تعلق ہے تو اس حوالے سے علامہ ابن قیم نے بہت تفصیلی بحث کی ہے اور نفسیات، روحانیات اور عقلیات و منطق سے دلائل دے کر اس بات کو یہاں ثابت کیا ہے کہ معراج جسمانی تھی۔[1]

انبیاء علیہم السلام کے حوالے سے یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اس دار فانی سے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کا جسمانی تعلق روح کے ساتھ قائم رہتا ہے اور اسی طرح کا تعلق آپ ﷺ کے جسم مبارک سے آپ کی روح مبارک کا تھا یہاں معراج میں بھی آپ کی روح مبارک کو لے جایا گیا اور یہ تمام مشاہدات کروائے گئے اس کا خواب یا نیند سے کوئی تعلق نہیں ہے چناچہ یہ روحانی تجربہ صرف انبیاء کے ساتھ خاص ہے۔[2]

یہاں حافظ ابن قیمؒ نے ان تمام احادیث کو بھی جمع کیا ہے جو اسراء و معراج کے جسمانی ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کی تطبیق والی روایات و احادیث بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ:

(ولكن ينبغي ان يعلم الفرق بين ان يقال كان الاسراٰء مناماً و بين ان يقال كان بروحه دون جسد و بينهمافرق عظيم)[3]

(یعنی یہ بات مناسب ہے کہ یاد رکھا جائے اور ان دونوں کے مابین فرق کیا جائے کہ اسراء ایک خواب تھا اور یہ کہا جائے کہ اسراء روح مبارک کے ساتھ تھی اور جسم کے ساتھ نہیں تھی ان دونوں کے مابین بڑا فرق ہے۔)

اس مقام پر حافظ ابن قیمؒ مفصل و مدلل بحث کرتے ہیں اور یہ باور کرواتے ہیں کے انبیاء علیہم السلام کے جسم مبارک کا ان کی ارواح مبارک کے ساتھ کس نوعیت کا تعلق ہے اور انہوں نے نفسیاتی، روحانی، کلامی اور مذہبی فلسفہ سے ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے۔[4]

اسی طرح نبی کا ذریعہ علم وحی ہے اور **وحی الٰہی کی حقیقت** اور رتبہ و مقام کے حوالے سے قرآن حکیم میں واضح ارشادات موجود ہیں علم وحی کی عظمت پر قرآن پاک میں اور سابقہ مذہبی کتب میں رہنمائی ملتی ہے وحی کے دو معروف مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ خاموشی اور جلدی سے کسی کو ایسا اشارہ کرنا کہ جس سے وہ مطلوبہ پیغام سمجھ جائے اس اشارہ کو وحی کہتے ہیں کیوں کہ انبیاء کرام تک علم کا انتقال اتنا لطیف ہوتا ہے کہ انسان اس تک رسائی نہیں حاصل کر

---

[1] ابن قیم، زاد المعاد، 2/49 -50

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، 1/399

[3] ابن القیم، حافظ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد: 3/36

[4] ایضاً، 3/ 37 -38

سکتے اور اتنا جلدی ہوتا ہے کہ محض انبیاء ہی اس کا حصول کر سکتے ہیں اسی وجہ سے اس ذریعہ علم کے لئے وحی کو بطور اصطلاح لایا گیا۔

تیسری صدی ہجری کی ابتدا سے اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور ایک طویل عرصے تک یہ موضوعات سیرت کا ایک اہم حصہ رہے بلکہ ابھی تک ان مباحث کو سیرت کا ایک اہم باب سمجھتے ہوئے تقریباً اکثر نامور سیرت نگاروں نے ان سے متعلق اہم مسائل پر گفتگو اور بحث کی ہے۔

اس کے بعد **نبوت ورسالت کی حقیقت**، نبی ورسول میں فرق، نبی اور رسول کس کو کہا جاتا ہے ان کے ذرائع علم، ذرائع علم کی اقسام، وحی اور الہام میں فرق، وحی کا ماخذ علم، پھر حضورؐ کی ختم نبوت، ختم نبوت کی حکمت وفلسفہ، آنحضرتؐ کی امتیازی خصائص وفضائل اور وہ امتیازی اوصاف جو آپؐ کو انبیاء دیگر سے ممتاز کرتے ہیں وہ کیا ہیں؟ ان تمام سوالات کے حوالے سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں چنانچہ جب امتیازی خصوصیات واوصاف پر بحث کا آغاز ہوا تو معجزہ زیر بحث آیا اور پھر معجزات کی حقیقت اور انبیاءؑ اور آنحضرتؐ کے معجزات میں اگر کوئی باہمی جوہری فرق ہے تو وہ کیا ہے؟

آنحضرتؐ کے ویسے تو بہت سے معجزات ہیں مگر ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے[1] جس کو آپؐ نے اپنی نبوت کے اثبات میں بطور معجزہ ودلیل پیش فرمایا اور پھر خود قرآن حکیم میں آنحضرتؐ کے متعدد معجزات کا ذکر ہے جس میں سب سے بڑا معجزہ اسراء معراج ہے اسراء معراج کے حوالے سے مسلم وغیر مسلم اہل علم کے مابین طویل عرصہ سے غور وخوض اور بحث کا سلسلہ جاری ہے۔

چنانچہ معراج کے روحانی، کلامی، فقہی اور ادبی سمیت ہر ہر پہلو کے حوالے سے اکابرین اسلام نے بہت کچھ تحریر کیا جس میں برصغیر کے اہل علم کا ایک وقیع وغیر معمولی حصہ بھی شامل ہے جبکہ واقعہ معراج سے متاثر ہو کر بہت سے غیر مسلم مفکرین ومصنفین نے بھی کثرت سے کتب مرتب کیں۔

سیرت نگاروں میں سے بعض کے ہاں صرف تاریخی واقعات ملحوظ خاطر تھے مثلاً ابن ہشامؒ کہ جنہوں نے اشارتاً اور ان کے شارحین نے صراحتاً ان تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ علامہ ابوالقاسم سہیلیؒ نے اپنی کتاب الروض الانف جو کہ سیرت ابن ہشام کی معروف ومستند شرح ہے کلامی مسائل کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔ روح اور نفس کی بحث میں اس کو واضح کیا ہے روح اور نفس سے کیا مراد ہے اسراء ومعراج کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی ہے[2] اور

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1/114- 115

[2] ایضاً، 1/115

محکمات و متشابہات کا سیرت سے تعلق واضح کیا ہے۔

یہ ایک الگ موضوع ہے کہ علامہ سہیلیؒ نے ابن ہشامؒ کی شرح لکھی ہے اور ابن ہشامؒ کا انداز سیرت میں مورخانہ زیادہ ہے اور ان کے انداز سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تاریخی واقعات اور تفصیلات سے ہٹ کر دیگر موضوعات سے لگاؤ نہیں تھا مگر ان کے شارح نے ان کلامی مسائل کا بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ ہے ان کا تعلق سیرت سے لازم و ضروری ہے۔ جن سیرت نگاروں نے ان موضوعات پر مستقلاً اپنی کتب میں کلام کیا ہے ان میں سے ایک قاضی عیاضؒ ہے کہ جنکی کتاب "الشفاء فی تعریف حقوق المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" کا اکثر حصے سے زائد کلامیات سیرت پر ہے۔

موصوف نے اپنی اس کتاب میں جناب رسول اللہؐ کی حفاظت کے حوالے سے قرآنی وعدے کے حوالے سے وضاحت و کلام سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے کہ اس عہد سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ جواباً وہ لکھتے ہیں کہ اس وعدے سے مراد حفاظت کی چار اقسام ہیں جن میں اول جسمانی حفاظت تھی کہ آپؐ کا دشمن آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے دوم عقلی ضمانت و حفاظت کہ آپؐ پر نازل شدہ آخری کتاب قرآن حکیم مکمل و درست طریقے سے انسانوں تک پہنچ سکے اور آپؐ کی سنت بھی بغیر کسی تبدیلی و مداخلت کے لوگوں تک پہنچ جائے سوم یہ کہ روحانی تحفظ کہ آنحضرتؐ کا جو رتبہ و مقام ہے اس کا تحفظ کیا جا سکے، اس کو بیان کیا جا سکے اور اس کی تمام تر تفصیلات کو محفوظ انداز میں امت تک پہنچایا جا سکے جبکہ چہارم آنحضرت ﷺ کی قلبی عصمت و تحفظ۔

اسی طرح نبوت اور اس کے متعلقہ مضامین پر ابتداء سے ہی بحث اور غور و خوض چل رہا ہے بعض حضرات نے مسئلہ نبوت پر مکمل عقلی انداز سے تدبر و تفکر کیا اور عقلیات و فلسفہ کے میدان میں ایک جدید جہت اور انداز کا تعارف کروایا۔ چنانچہ ابو نصر فارابی (Pharbaius) جن کا پورا نام محمد بن ترخان ابو نصر تھا اور یہ ترکستان کے مقام فاراب میں 872ء میں پیداء ہوئے اور 950ء میں دمشق میں فوت ہوئے۔ فارابی نے پہلی مرتبہ یہ کوشش کی کہ یونانی فلسفہ اور عقائد کا بیان یوں کیا جائے کہ ان کا **اسلامی عقائد و تصورات** پر ان کی تحریر کردہ کتب میں نبوت،، مقام نبوت اور منصب نبوت پر فلسفیانہ اور عقلی انداز سے بحث ملتی ہے۔

اسی طرح نبوت اور تصورِ نبوت کے حوالے سے ایک اور پہلو بھی سیرت نگاروں کے ہاں زیرِ بحث ہے کہ سابقہ انبیاء کا سلسلۂ نبوت آنحضرتؐ کی آمد کی تمہید و مقدمہ ہے۔ چنانچہ مختلف اقوام کو حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل دینی و فکری اور ذہنی و روحانی لحاظ سے ان کی تربیت کر کے تیار کرنے کا مقصد آنحضرتؐ کی نبوت کے لیے چوکس و تیار کرنا تھا بایں وجہ تمام قدیم و نامور سیرت نگاروں نے سیرت کی اپنی تصنیف کردہ کتب کا آغاز سابقہ انبیاء اور نبوت کے ذکر سے کیا ہے۔

آنحضرتؐ کے خصائص و فضائل پر جب متصوفین نے غور و فکر شروع کیا تو روحانیات سیرت اور اس سے متعلقہ موضوع پر وقیع مباحث کا ایک وسیع ذخیرہ مرتب کیا گیا اسی ضمن میں انہوں نے حقیقت محمدی اور نور محمدی کی ماہیت و حقیقت پر روشنی ڈالی پھر مختلف انبیاء کرام کی نسبتیں متعین کیں اور ان نسبتوں کا آنحضرت ﷺ سے واسطہ اور ربط بیان کرتے ہوئے سیر حاصل بحث کی۔ ان فاضل محققین میں برصغیر پاک و ہند کا بھی بڑا حصہ رہا ہے جس میں مجدد الف ثانی جن کا اصل نام شیخ احمد سرہندی تھا کے مکتوبات میں روحانی تجربات کے پس منظر میں آنحضرت کی اخلاقی برتری کو انتہائی بلیغ اور خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

دلائلِ نبوت پر لکھنے والے حضرات میں سے سب سے قدیم و مستند کتاب علامہ ابو نعیم اصفہانیؒ (948-1038ء) نے لکھی ہے۔ پہلے دلائلِ نبوت کے نام سے انہوں نے ضخیم کتاب لکھی تھی، جس میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں ذکر شدہ بشارات، فضائل اور قرآنی تاثیر وغیرہ کا تذکرہ موجود تھا۔ بعد میں خود ہی انہوں نے اپنی کتاب میں دو جلدوں میں خلاصہ لکھا اور اس میں خصائص سیرت، آنحضرت ﷺ کے ارشادات و احکامات سابقہ آسمانی کتابوں کی روشنی میں اور آپ ﷺ کے فضائل جو قرآن حکیم میں موجود ہیں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی اصل کتاب تو اس وقت موجود نہیں ہے البتہ اس کی تلخیص موجود ہے، جو ان کی اپنی تیار کردہ ہے۔

کتاب میں 35 ابواب اور فصلیں موجود ہیں اور ابتداء میں بہت زبردست مقدمہ ہے جس میں انسانی نفسیات اور انسانوں میں پائی جانے والی اخلاقی و روحانی خوبیوں اور کمزوریوں کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد نبوت کی نفسیاتی اور روحانی تعبیر کرتے ہوئے ابو نعیم اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ نبی ان چاروں سے فضائل کے ہر اعتبار سے مزین اور چاروں کمزوریوں سے مبراء ہوتا ہے۔ اس کتاب کے اہم مباحث میں فضائلِ قرآن، حضور ﷺ کا انسانیت کا سردار ہونا، کتبِ سابقہ میں آپ ﷺ کے تذکرے، اخلاق کریمہ، صفاتِ نبوی، وحی نبوت، تاثیر قرآن اور آپ ﷺ کے معجزات شامل ہیں۔

شواہد نبوت پر، افغانستان کے ایک عالم مولانا نورالدین جامیؒ (1414-1492ء) کی تصنیف بھی ہے جو کہ عربی زبان کے نامور ادیب، مفسرِ قرآن، محدث اور ماہر علم کلام تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب شواہد النبوت میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں پائی جانے والی جملہ صفات کا احاطہ کیا ہے۔ چنانچہ شواہد نبوت کو انہوں نے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن میں شواہد نبوت قبل ولادت، شواہد نبوت وقتِ ولادت، شواہد نبوت از بعثت تا ہجرت، شواہد نبوت از ہجرت تا وصال، شواہد نبوت بعد از وصال، شواہد نبوت بدستِ صحابہ کرام اور شواہد نبوت بدستِ تابعین، تبع تابعین اور صوفیائے کرام شامل ہیں۔

مؤلف کی یہ کتاب ادبی لحاظ سے بھی ایک شاہکار کتاب ہے، جس سے ان کی ادبی و شاعرانہ صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے معجزات اور ان کی تفصیلات بھی اس کتاب میں ذکر کی ہیں۔

سیرتِ طیبہ کے کلامی مباحث کے حوالے سے، متقدمین کی طرف سے، آخری اور جامع ترین کتاب **خصائص کبریٰ** ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے معجزات کے حوالے سے معلومات موجود ہیں۔ یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (1445-1505ء) کی تصنیف کردہ ہے۔ علامہ سیوطی بڑے عالم و فاضل تھے اور ان کی کتب علمی و تحقیقی معیار کے لحاظ سے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں لیکن آنحضرتؐ کی ذاتِ مبارک سے آپ کی محبت و عقیدت اور فرطِ جذبات سے بسا اوقات جیسے عام مسلم دامنِ تحقیق کو ترک کر دیتا ہے۔ علامہ موصوف نے بھی اپنی کتاب میں بعض ایسی روایات ذکر کی ہیں کہ جو تحقیقی معیار سے ہٹ کر علمِ حدیث، روایت و درایت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں۔

جدید تصانیف میں کلامی مباحث کے مناہج:

ماضی قریب کے ہر قابلِ ذکر سیرت نگار نے سلسلہ نبوت کو سیرت کا مقدمہ و تمہید ہی قرار دیا ہے جو کہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سلسلۂ نبوت، منصبِ نبوت اور اس کے بلند رتبہ حاملین سیرت النبی کا مقدمہ و تمہید تھے، جس کو سمجھے بغیر سیرت طیبہ کو سمجھنے کی کوشش کرنا نبوت کے رتبہ و مقام کی تفہیم میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ تبھی دلائلِ نبوت اور کلامیاتِ سیرت علمِ سیرت کا ایک اہم جزو قرار پائے۔

سیرت طیبہؐ کے کلامی مباحث کے حوالے سے برصغیر میں کئی شخصیات نے انتہائی وقیع کام کیا جن میں انتہائی اعلیٰ علمی کام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے ان کی منجملہ کتب میں سے نمایاں و معروف ترین کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے جو کہ تقریباً مکمل ہی کلامیات سیرت کے عنوان پر ہے اس کتاب میں انہوں نے آنحضرت ﷺ کی سیرت اور سنت کے وہ معارف و حقائق اور اہم ترین گوشے بیان کئے ہیں جو عموماً لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہیں یہ حقائق و معارف جن کو وہ اسرار حدیث کہتے ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے دو حصے کیے ہیں پہلا حصہ جو بنیادی کلیات اور اصولوں سے متعلق ہے اس میں وہ تمام بنیادی مسائل دینی اور شرعی دلائل کے ساتھ ایک عقلی اور منطقی انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ جن کی بنیاد پر رسول خاتم النبیینؐ نے منصب نبوت کا آغاز فرمایا اور اسی اساس پر آپؐ نے شریعت کی تفصیلات بیان فرمائیں اس حصے میں انسان کو رب کائنات کی طرف سے مکلف بنانے کی وجوہات و اسباب اور جزا و سزا کے نظام وغیرہ اور نوعیتوں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔

حصہ دوم میں شاہ ولی اللہؒ **اسرار نبوت و شریعت** کو بیان کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر زیادہ تر آنحضرت ﷺ کے معجزات کو واضح انداز میں سامنے لایا ہے کہ جس میں آپؐ کی لائی ہوئی شریعت اور اس کا اصل کارنامہ لوگوں کے سامنے آجائے اسی وجہ سے وہ شریعت اسلامیہ کے کمال متشککین کی تردید اور اہل ایمان کے اطمینان و

سکون کے لیے ان موضوعات پر بحث کرتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور اہمیت وضرورت کے حوالے سے شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ انسان کو اصلی اور حقیقی کامیابی کیلئے ایسے مصلحین اور رہنماؤں کی ضرورت ہے جو ملتیں قائم کر سکیں اور ان کی بنیاد پر امت تشکیل دی جا سکے اور وہ ایسا دائمی اور دیرپا نظام امت کو فراہم کر سکیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے انبیاء کی تعلیمات میں مختلف اوقات میں جو تاریخی ارتقاء ہوا اس کی جانب بھی اشارہ کیا ہے اور آخر میں خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جب انسانیت ایسے موقع تک پہنچ گئی کہ جب ایک بین الاقوامیت اور عالمگیریت کی ابتدا ہونے والی تھی تو تب ایسے دین کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو سابقہ تمام ادیان کے لئے ناسخ ہو اور جو شریعت پہلی تمام شریعتوں کو مکمل کرنے والی اور عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کی تکمیل کا باعث ہوں اور حقِ ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾[1] (تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے) کی کیفیت پیدا کی جائے یہ ختم نبوت کا وہ تصور ہے جو شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں دیا ہے۔[2]

رسالت و نبوت کی حقیقت کے عنوان پر حضرت مجدد الف ثانیؒ (شیخ احمد سرہندی) نے برصغیر میں جو تحریر کیا ہے وہ امت مسلمہ کی فکری اور کلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے چناچہ انہوں نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ نبوت اور معارف نبوت پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ جس میں ان تمام عقلی اور غیر منطقی الجھنوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں مکتوبات کے علاوہ مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے اثبات نبوت پر بھی باقاعدہ رسالہ تصنیف کیا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ نبوت انسانی درجات میں سے سب سے افضل و اعلیٰ ترین درجہ ہے اور ولایت سے بلند اعلیٰ و افضل ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953ء) نے بھی اپنی کتاب **سیرت النبی میں معجزات** کے باب میں علامہ سیوطیؒ کی کمزور روایات کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ سیوطی کی یہ کتاب بہت سی کتب کا مرجع و ماخذ رہی ہے اور اردو و فارسی زبان میں لکھے گئے میلاد ناموں میں بہت ساری تفصیلات یہاں سے لی گئی ہیں۔ معجزات اور شواہد نبوت پر لکھی گئی کتب میں مختلف اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے جن میں ایک اصطلاح "بینہ" ہے جس کا معنی واضح دلیل اور نشانی۔ قرآن حکیم میں بھی اسی مفہوم میں بینات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ﴾[3] (تاکید ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا۔)

---

[1] التوبہ:33

[2] دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور 2010ء، 1\72-74

[3] الحدید:25

آیت کا لفظ بھی موجود ہے جس کا معنیٰ نشانی ہے اسی طرح معجزہ کا لفظ قرآن حکیم میں براہ راست اگرچہ نہیں مگر بالواسطہ استعمال ہوا ہے لیکن ادب اسلامی میں عمومی طور پر معجزہ کا لفظ زیادہ مشہور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معجزہ کا لفظ بطورِ خاص اس مفہوم کے لیے قرآن وحدیث میں استعمال نہیں ہوا۔

آنحضرت ﷺ کے معجزات کو جن جن حضرات نے جمع کیا ہے ان کے مطابق آپ ؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے جو کہ نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور آپؐ نے جب بھی نبوت کی تائید اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش فرمایا تو قرآن مجید ہی کو پیش فرمایا۔ اور جب کہیں سے کسی چیلنج کا کہا گیا تو جواباً بطورِ چیلنج بھی آپ ﷺ نے قرآن کو پیش فرمایا۔ چنانچہ اس پر کفار مکہ کا ایک اعتراض یہ تھا کہ:

﴿وَقَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾[1]

(کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں کی گئیں) تو جواباً آپؐ نے قرآنی آیت پیش فرمائی کہ:

﴿اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ﴾[2]

(کیا ان کے لیے بطورِ نشانی یہ کافی نہیں کہ قرآن کی آیات ان کے لیے تلاوت کی جارہی ہیں)

یعنی آیاتِ قرآنی اور قرآن حکیم کو آنحضرتؐ نے اپنی نبوت کے ثبوت اور معجزہ کے طور پر پیش فرمایا۔ اس پر ساڑھے چودہ سو سال سے زائد عرصہ سے علماء لکھتے اور بیان کرتے چلے آرہے ہیں اور اعجازِ قرآنی کے جدید پہلوؤں کو بھی سامنے لاتے جارہے ہیں جو کہ علوم القرآن کی کتب اور مباحث میں موجود ہیں۔

اس کے بعد دوسرے نمبر پر معجزات میں نمایاں ترین معجزہ اسراء کا ہے۔ قرآن حکیم نے خود سورۃ بنی اسرائیل کی ابتداء میں جس زور بیان اور عالیشان انداز میں اسراء و معراج کا تذکرہ کیا ہے اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کسی غیر معمولی واقعے کا تذکرہ ہے اور اس کا مقصد ہے:

﴿لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ﴾

(تاکہ ہم اپنی بڑی بڑی نشانیاں ان کو دکھائیں)

گویا اسراء میں بڑی بڑی نشانیاں دکھلانا اور راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جانا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی خواب یا منام کی کیفیت نہیں بلکہ ایسی غیر معمولی چیز ہے جو دوسرے انسانوں کو پیش نہیں آئی۔ اور اگر

---

[1] العنکبوت:50

[2] ایضاً:51

یہ محض خواب ہوتا تو کفار مکہ کی طرف سے اس کی تردید کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ خواب تو کوئی شخص بھی دیکھ سکتا ہے اور کسی کے خواب کی کوئی بھی تردید نہیں کرتا کہ اس نے فلاں چیز کو دیکھا اور فلاں کو نہیں دیکھا۔

دیگر معجزات احادیث کی اکثر کتب میں مذکور ہیں جن میں بڑی تعداد میں بخاری و مسلم، ترمذی اور سنن نسائی میں بیان کیے گئے ہیں، معجزات کو مستند حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ان معجزات کی تعداد اور تفصیلات پر سیرت نگاروں نے تفصیلی کام کیا ہے۔ اور آپ ﷺ کے معجزات کی تعداد کا اندازہ چند سو سے لے کر تقریباً تین ہزار تک کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ کی کلامی مبحث یہ ہے کہ کہ معجزہ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اگر تو معجزہ کا مقصد نبوت کی تائید اور ثبوت کا حصول اور معجزہ دیکھنے والوں کو نبوت کی صداقت پر یقین کروانا ہو تو یہ مقصد تو بہت کم پورا ہوا ہے۔ بہت سے تاریخی واقعات ایسے ملتے ہیں کہ معجزہ دیکھنے کے باوجود بھی لوگ ایمان نہیں لائے۔ جبکہ اس کے برخلاف بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو معجزہ دیکھنے کے سوا ہی ایمان لے آئے۔ جیسا کہ سیدنا ابو بکر صدیق اور خدیجہ الکبریٰ۔

اسی طرح بہت سے کبار صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی کوئی ثبوت یا معجزہ کی طلب نہیں کی مگر جو لوگ معجزات کے طلب کرنے والے تھے اور ان کو معجزات دکھائے بھی گیے تھے ان میں سے شاذ و نادر لوگ ہی اسلام کے قبول کرنے والے تھے جیسا کہ ابو لہب، ابو جہل، عبد اللہ بن ابی اور رؤساء قریش و یہود وغیرہ۔

اس سوال کے جواب میں متکلمین علماء نے تین نوعیت کے انسانوں کا ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ انسانوں کی ایک قسم تو وہ ہے کہ جو ہر نبی کے ساتھیوں میں سے سابقون الاولون میں شامل تھے اور ان کے نزدیک نبی کی شخصیت و کردار ہی اصل معجزہ تھی۔ ان میں نبی کے اعلیٰ مقام اور رتبے کا اندازہ کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور وہ اس بنیاد پر شخصیت و کردار کے تناظر میں یہ فیصلہ کر لیتے تھے کہ یہ شخص غلط بیانی نہیں کر سکتا اور اس کا دعویٰ حق اور صداقت پر مبنی ہے۔ لہٰذا نبی کی زبان سے پیغام نبوت کو سنتے ساتھ ہی فوراً دعوت قبول لر لیتے ہیں۔

چنانچہ ایسے لوگوں کے حوالے سے ہی متکلمین سیرت نگاروں کا کہنا یہ ہے کہ اصلاً نبوت کا ادراک کرنے کا واحد اور اصلی و حقیقی راستہ ذوقِ سلیم یعنی فطرتِ سلیم ہے۔ متکلمین کے ہاں دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اندر سے بغض و نفرت اور دشمنی کا رویہ رکھتے ہیں اور ہزارہا معجزات کے دیکھنے کے باوجود بھی وہ نبوت اور اس کی حقانیت کو نہیں مانتے اور کسی ذاتی مفاد، تعصب و کینہ یا دشمنی کے باعث معجزہ کا ہونا نہ ہونا ان کے لیے عبث ہوتا ہے۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو لوگ متامل و متردد اور متشکک ہوتے ہیں اور معجزہ دیکھنے کے بعد ان کے قلوب و عیون پر پڑے پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ نبی کی نبوت اور اس کی حقانیت پر دل سے ایمان لے آتے ہیں۔ یا بعض لوگ جو دل سے ایمان لا چکے ہوتے ہیں مگر کسی وجہ سے ایک حد میں رہتے ہیں اور قریب نہیں آتے۔ معجزہ دیکھنے کے باعث ان کا ایمان مضبوط و راسخ ہو جاتا ہے اور وہ گمراہی اور شک و شبہے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ معجزہ کے اصل مخاطب یہی

تیسرے طبقے کے لوگ ہیں جو معجزہ سے اپنے ایمان کی کمزوری کا علاج اور مداوا کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ اپنی شخصیت و کردار کو پیغمبرانہ دلیل کے طور پر زیادہ پیش کیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِ ﴾[1]

(تاکید میں نبی ایک طویل عمر تک تمہارے درمیان رہا ہوں)

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ معجزہ من جانب اللہ ہوتا ہے اور نبی کی جانب سے نہیں ہوتا۔ پیغمبر جب چاہے جہاں چاہے معجزہ کی تخلیق و اظہار کر دے، ایسا ممکن نہیں ہے بلکہ اللہ رب العزت اس کی ذات پر ظاہر فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے معجزے کا خالق پیغمبر نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اور پیغمبر اس کا مظہر، وسیلہ اور ذریعہ ہوتا ہے۔

حسی معجزات جو ظاہری طور پر دیکھے جاسکتے تھے سیرت نگاروں نے ان کی تعداد کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں ان جیسی معجزات کی تعداد ایک ہزار، امام بیہقیؒ نے بھی ایک ہزار، امام نووی نے تقریباً بارہ سو جبکہ بعض کے ہاں یہ تعداد تین ہزار اور بعض کے ہاں ساڑھے تین ہزار تک ہے۔ یہ ایسے واقعات و معجزات ہیں جو کتبِ سیرت میں موجود ہیں۔

کلامیات سیرت کے سلسلہ کی ایک کڑی آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے کثیر تعداد میں پیشن گوئیاں بھی فرمائی گئیں جن میں قرآن حکیم کی سورۃ روم کی پیشن گوئی ایک الگ مقام رکھتی ہے مگر آنحضرت ﷺ نے روم و فارس کی فتح و کامیابی کی بھی پیشن گوئی فرمائی۔ جس زمانے میں آپ ﷺ نے یہ پیشن گوئی فرمائی وہ ایسا زمانہ تھا کہ مسلمان اس وقت مدینہ طیبہ کے اندر بھی محفوظ نہیں تھے۔ آپ ﷺ کی یہ پیشن گوئی بھی من و عن پوری ہوئی اور 1453ھ میں سلطان محمد فاتح کے ہاتھ پر استنبول فتح ہوا چنانچہ آپ ﷺ نے اسی روایت کے آخر میں فرمایا تھا کہ:

{ولنعم الامير اميرها و نعم الجيش ذلك الجيش}[2]

(کہ وہ سردار کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا اور وہ لشکر کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا)

کلامیات سیرت سے متعلقہ ایک اور پہلو جو مختلف سیرت نگاروں اور بالخصوص علامہ شبلی نعمانی نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ زمانہ قدیم میں سیرت نبوی کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کے طور پر ہی زیادہ تر سمجھی اور محسوس کی جاتی تھی، جبکہ علم الکلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر آج بہت سے مسائل جو تاریخ سے متعلق ہیں لیکن ان کا تعلق علم الکلام سے بھی جڑا ہوا ہے کیونکہ لوگوں نے اس کے بارے میں تشکیک اور تامل کا اظہار کیا ہے تو اس پر بحث و مباحثہ ہونے لگا اور

---

[1] یونس:16

[2] النیسابوري، ابو عبد للہ، محمد بن عبد اللہ، المستدرک، مطبوعہ شبیر برادر لاھور، 2017ء، رقم الحدیث:8300

یوں وہ تاریخی مسئلے سے کلامی مسئلہ بن گیا۔

من جملہ مباحث میں سے یک مسئلہ جو دراصل کلامی نہیں تھا لیکن بہت زیادہ زیرِ بحث ہونے کے باعث اب کلامی مسئلہ بن گیا ہے وہ ابو طالب آنحضرت ﷺ کے چچا کے قبولیتِ اسلام کا مسئلہ ہے۔ یہ محض تاریخی مسئلہ ہے اور اللہ اور بندے کے مابین کا مسئلہ ہے، بہر حال بحث و مباحثہ کے باعث یہ مسئلہ حساس قرار پایا اور اس پر لمبی لمبی بحثیں اور گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح ہاشم اور عبد مناف کے حوالے سے یہ بحث جاری رہی کہ ان کی حیثیت اور درجہ کیا تھا۔ اسی طرح حضور اقدس ﷺ کے والدین کا معاملہ بھی اہلِ علم کے مابین زیرِ بحث رہا۔

اسی طرح بعض ایسے مسائل بھی ہیں کہ جو ویسے تو فقہی مسئلے کا درجہ رکھتے تھے لیکن دوسرے پہلو سے وہ کلامی مسئلہ قرار پاگئے اور ان کو مغربی مستشرقین بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ اہلِ سیرت ان اعتراضات کا جواب یہی دیتے آئے ہیں کہ یہ آنحضرت ﷺ کے **تخصصات اور خصائص نبوت** میں سے ہے اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص اجازت عطا فرمائی تھی۔ مگر یہ توجیہہ مسلمان اور اہلِ ایمان کے لیے تو قابلِ قبول ہے لیکن غیر مسلم اس کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔ بعض سیرت نگاروں کی رائے یہ ہے کہ چار کی تحدید والی آیات سن 7ھ کے لگ بھگ نازل ہوئیں اور آنحضرت ﷺ کا آخری نکاح بھی اسی سال ہوا تھا۔

اسی طرح ان مباحث میں سے ایک اہم موضوع **بشائر الانبیاء** بھی ہے کہ جس میں انبیاء سابق علیہم السلام نے آنحضرتؐ کی تشریف آوری اور بعثت کے حوالے سے بشارات ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ مختلف آسمانی کتب میں اس موضوع کے حوالے سے اشارات موجود ہیں ان اشارات کو اہلِ علم نے اپنے اپنے انداز میں الگ کتب میں مرتب و جمع کیا ہے اور بہت سے نامور سیرت نگار اس حوالے سے اپنی کتب میں مواد جمع کر چکے ہیں۔

یہ وہ چند موضوعات ہیں کہ جن کا تعلق کلام اور سیرتِ طیبہ کے ساتھ ہے۔ ان موضوعات کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ہر دو موضوعات یعنی سیرتِ طیبہ اور علم کلام کا مطالعہ ضروری و لازمی ہے۔

خلاصہ بحث:

سیرت طیبہ کے حوالے سے باقاعدہ طور پر کلامی مباحث کی ابتدا کا کام تیسری صدی ہجری سے شروع ہوا یوں ایک لمبے عرصے تک ان موضوعات کا سیرت سے تعلق رہا چنانچہ اسی وجہ سے بہت سے نامور سیرت نگاروں نے کلامی مباحث و مسائل کو اپنی کتب کا حصہ بنایا ہے وقت کے ساتھ ساتھ ان موضوعات پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری و ساری رہا اور یوں ان کلامی موضوعات میں مزید جدت پیدا ہوتی رہی۔ ان کلاسیکی اور جدید کلامی مباحث میں نبوت و رسالت کی حقیقت، نبی اور رسول میں فرق، ذرائع علم اور ان کی اقسام، وحی و الہام، ختم نبوت اور اس کی حکمت و

فلسفہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازی خصائص و فضائل، تعدد ازواج، معجزات، واقعہ اسراء و معراج، دلائل و اسرار نبوت اور بشائر الانبیاء وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔

فصل دوم: قرآن اور سیرت سے متعلق مستشرقین کے کلامی اشکالات

فصل دوم: قرآن اور سیرت سے متعلق مستشرقین کے کلامی اشکالات

جدید مغرب میں احیائے علوم اور نشأۃ ثانیہ (Enlightment and Renaissance) کی تحریک جب چلی تو اس کے نتائج میں جدید علوم کی تدوین کو عمل میں لایا گیا یورپی اسکالرز کی ایک جماعت نے جدید سائنسی علوم و فنون سے ہٹ کر اسلامی علوم و مشرقی فنون کو اپنی نت نئی تحقیقات کا محور بنا کر اس میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں چنانچہ ان جدید تحقیقات سے گزشتہ دو صدیوں میں انگریزی جرمن اور فرانسیسی سمیت بعض مزید معروف و مشہور مغربی و یورپی زبانوں میں اسلام کا ایسا ماڈرن ورژن تدوین کے بعد ہمارے سامنے پہنچا ہے جو کہ اسلام کی یورپین تعبیر قرار دیا گیا۔

اہل مغرب اور اہل یورپ کی تحقیقات سے اسلامی دنیا کو فائدہ پہنچا اور اسلامی مخطوطات کی صورت میں ایک وقیع علمی ذخیرہ جو مختلف لائبریریوں سے باہر لا کر اہل علم تک پہنچایا گیا وہاں اس سے ملنے والے ایسے نقصانات بھی کہیں زیادہ ہیں جو کہ ناقابل تلافی ہیں چنانچہ یہودی و عیسائی اسکالرز اور مغربی پروفیسرز کی ایک جماعت نے اسلام، قرآن کریم، نبی آخر الزمان اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم دینیہ و اسلامیہ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی ایک تحریک برپا کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف ایک نظریاتی و فکری جنگ کی شروعات کیں۔

اہل مغرب کی اس تنقید کے جواب میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے دین اسلام کا دفاع کیا اور مستشرقین کی اس منفی تنقید کے جواب میں باقاعدہ کتابیں، مقالات، رسائل اور تحقیقی مضامین و مواد مرتب کر کے شائع کئے۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند میں مستشرقین اور استشراق کے حوالے سے ہونے والے معروف و نمایاں علمی کام میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں 1982ء میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات جو کہ بعد میں **"اسلام اور مستشرقین"** کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے جو کہ سات جلدوں پر مشتمل ہیں اور اس کتاب میں سیمینار کے مقالات کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی علمی تحریرات کو بھی اکٹھا کیا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ بعض عربی کتب کا اردو ترجمہ بھی ہوا جن میں علامہ نجیب العقیقی کی کتاب **"الاستشراق والمستشرقون: مالھم وما علیھم"** کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم نے **"استشراق اور مستشرقین: ایک تاریخی و تنقیدی مطالعہ"** کے موضوع سے کیا۔ اسی طرح ایک اور عربی کتاب **"مناھج المستشرقین في الدراسات العربیۃ الاسلامیۃ"** جس کا اردو ترجمہ ثناء اللہ ندوی نے **"علوم اسلامیہ اور مستشرقین: منہاجیاتی تجزیہ اور تنقید"** کے عنوان سے کیا گیا۔

چنانچہ مذکورہ کتب اور ان کے علاوہ دیگر جدید کتب کے مطالعے سے قرآن و حدیث اور دیگر اسلامی موضوعات پر متعدد شبہات اور غلط تعبیرات جو اہل مغرب و یورپ کا وطیرہ رہی ہیں انھوں نے نت نئے کلامی مباحث کو جنم دیا جس کے جواب میں مذکورہ دو کتب اور ان کے ساتھ ساتھ اسلامی موضوعات قرآنیات، علوم حدیث، سیرت و تاریخ اور فقہ و قانون اسلامی کے اوپر لکھی گئی دیگر کتب میں مسلمان اہل علم کی جانب سے ان تمام اعتراضات کے بھرپور علمی و مسکت جوابات دیکر باقاعدہ دلائل سے علوم اسلامیہ کا دفاع کیا گیا۔ چنانچہ ان جدید کلامی مباحث میں سے چند موضوعات کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا محاکمہ:

سب سے پہلے قرآن کریم کے حوالے سے مغربی احیائے علوم اور نشأۃ ثانیہ نے جن جدید ابحاث کو جنم دیا ان میں سے ایک دعوی ان مغربی مصنفین اور بالخصوص مستشرقین کا یہ ہے کہ قرآن کریم وحی خداوندی یا آسمانی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ کتاب دور جاہلیت کے عربی مذاہب عیسائیت، یہودیت، صابیت، حنیفیت اور دین زرتشت کے افکار و اعمال کا ملغوبہ ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کے مصادر کے حوالے سے مستشرقین اختلاف کا شکار ہیں اور یہ وہی کیفیت ہے کہ جس میں بعینہ مشرکین مکہ مبتلا تھے، مستشرقین کی بھی ایک جماعت نے اشعار جاہلیت کو قرآن کریم کا مصدر قرار دیا ہے ٹزڈال ولیم کلیر (William Clair Tisdal: 1859-1928) اس حوالے سے کہتا ہے کہ آنحضرتؐ نے امیہ بن ابی صلت اور امرؤالقیس کے اشعار سے استفادہ کر کے قرآن کریم کو وضع کیا۔[1]

ٹزڈال ولیم کلیر (William St. Clair Tisdall) نے اپنے دعوے کے اثبات میں چند اشعار نقل کیے ہیں جو کہ امیہ کے اشعار ہیں اور ان میں قرآنی اسلوب کلام سے مشابہت ہے۔ اسکے جواب میں مسلمان محققین کا کہنا ہے: کہ اس بات کی کوئی تاریخی دلیل نہیں ہے کہ یہ اشعار امیہ اور امرؤالقیس کے ہیں بلکہ ان کے متعلق غالب گمان یہی ہے کہ بنو عباس کے دور کے کسی شاعر نے یہ اشعار لکھے ہیں کہ جس نے اپنی شاعری میں قرآنی اسلوب کے ٹانکے لگائے ہیں۔

محمد بن عبد المنعم خفاجی کی رائے میں جہاں تک امیہ کی بات ہے تو وہ اپنے اشعار میں قرآنی اسالیب و تراکیب سے استفادہ کرتا ہے اور وہ اپنے اشعار سے بسا اوقات آخرت، جہنم، جنت اور سابقہ امتوں کے واقعات بیان کرتا ہے۔

[1] John Burton, *The Collection of the Quran*, Cambridge University Press1979, p: 47-48

اس کے اشعار میں کثیر تعداد میں بعض قصے تورات وانجیل کے بیان سے مکمل مشابہہ ہیں کیونکہ اس نے قرآن کی طرح تورات وانجیل سے بھی استفادہ کیا ہے۔[1]

چنانچہ مستشرقین مکہ جنھوں نے آپؐ کو شاعر کاہن اور مجنون جیسے القابات سے پکارا ان سے کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی امیہ کے اشعار سے مشابہت کو نظر انداز کر دیا ہو۔ عقبہ بن ربیعہ جب رؤساء قریش کا مطالبہ لیکر آپؐ کے پاس آیا اور آپؐ نے اسکو قرآن کریم کا کچھ حصہ سنایا تو اس نے واپس آکر اپنی مجلس میں یہی کہا کہ میں ایک ایسا کلام سن کر آیا ہوں جو نہ تو شعر ہے اور نہ ہی کہانت ہے۔[2]

بعض مستشرقین نے زمانہ جاہلیت کے بعض حنفاء کو بھی قرآن کریم کا ایک مصدر قرار دیا ہے ان کے بقول ان حنفاء کے افکار اور قرآنی مضامین میں کافی حد تک تشابہ موجود ہے جیسے وحدانیت کی دعوت دینا، بت پرستی سے انکار، وعدو وعید اللہ تعالی کو رحمان، رب اور غفور جیسے صفاتی ناموں سے پکارنا، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کرنا اور موت کے بعد کی بعثت وحشر کا اقرار کرنا۔

آسٹرین مستشرق ایلائے سپرنگا(Springer: 1813-1893) کا موقف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کل فکر زید بن عمرو بن نفیل سے مأخوذ ہے۔

حنفاء دراصل دور جاہلیت کے وہ لوگ تھے جو بت پرستی سے بیزار تھے اور وحدانیت کی جانب ان کا جھکاؤ تھا مگر اس قسم کے رجحان والے ایسے لوگ کسی ایک رائے اور نظریہ پر قطعاً متفق نہ تھے بلکہ ان میں باہم اختلاف پایا جاتا تھا۔ ان حنفاء میں سے بعض ایسے بھی تھے جو نبی کے آنے کی خبر دے رہے تھے مگر حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے جیسا کہ امیہ بن ابی صلت ہیں۔

جہاں تک زید ابن عمرو ابن نفیل کی بات ہے تو ان کے حوالے سے حضرت اسماء بنت ابو بکر صدیقؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ان کو کعبہ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے دیکھا اور وہ کہہ رہے تھے کہ اے قریش کی جماعت! میں نے آج دین ابراہیمی پر صبح کی ہے۔ اے اللہ! اگر مجھے علم ہوتا کہ میں کیسے تیری عبادت کروں جو تجھ کو پسند آجائے تو میں لازمی کرتا مگر مجھے یہ معلوم نہیں ہے اور پھر وہ اپنی سواری پر بیٹھنے کی حالت میں ہی سجدہ ریز ہوا کرتے تھے۔ بیت اللہ کی تعظیم اور سجدے کی کثرت ہی ان کی عبادت ہوا کرتی تھی۔ مردار سے پرہیز کیا کرتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ

---

[1] عمر بن ابراہیم رضوان، الدکتور، آراء المستشرقین حول القرآن الکریم وتفسیرہ، دار طیبۃ، الریاض، 1992، 1\263-256

[2] ابن کثیر، اسماعیل بن عمرو، البدایۃ والنھایۃ، دار الفکر، بیروت، 1986، 3\63

در گور کرنے سے روکا کرتے تھے۔[1]

ان میں سے بعض نے یہودیت اور عیسائیت کو اختیار کر لیا۔ جیسا کہ ورقہ ابن نوفل، عثمان ابن حویرث وغیرہ ان میں سے بعض نے زمانہ اسلام کو پایا اور دولت اسلام سے بہرہ مند ہوئے۔ جیسا کہ زید ابن عمرو ابن نفیل، ابی قیس ابن سلت اور عبید اللہ بن جحش وغیرہ حضرات۔ پھر جو عیسائی ہو گئے تو جو آپ کا لایا ہوا دین ہے اس کی مخالفت کر رہا ہے وہ کیسے اسلام اور قرآن کریم کے مصادر بن سکتے ہیں۔ اور جو حضرات اسلام کو قبول کر چکے تو ان کا قبولیت اسلام ہی اس امر کی ایک دلیل ہے کہ وہ اسلام کے مآخذ نہیں بلکہ خود اسلام اور قرآن ان کے لیے ایک مصدر ثابت ہوا۔

یہ الگ بات ہے کہ بعض حنفاء سے رسول اللہ کی لقاء ثابت ہے مگر یہ حسن اتفاق ہی تھا اور اس کو مبالغہ آمیزی کر کے آنحضرت کو باقاعدہ ان کا شاگرد بنانا جہاں خلاف حقیقت ہے وہاں انتہائی غلط ہے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل سے دو مرتبہ آپ کی ملاقات تاریخی روایات سے ثابت ہے۔ ایک مرتبہ ابتدائی وحی کے نزول کے وقت جب خدیجہ الکبری آپ کو ان کی خدمت میں لیکر گئیں جبکہ دوسری مرتبہ راستے میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی جس میں انھوں نے پیغمبر اسلام کے سر مبارک کا بوسہ لیا اور کہا آپ آخری امت کے نبی ہیں اور ساتھ اپنی خواہش پیش کی کہ کاش اس وقت تک میں زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپ کو مکہ سے نکال دے گی اور میں تب آپ کی مدد کر سکوں۔[2]

مستشرقین میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم تورات وانجیل سے ماخوذ ہے۔ جرمن مستشرق ابراہام گائیگا (Abraham Geiger: 1810-1874) کے ہاں قرآن کریم انجیل سے متاثر ہے۔ اسکے یہ خیالات اسکی تحریر (Washat Mohammed aus judentume aufgenommen) میں موجود ہیں۔ اسی طرح، فلپ کے ہٹی (Philip Khuri Hitti: 1886-1978) نے اپنی کتاب، Islam and the West: A Historical Cultural Survey میں قرآن کریم کے مصادر میں یہودیت، عیسائیت اور عرب مشرکین کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔[3]

اسکے جواب میں ان مستشرقین سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ عیسائیت تو مکہ مکرمہ اور اسکے قرب وجوار

---

[1] ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، 2\237

[2] عمر بن ابراہیم رضوان، الدکتور، آراء المستشرقین حول القرآن الکریم وتفسیرہ، دار طیبۃ، الریاض، 1992، 1\267-266

[3] Philip K, Hitti, *Islam and the West: A Historical Cultural Survey*, New York: Robert E. Krieger Publishing Company, 1979, p:15

میں نہیں موجود تھی تو حضور اکرم نے عیسائیوں کے عقائد کو کہاں سے معلوم کیا؟ لہذا جب عیسائی موجود ہی نہیں تھے تو انجیل کہاں سے ہو گئی؟ رچرڈ بیل (Richard Bell:1876-1952) کے بقول کہ بعض تاریخی روایات ایسی ضرور موجود ہیں کہ بیت اللہ کی دیوار پر حضرت عیسیٰ کی تصویر موجود تھی مگر اس بات کے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں کہ مکہ مکرمہ اور اسکے آس پاس عیسائی موجود تھے۔[1]

اسکے جواب میں (Hamilton Alexander Rosskeen Gibb: 1895-1971) کہتے ہیں کہ مکہ سے تجارتی قافلے یمن کی جانب جایا کرتے تھے اور دونوں شہروں میں باہمی تجارتی تعلق بھی تھا اور انہی وفود اور قافلوں کے سبب عیسائی تعلیمات و افکار مکہ پہنچے اور انہیں پیغمبر اسلام نے اپنی کتاب قرآن کریم میں شامل کیا چنانچہ قرآنی ذخیرہ الفاظ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ یمن کے عیسائی افکار تجارتی قافلوں کے راستے مکہ پہنچے تھے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن بہت سی جگہوں پر اناجیل (Gospels) کی مخالفت کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم تثلیث (Trinity) سیدنا عیسی کے ابن اللہ (Son of God) ہونے اور ان کو صلیب دیے جانے کی تردید کرتا ہے لہذا اگر قرآن فقط ان اناجیل کا صرف ناقل ہوتا تو ان سے کوئی اختلاف نہ کرتا۔[3]

چنانچہ تاریخی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ آنحضرت کے زمانے میں بھی انجیل کا عربی ترجمہ موجود تھا۔ مشرکین نے بھی حضور پر یہی اعتراض ظاہر کیا تھا کہ کوئی عیسائی استاد آپ کو تعلیم دیتا ہے مگر جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معلم قرار دیا جاتا تھا اسکی زبان غیر عربی (عجمی) تھی اور قرآن فصیح عربی زبان میں ہے۔ جیسا کہ باری تعالٰی کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ﴾[4]

(اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکین کہتے ہیں کہ آپ کو اس قرآن کی تعلیم ایک شخص دیتا ہے اور جس کی طرف یہ نسبت کرتے ہیں اسکی زبان تو عجمی ہے حالانکہ یہ قرآن کریم فصیح عربی زبان میں ہے)

علاوہ ازیں قرآن کریم کے جو مصادر بیان کیے جاتے ہیں جیسا کہ تورات و انجیل تو ان کے پرانے نسخے عبرانی اور

---

[1] Richard Bell. *The origin of Islam in its Christian Environment*. London: Frank Cass and Company Limited, 1968, p. 42

[2] Gibb, *Mohammadanism: A Historical Survey*, Oxford University Press, 196, p: 37

[3] عبد الحکیم فرحات، الدکتور، اشکالیۃ تأثر القرآن الکریم بالأناجیل في الفکر الاستشراقي الحدیث، الطبعۃ الألکترونیۃ، ص،2

[4] النحل:103

یونانی زبان میں تھے اور یہ دونوں زبانیں اہل عرب کے لیے اجنبی زبانیں تھیں۔ بائبل کا قدیم ترین عربی ترجمہ بھی حضور اکرمؐ کے وصال کے تقریباً دو سو سال بعد یعنی نویں صدی عیسوی میں ہوا۔ بعض مستشرقین اور مغربی مفکرین نے قرآنی نص پر مزید عجیب اعتراضات بھی کیے ہیں چنانچہ انھوں نے یہ کہا کہ آنحضرت نے اپنی دعوت میں کاہنوں کا اسلوب اختیار کیا ہے۔

درست بات یہ ہے کہ آپؐ نے کاہنوں کے اسلوب کلام کی مذمت کی ہے ۔[1]اور قرآن کریم میں بھی ارشاد ربانی ہے:

﴿فَذَكِّرْ فَما أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكاهِنٍ وَ لا مَجْنُونٍ ﴾[2]

(پس اے نبیؐ! آپ نصیحت کرتے رہیں، آپ اپنے رب کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں اور نہ ہی مجنون)

سیرت سے متعلق مستشرقین اشکالات کا تجزیہ:

سیرت طیبہ کے حوالے سے حالات اور زمانے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ کلامی مباحث نے بھی مختلف اور متنوع انداز اختیار کیے اور خصوصاً مستشرقین جب سے نمودار ہوئے تو انھوں نے ان کلامی مباحث اور موضوعات کو اپنے انداز سے زیر بحث لانا شروع کیا اور جدید انداز سے سیرت پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تحقیقات کیں وہاں آئے روز نئے نئے اعتراضات اور تنقید کی بوچھاڑ کر دی۔ چنانچہ سیرت طیبہ کے حوالے سے مستشرقین کے نقطہ نظر اور موقف ورویے کو دو مراحل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ان میں سے پہلا مرحلہ جس کو قرون وسطی (Middle ages) کے مستشرقین کا زمانہ کہا جاتا ہے ان کے ہاں آنحضرت ﷺ جعل ساز، مکار، فریبی، اور جھوٹا نبی (معاذ اللہ) قرار دیئے جاتے ہیں جبکہ آخری مرحلے کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے اس زمانے میں عموماً نبی کریم ﷺ کے اخلاص پر شکوک وشبہات کا اظہار اگر چہ کم کیا گیا ہے مگر آپ کے دعوائے نبوت کو معصومانہ وہم (Innocent Delusion) قرار دیا گیا، اور اسکو مختلف انواع کے نفسیاتی خلل (Psychological Disorder) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے کی ابتداء یوحنا دمشقی پادری (Saint John of Damascus) سے ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے مرحلے کا آغاز تھامس کارلائل (ThomasCarlyle) سے کیا جاتا ہے۔[3]

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع صحیح، کتاب الطب، باب الکھانۃ، 2\135-136

[2] الطور:29

[3] Mohammad Mohar Ali, *Sirat-al-Nabi and The Orientalists*, Madinah: King Fahad Complex, 1997, p: 7-8

یوحنا دمشقی (آٹھویں صدی) عیسائیوں کا پہلا عالم ہے کہ جس نے اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام بت پرستی کا حکم دیتا ہے، اس کے بعد دانتے (Dante Alighieri: 1265-1321) نے خدائی مزاح (Divine Comedy) نامی اپنی مشہور نظم میں آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کی کوشش کی ہے۔[1]

اسی طرح قرون وسطیٰ کے کلیسائی مغرب میں کچھ مفروضوں پر مبنی طنز بھی ملتے ہیں جو زیادہ تر اس وقت کی اسلام اور پیغمبر اسلام کے اس تعارف پر مبنی تھے جو صلیبی جنگوں (گیارہویں سے تیرہویں صدی) سے پہلے یا بعد کے حالات کے پیدا کردہ تھے۔

مشہور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیر (William Shakespeare: 1564-1616) اور دیگر کے ہاں ایسے بے سروپا واقعات کی مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی عقلی یا علمی بحث کے بغیر اسلام پر تنقید کی کوشش کی گئی۔ نامور انگریز ادیب فرانسس بیکن (Francis Bacon: 1561-1626) نے آنحضرتؐ کو عطائی قرار دیا تو سیور ڈوریر (Sievr du Ryer) نے فرانسیسی زبان میں (محمد کا قرآن The Alcoran of Mahomet کے عنوان سے قرآنی ترجمہ شائع کر کے اسے آنحضرت ﷺ کی ذاتی تصنیف قرار دیا۔

ایک مستشرق روڈنسن (Rodinson: 1915-2004) نے قرآن کریم کو نبی علیہ السلام کی سمعی بصری خطائے حس (Auditory visual hallucination) قرار دیا ہے۔[2] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مصنف پروفیسر الفرڈ ویلچ Afford T. Welch کہنا ہے کہ کا قرآن کریم پیغمبر علیہ السلام کے فکری ارتقاء کا دوسرا نام ہے. جس کے الفاظ یہ ہیں:

The Quran is the name of evolution in the thinking of Muhammad.[3]

مستشرقین کے اکثر اعتراضات مشرکین مکہ کی طرف سے صدیوں پہلے کئے جا چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نفسیاتی عوارض سے متاثرہ کوئی شخص جو جنوں و مرگی کا بھی حاصل ہو وہ کسی ریاست کا سربراہ یا حامل قانون بن سکتا ہے جبکہ یہ نفسیاتی عوارض ایسے ہیں کہ جو فکری صلاحیتوں کے مٹانے، قوت حافظہ کی کمزوری اور مزاج کے بگاڑ کا سبب بنتے ہیں جبکہ آنحضرت کی فکری و سیاسی صلاحیت و بصیرت اس امر کی مخالف ہے۔

اسی طرح آرتھر جیفری (Arthur Jeffery (1892-1959)، نولڈ یکے Theodor Noldeke

---

[1] وحید الدین خان، مولانا، شاتم رسول کا مسئلہ: قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ کی روشنی میں، گڈورڈ بکس، نیو دہلی، 2007، ص، 11

[2] Dr. Farhat Aziz. International Journal of Humanities and Social Sciences, Vol. 1. No. 11 (Special Issue-August 2011), p.120

[3] *Ibid.*

(1836-1930) اور جوزف شاخت(1902-1969) Joseph Schacht وغیرہ مستشرقین کے ہاں قرآن کریم میں بعض ایسے الفاظ میں جو غیر عربی نہیں یا دوسری زبانوں مثلاً فارسی، حبشی، آرامی، یونانی اور لاطینی سے مستعار لیے گئے ہیں[1] ایسی تحقیقات سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ آنحضرت نہ صرف غیر عربی زبان سیکھا کرتے تھے بلکہ ان سے اچھی طرح واقف تھے۔

امام شافعی، امام طبری، ابن فارس، امام سیوطی اور قاضی ابو بکر رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ قرآن کریم میں کوئی بھی عجمی لفظ موجود نہیں ہے اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ فصیح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ ابن جریر طبری نے کہا ہے کہ قرآن میں جو دیگر زبانوں کے الفاظ موجود ہیں وہ اتفاقی لحاظ سے مماثلت ہے۔ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ عربی زبان چونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے بھی پہلے سے چلی آرہی ہے لہذا اس زبان میں مستعمل جن الفاظ کی اصل یا مصدر یا اشتقاق نہ ہو تو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مصادر واشتقاقات متروک ہو چکے ہیں اور یہ الفاظ ابھی تک باقی ہیں۔

جدید کلامی مباحث میں **قرآن کریم کے بعد حجیت حدیث** کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو مستشرقین نے تدوین حدیث کو دوسری یا تیسری صدی ہجری سے منسلک کر کے یہ تاثر دینے کی سعی کی ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں احادیث چونکہ مدون نہیں ہوئی تھیں اور ان کو ڈیڑھ یا دو صدیاں بعد عمل میں لایا گیا لہذا احادیث نبویہ کو اسلام کا مصدر قرار دینا غلط ہے اور اسی طرح اسلامی ابتدائی زمانوں کے متعلق حدیث کو ایک معتبر تاریخی دستاویز بھی نہیں کہا جاسکتا۔

احادیث سے متعلق مغربی اسکالرز کے طرز عمل کو چار ادوار پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ جن میں سے سب سے پہلا مرحلہ دور تشکیک(early skepticism) کرتا ہے۔ دوسرا مرحلہ زمانہ تشکیک کے خلاف رد عمل(reaction against skepticism) کا ہے۔ تیسرا مرحلہ درمیانی راستے کی تلاش (an attempt to search a middle ground) جبکہ چوتھا مرحلہ تشکیک جدید(neo skepticism) کا ہے۔[2]

پہلے مرحلے میں ہنگرین یہودی مستشرق گولڈزیہر (Goldziher: 1850-1921) اور جرمن سکالر جوزف شاخت(Josef Schacht: 1902-1969) شامل ہیں۔ گولڈ زیہر (Goldziher) کے ہاں اکثر احادیث

---

[1] الطیار، مساعد بن سلیمان الدکتور، الدخیل من اللغات القدیمۃ علی القرآن من ظل کتابات بعض المستشرقین، عرض ونقد، ص،33

[2] Minggu, *The Study of Hadieth Literature in the West*, Oxford University Press,
London: 1967, p:46.

ابتدائی دو صدیوں میں اسلام کی مذہبی، تاریخی اور سماجی ترقی کا نتیجہ ہیں چنانچہ اس حوالے سے اسکی کتاب (Muhammadanische Studien) میں یہ سب ذکر ہے۔ جبکہ شاخت لکھتا ہے:

We shall not meet any legal tradition from the prophet, which can be considered authentic.[1]

(مسائل فقہیہ سے متعلق ہمیں نبی سے کوئی بھی ایسی ایک حدیث نہیں ملی کہ جس کو ہم صحیح حدیث قرار دے سکیں)۔

دوسرے دور کے معروف اسکالرز میں نابیہ ایبٹ (Nabia Abbott: 1897-1981) نامی امریکن مستشرق ہے جو یونیورسٹی آف شکاگو میں مشرقی علوم کی پہلی پروفیسر تھی ۔اسکی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ (Goldziher) اور شاخت کا نظریہ "وضع حدیث" Hadith Fabrication غلط ہے اور اس کے ہاں جو مستشرقین زمانہ ہجرت کے بعد احادیث کی کثرت کو بنیادی وجہ بنا کر یہ دعوی کرتے ہیں کہ مدنی زندگی کے دس سال کے عرصہ میں لاکھوں کی تعداد میں احادیث کا صدور ایک ناممکن کام ہے تو ان کو جواب ہے کہ ہجرت کے بعد کے زمانہ میں کثرت احادیث کی وجہ متون کا کثیر ہونا نہیں بلکہ کثرت اسناد ہے۔[2]

تیسرا مرحلہ جس کے نمایاں مستشرقین میں جیوئن بال (Juynboll 1935-2010) اور ہارلیڈ موٹسکی (Harald Motzki: 1948-2019) شامل ہیں۔ جیوئن بال اگرچہ ساخت سے متاثر ہے مگر وہ حدیث سے متعلق اسکے بے پناہ مبنی پر تشکیک رویے سے اتفاق نہیں کرتا اور شاخت کے موقف کو تنقیح کے بعد تسلیم کرتا ہے۔ اس نے شاخت کی حدیث کے بارے میں (Common Link Theory) کی تہذیب کی ہے، شاخت کے ہاں اسناد حدیث دوسری صدی ہجری کے نصف کے بعد وضع کی گئیں جبکہ جیوئن بال کے ہاں حدیث کا مرجع (Source) پہلی صدی کے اواخر میں ہے۔ چنانچہ ہیر الڈ موٹزکی (Harald Motzki) نے پہلی صدی ہجری کی احادیث کی سند کا مأخذ جاننے کے لیے Traditional Historical کے اصول کو استعمال کیا ہے۔

جبکہ چوتھا مرحلہ جس کے نمایاں لوگوں میں انگریز پروفیسر مائیکل کوک (Michael Allan Cook: 1940) اور نورمن کولڈر (Norman Calder: 1950-1998) شامل ہیں۔ ان کی تشکیک پسندی گولڈ

[1] Joseph Schacht, *Origins of Muhammadan Jurisprudence*, Oxford University Press,
London: 1967, p:149.
[2] Minggu,*The Study of Hadieth Literature in the West*, p.58

زیہر(Goldziher)اور جوزف شاخت(Josef Schacht)سے بھی بڑھ کر ہے۔[1]

دنیامیں کوئی قوم تاریخ مرتب کرنے والے لوگوں کے حالات، عدالت، امانت و دیانت اور اخلاق کو نہیں دیکھتی یہ امت مسلمہ کا طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے خبر کی تصدیق کے لیے مخبر کے کردار کو اولیت دی، اور حدیث کی روایت کے لیے راوی کو اس قدر بلند کردار ہونے کی شرط رکھی کہ امام مالک رحمہ اللہ نے ستر (۷۰) ایسے رواۃ سے حدیث روایت کرنے سے انکار کر دیا جو اپنے کردار کے لحاظ سے تو اس قدر ثقہ راوی تھے کہ اسلامی بیت المال کی نگرانی پر بھی مامور کئے جاسکتے تھے مگر اس قدر بلندی کردار کے باوجود امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں ان کی عدالت ایک راوی حدیث کے معیار سے بھی کم تھی۔

مسلمانوں نے اسماء الرجال میں ہر ہر راوی کے کردار پر بے لاگ تبصرہ کیا اور اسکی خوبیوں اور خامیوں کو بغیر کسی جھجک یا تحفظ کے بیان کر دیا۔ اس کام کے دوران نہ تو ان کے راستے میں ظاہری تقوی آیا اور نہ ہی کوئی دباؤ ولالچ ان کے راستے میں رکاوٹ بن سکے۔ مستشرقین کا مطمع نظر جو کہ علم و تحقیق کے نام پر اسلامی شکل کو مسخ کرنا اور مسلمانوں میں دینی حوالے سے شکوک وشبہات پیدا کر کے اعتماد ختم کرنا ہے اسلئے ان کی اکثر تحاریر اسلام کے خلاف ہوتی ہیں مگر اس مخالفت کے دوران بعض اوقات ان کا قلم بعض باتوں میں مسلمانوں کے موقف کی تائید بھی کر جاتا ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تحریریں علمی نوعیت کی ہوتی ہیں اور وہ ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں کہ جو مسلمانوں کے خلاف مستشرقین کے موقف کی تردید کرتی ہیں۔

ان کی اکثریت گولڈ زیہر(Goldziher)کی پیروی میں احادیث کو دوسری اور تیسری صدی ہجری کی اختراع قرار دیتی ہے مگر بعض مستشرقین کی تحریروں سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی مسلمان احادیث طیبہ پر عمل پیرا تھے اور بعد کے مسلمانوں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور تقریرات باعتماد ذرائع سے منتقل ہوئے ہیں۔

چنانچہ اس حوالے سے(Philip Khuri Hitti)نے جہاں احادیث کے بارے میں دیگر مستشرقین کے مؤقف کی حمایت کی ہے وہاں کچھ الفاظ اسکے قلم سے اس طرح کے بھی ہیں:

> Throughout is lifetime Muhammad served as God's Spokesman thereby performing the triple function of legislator, judge and executive.The usage of prophet، (Sunnah, "custom","use")

[1] Minggu,*The Study of Hadieth Literature in the West*, p.58

including his deeds, utterances and tacit approval was available. It clarified the scriptural، text, elaborated on it, supplemented it, and thus fulfilled new demands. The Prophetic Sunnah became، in the first century after the hijrah the object of intensive study, next to the study of the Koran itself, the research involved collection, verification and recording.[1]

(محمدؐ نے اپنی ساری زندگی خدا کے خلیفہ (پیغمبر) کے طور پر اپنے فرائض انجام دیئے یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قانون ساز، جج اور منتظم کے سہ گونہ فرائض سرانجام دیتے رہے۔ (آنحضرتؐ کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی آپ کی عادات، آپ کا اطریقہ کار، آپکے اقوال وافعال اور تقریرات موجود تھیں۔ان چیزوں نے وحی کے متن کی تفسیر و تبیین کی اوریوں جدید تقاضوں کو پورا کرنے والی تھیں۔ہجرت کے بعد پہلی صدی ہجری میں احادیث مبارکہ قرآن کریم کے بعد بہترین تحقیق اور مطالعہ کا موضوع قرار پائیں۔ان احادیث کی تحقیق میں، احادیث کو جمع کرنے، ان کی جانچ پڑتال کرنے اوران کو محفوظ کرنے کے مقاصد کو ملحوظ خاطر رکھا گیا)

فلپ ہٹی کا یہ اقتباس ان تمام ناقدین مستشرقین کے مزعومات پر کاری ضرب ہے اس لئے کہ یہ آپؐ کی زندگی میں آپؐ کے اقوال کی تشریعی حیثیت کو تسلیم کر رہا ہے اس بات کا بھی اقرار کر رہا ہے کہ احادیث قرآن کریم کے بیان اور تفسیر کے طور پر استعمال ہوئیں اور یہ اعتراف بھی کہ ہجرت کے بعد پہلی صدی میں احادیث کی زبر دست تحقیقات ہوئیں اور اسی دور میں ان کی جمع اور جانچ پرکھ کا کام بھی ہوا۔ چنانچہ یہ تمام باتیں عمومی مستشرقین کے موقف کے برخلاف جبکہ احادیث کی اہمیت اور حفاظت کے لیے کی جانے والی کاوشوں کی غماز ہیں۔

اسی طرح جان بیگٹ گلب Muhammad (Glubb: 1897-1986) یوں رقمطراز ہے:

The were many minor legal and administrative problems to settle, his decisions in which were ،handed down in Muslim tradition and became، unchanging laws for hundreds of

[1] Philip Khuri Hitti, *Islam a Way of Life*, Melanistic Press,1971, p:42

millions of persons, for centuries to come.[1]

(کافی سارے قلیل اہمیت کے حامل قانونی و انتظامی امور کو طے کرنا باقی تھا۔ ایسے امور کے متعلق محمدؐ کے فیصلہ جات اسلامی روایات کے طور پر آمدہ مسلمانوں کی جانب منتقل ہوئے اور صدیوں تک کروڑھا مسلمانوں کے لیے غیر متغیر قانون کی حیثیت پاگئے۔)

یہاں گلب تو آپ کے فیصلوں کو اسلامی روایات کا حصہ تسلیم کر رہا ہے اور کروڑوں لوگوں کے لیے ناقابل تغییر قانون بھی کہہ رہا ہے مگر عمومی طور پر مستشرقین احادیث کو آپ کے فیصلے یا اقوال نہیں مانتے بلکہ ان کے نزدیک یہ بعد کی اختراع ہے۔

ایک معروف مستشرق ڈاکٹر مورس بکائی (Maurice Bucaille: 1920-1998) علم حدیث کی حجیت و استناد کے حوالے سے اعتراف کرتے ہوئے ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ مفہوم ملاحظہ ہو: آنحضرت کی حیات مبارکہ میں اور آپ کے وصال کے بعد قانونی قسم کی اضافی معلومات آپ کے افعال و اقوال میں تلاش کی جاتی تھیں۔[2] اسی طرح احادیث کی جانچ پرکھ یعنی جرح و تعدیل اور حفاظت کے حوالے سے مسلمانوں کی کوششوں پر (Maurice Bucaille) ان تاثرات کا اظہار کرتے ہیں کہ: جن حضرات نے احادیث کو مجموعہ جات میں ترتیب دینے کی ذمہ داری اٹھائی انہوں نے حدیث کی جانچ پڑتال کے لیے وہ طریقہ کار اختیار کیا کہ جس میں تاریخی واقعات کو قلم بند کرنے سے قبل اختیار کرنا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔

احادیث کی جمع کے اس مشکل ترین کام میں صحت روایات کو ہمیشہ انھوں نے ملحوظ خاطر رکھا اور اس حقیقت ثبوت اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ہاں احادیث مبارکہ کے جو مجموعے زیادہ مستند ہیں۔ ان کی تمام اسناد حدیث صحابہ کرامؓ یا اہل بیت کرام تک متصل ہیں۔

ایک جرمن مستشرق سپرنگر کی مشہور رائے میں مسلمانوں نے علم اسماء الرجال میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اس کے مقابلے میں نہ ماضی میں کوئی قوم ایسی تھی اور نہ آج کوئی قوم ایسی ہے جو ایسا کارنامہ سرانجام دے سکے۔ اس عظیم فن میں مسلمانوں نے پانچ لاکھ انسانوں کے احوال زندگی مرتب کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔[3]

---

[1] John Glubb, *The Life Times of Muhammad*, Hard & Stongton, London: 1970, p: 259.

[2] Maurice Bucaille, *The Bible, The Quran and Science*, Islamabad, 1992, p: 258

[3] الندوي، محمد صدر الدين، المستشرقون والسنة النبوية، مشموله، الأسلام والمستشرقين، جده 1985ء، 9/434

ان جدید کلامی مباحث میں سے ایک اہم مسئلہ آنحضرت ﷺ کی تعدد ازواج کا ہے۔ بہر حال عمومی طور پر تو اہل علم ان اعتراضات کا جواب یہی دیتے آئے ہیں کہ یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص نبوت میں سے ہے اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اجازت عطا فرمائی تھی۔

بعض سیرت نگاروں کی رائے یہ ہے کہ چار کی تحدید والی آیات سن 7ھ کے لگ بھگ نازل ہوئیں اور آنحضرتؐ کا آخری نکاح بھی اسی سال ہوا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ دونوں باتوں میں کوئی حتمی تعین نہیں ہوا کہ ان میں سے کون سا واقعہ پہلے رونما ہوا تھا اور کون سا بعد میں۔ چنانچہ اس حوالے سے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

یہاں دوسری بات یہ مد نظر رکھنی چاہیے کہ آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین کا درجہ سن 5ھ میں دیا گیا اور ان کو حقیقی ماؤں کی طرح قرار دیا گیا، جیسا کہ ارشاد ہے کہ:

﴿وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَدًا﴾[1]

(اور ان کے بعد کبھی بھی کوئی ان سے نکاح نہ کر سکے گا)

قرآن حکیم نے سورۃ الاحزاب میں ایک درمیانی صورت بیان کی ہے وہ یہ ہے:

﴿تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ﴾[2]

(کہ آپ جس کو چاہیں اپنے در و دولت میں رکھیں اور جس کو چاہیں ملتوی رکھیں)

یہاں اس آیت کی تفسیر میں اہل کلام اور متکلمین اسلام نے مفصل ابحاث کی ہیں مگر سیاق و سباق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ازواج مطہرات کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا۔ ایک قسم کو ایواء کا شرف عطا فرمایا اور دوسری قسم کو ارجاء۔ اور یہاں بھی قرآن حکیم نے کہا کہ آپ کوئی ردوبدل کرنا چاہیں تو گنجائش موجود ہے اور اسکے بعد فرمایا کہ

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِن بعد﴾[3]

(کہ اس کے بعد آپ کے لیے کسی دوسری عورت سے نکاح جائز نہیں ہے)

پہلے حضور ﷺ نے ان کو پیش کش کی کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو میں آپ کو مال و دولت دے کر فارغ کر دوں مگر ان ازواج مطہرات میں سے کوئی ایک بھی اس شرف زوجیت کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ بلکہ بعض ازواج نے اپنا حق تک چھوڑ دیا مگر آپ سے درخواست کی کہ آپ ہمیں زوجیت رسول کے شرف سے محروم نہ فرمائیں، جن میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک انتظام یہ بھی فرمایا

---

[1] الاحزاب:53

[2] ایضاً:51

[3] ایضاً:52

کہ ازواج مطہرات میں سے چار آپ ﷺ کے ساتھ ایواء اور پانچ ارجاء کی منزل میں قیام فرمائیں۔[1]

رسولؐ کی زندگی کے حوالے سے مستشرقین کے پہلے مرحلے کے لوگوں کا انداز و رویہ ایسا ہے کہ جس پر خود اہل مغرب بھی افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ نامور مستشرق فلپ ہٹی (Phillip K.Hitti: 1886-1978) نے اپنی کتاب Islam and the West میں، جو کہ 1962ء میں شائع ہوئی، افسوس کا اظہار کیا۔

سیرت طیبہ ﷺ کے حوالے سے دوسرا مرحلہ کہ جس کو مغرب نے علمی رویے اور اسلوب کے حوالے سے عنوان دیا ہے بھی اپنے اہداف کے لحاظ سے پہلے مرحلے سے مختلف نہیں ہے۔ اس زمانے کے معروف مستشرقین کے ہاں بھی رسول اللہ ﷺ نہ تو اللہ تعالیٰ کے فرستادہ سچے رسول ہیں اور نہ ہی قرآن کوئی آسمانی کتاب ہے۔

بعض مستشرقین کے ہاں حضور اکرم ﷺ نے غار حراء میں حقیقتاً و واقعتاً جبرائیل یا کسی فرشتے کو نہیں دیکھا تھا بلکہ مراقبات (Meditations) کی کثرت کے باعث آپ ﷺ اس وہم میں پڑ گئے تھے۔ اسی طرح مستشرقین کا ایک گروہ آپ ﷺ کو محض ایک سماجی مصلح (Social Reformer) قرار دیکر آپ کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور وہ آپ کو ایک بہترین انسان یا اچھا قومی راہنما کے طور پر تو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں مگر بطور رسول یا نبی ماننے کو تیار نہیں۔

دوسرے مرحلے اور زمانے کے نامور مستشرقین میں سپرنگر (Aloys Sprenger)، ولیم میور (William Muir)، مارگولیتھ (Margoliath) اور منٹگمری واٹ (William Montgomery Watt) شامل ہیں.

سپر نگا (Aloys Sprenger: 1813-1893) ایک آسٹرین مستشرق ہے ، یونیورسٹی آف ویانا (University of Vienna) سے طبعی و شرقی علوم کی تعلیم حاصل کی اور پھر لندن جاکر اس نے مسلمانوں میں عسکری علوم و فنون کی تعلیمی و تربیتی تاریخ کو اپنی ریسرچ کا موضوع بنا کر تحقیق کی اور (1843ء) میں کلکتہ آکر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ 1850ء میں اسے ایشیائی سوسائٹی آف کلکتہ (Asiatic Society of Calcutta) کا سیکرٹری اور 1857ء سے سوئٹزرلینڈ کی یونیورسٹی آف برن (University of Bern) اور جرمن یونیورسٹی ہائیڈل برگ (Heidelberg) میں تدریسی فرائض سرانجام دیے۔

سپرنگر نے سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر 1851ء میں (The Life of Mohammad) کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اسی طرح اس نے اپنے ہندوستان کے عرصہ قیام میں فارسی و عربی کتب بھی ایڈٹ کر کے شائع کیں۔

---

[1] الطبری، محمد بن جریر، تفسیر الطبری، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ 1410ھ / 1990ء، 20/292

چنانچہ اسکے اس کتاب کے الہ آباد سے شائع ہونے والے 1851ء کے نسخے سے 210 صفحات میں سے ابتدائی تقریباً 74 صفحات تاریخ جاہلیت کے موضوع پر تفصیلی مواد پر مشتمل ہیں۔ اس کا دعوی ہے کہ آنحضرت ﷺ توہم پرستی کا شکار تھے اور جنات پر آپکا یقین تھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

The messenger was not free from superstition,; he believed in Jinn , Omens, and charms, and ,he had many Superstitious habits. The Jinn were, according, to his opinion, of three kinds: Some have wings and fly; other are snakes , and dogs and those of the third kind move about from place to place like men. Again, some ,of them believed in him, and others, did not. [1]

یہ شخص جو ساری زندگی رومن کیتھولک چرچ سے متعلق رہا ہے اسکو ہرگز مناسب نہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ اور قرآن کریم کو توجنات اور ان پر یقین کے حوالے سے موضوع تنقید بنائے مگر بائبل پر اس لحاظ سے کوئی تبصرہ تک نہ کرے۔ جنات کی تو بائبل کے پرانے اور جدید تراجم تصدیق کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کے لیے عربی میں لفظ جن کے بجائے شریر ارواح (Evil Spirits) استعمال ہوتا ہے جیسا کہ انجیل لوقا میں ذکر ہے کہ سیدنا عیسی علیہ السلام کے پاس سے وہ شخص صحت یاب ہو کر جاتا تھا۔[2] اسکے علاوہ فال نکالنے سے متعلق (Aloys Sprenger) خود ہی اس سے اگلے صفحہ پر یہ وضاحت پیش کر رہا ہے کہ پیغمبر اسلام صرف نیک فال لیا کرتے تھے۔ اسکے الفاظ یہ ہیں:

His ideas of omens, however, were more , sensible: he admitted lucky omens, but forbad to believe in unlucky ones.[3]

لہذا جب آپ نیک فال لیا کرتے تھے تو یہاں کیا اعتراض باقی رہ جاتا ہے؟ سپرنگار قرآن کریم کی آیت

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾[4]

کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آنحضرت نبوت کے دعوے سے قبل بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے:

Up to his fortieth year, Mohammad devoutly worshipped the

---

[1] Sprenger, *Life of Muhammad*, Allahabad: Presbyterian Mission 1851, p: 90

[2] *The Bible, Luke*: 7.21

[3] A Sprenger, *Life of Muhammad*, p: 91

[4] والضحی:7

gods, of his fathers [1]

اسی طرح وہ مزید کہتا ہے کہ جب آپ چالیس برس کی عمر کو پہنچے تو ان کے ذہن میں اپنے آباؤ اجداد کے دین بت پرستی کے حوالے سے چند شکوک وشبہات اور توہمات پیدا ہوئے جسکو بعد میں مسلمانوں نے وحی کے نزول کا نام دیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

> When he was forty years of age ,the first doubts concerning idolatry, arose in his mind. The true believers ,ascribe this crisis to a divine revelation[2]

حقیقت یہ ہے کہ

نبوت ملنے سے قبل آپ ﷺ ملت ابراھیمی اور دین توحید پر تھے. دین ابراھیمی اپنی اصلی اور مکمل صورت میں محفوظ نہ تھا اور نہ ہی شریعت اسلامیہ کا ابھی تک نزول ہوا تھا۔ اسلئے آپ ﷺ قبل از نبوت تفصیلی ہدایت یعنی شریعت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غار حرا میں دوران قیام دین ابراھیمی کی روشنی میں عبادت فرمایا کرتے تھے:

﴿وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّو ﴾[3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی روایات کے مطابق آپ نبوت ملنے سے قبل ہر سال میں فقط ایک ماہ غار حرا میں قیام کیا کرتے تھے۔[4] چنانچہ کچھ سیرت نگار حضرات کے ہاں حضور اکرم ﷺ نے اپنی عمر کے اڑتیسویں سال سے اسکا آغاز کیا اور چالیسویں سال میں جس ماہ آپؐ نے قیام فرمایا وہ ماہ رمضان تھا اور آپ ﷺ کے غار حرا میں قیام کا تیسرا سال تھا۔ لہذا اڑتیس سے چالیس سال کی عمر کے تین سالوں کا آپ ﷺ کا غار حرا میں کل قیام تین ماہ کا عرصہ رہا جبکہ تیسرے ہی سال جبرائیل امین وحی لیکر تشریف لے آئے۔[5]

سپرنگا(Aloys Sprenger) اپنے قرآنی مطالعے کا نچوڑ لکھتے ہوے کہتا ہے کہ پیغمبر خدا کے ذہن میں اسلام بطور دین تین مرحلوں سے گزر کر ایک نظام زندگی بن کر سامنے آیا جن میں سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے اہل مکہ کے مذہب کے بارے میں اپنے مراقبوں میں غور وفکر کیا اور انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو بنظر حیرت دیکھتے

---

[1] Sprenger, *Life of Muhammad*, p: 91
[2] *Ibid*,p:91

[3] الجاثیہ،24
[4] ابن ہشام، عبد الملک الحمیري، السیرۃ النبویہ، مطبعہ مصطفی البابي الحلبي، مصر، 1955ء، 1/235
[5] البخاري، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب کیف کان بدء الوحي إلی رسول اللہ، دار طوق النجاۃ، 1422ھ، 1/7.

ہوئے اسے ایک خدا پر ایمان کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اس کے بقول دوسرے مرحلے میں مراقبات کی کثرت کے باعث نبی علیہ السلام کو وحی والے خواب نظر آنے لگے جن میں بت پرستی کی مخالفت تھی۔۔۔ نبوت کے دعوے کے شروع میں آپ ﷺ نے یہود و نصاری کی مذہبی کتابوں کے سیکھنے اور ان پر ایمان لانے کے سلسلے میں خصوصی توجہ دی مگر جیسے جیسے آپ ﷺ کو کامیابی ملتی گئی تو آپ ﷺ نے ان کتب سے استغناء اختیار کر لیا جب کہ تیسرے مرحلے میں آپ ﷺ نے یہودی وعیسائی مذہب کے مطالعہ کے بعد ان سے مایوس ہونے کی صورت میں ایک جدید دین متعارف کروانے کی کوشش کی۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاری اور تورات وانجیل کے باب میں قرآن کریم کا جو موقف مکی سورتوں میں بیان ہوا ہے وہی مدنی سورتوں میں بھی ہے۔ موصوف کا مزید یہ کہنا ہے کہ آپ ﷺ حسی خطاء میں مبتلا تھے۔ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد بحکم خداوندی کچھ عرصہ تک وحی رکی رہی جس کو فترت وحی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ نزول وحی میں اس رکاوٹ نے آپ ﷺ کی طبیعت میں کچھ بے چینی اور تشویش پیدا کر دی جسکی وجہ سے آپ ﷺ یہ سوچتے کہ وحی کے بغیر زندگی کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ سوچ اور فکر مایوسی کے باعث نہیں تھی بلکہ نزول وحی کے شوق کی وجہ سے پیدا ہوئی۔[2]

اسی طرح ایک اور اسکاٹش مستشرق ولیم میور (William Muir: 1819- 1905) جس نے گلاسکو اور ایڈنبرا کی جامعات سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1837ء میں بنگال سول سروس اختیار کی اور شمال مغربی صوبوں کے گورنر کے سیکرٹری کے طور پر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ 1884ء میں شاہی ایشیائی سوسائٹی (Royal Asiatic Society) کا صدر نامزد ہوا۔[3]

اسکی مشہور کتابوں میں سے The Life of Mahomet, and History of Islam to the Era of Hegira ہے جس کی ابتدائی دو جلدیں 1861ء اور تیسری وچوتھی جلدیں 1885ء میں شائع ہوئیں تھیں یہ کتاب بعد میں چھانٹی اور تنقیح کے بعد The Life of Mahomet from Original Sources کے نام سے 1878ء میں شائع ہوئے. اس نے خلافت کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall تھا۔ اسکے علاوہ سیرت اور تاریخ میں Mahomet and Islam، اور The Rise and Decline of Islam شامل ہیں۔

---

[1] A. Sprenger, *Life of Muhammad*, p: 103, 104, 105

[2] مبارکپوری، صفی الرحمن، الرحیق المختوم، دار الحلال، بیروت، 1428ء، ص: 57-58

[3] William Muir, Accessed on 10 Oct, 2023, ebooks https: //www.rekhta .org

میور نے 1897ء میں سیرت کے موضوع پر ایک کتاب لکھ کر شائع کی جس کا نام The Mohammadan Controversry تھا۔اس کی مشہور کتابThe Life of Mahomet ہے جسکو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے Mohammad till the Hijraاور Mohammad at Medinaاور جبکہ کتاب کے 37ابواب اور 556صفحات ہیں۔

ولیم میور وہ اپنے پیش رو سپرنگا کا خوشہ چیں ہے، اسی طرح کے استشراقی اعتراضات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس نے اضافہ بھی کیا ہے۔ میور نے ان خیالات میں جدت کا اسلوب اپنایا۔۔۔[1]

سر سید احمد خان (1817-1898) نے اس کتاب کا جواب دینے کی غرض سے لندن کا سفر کیا اور اسکے جواب میں "الخطبات الأحمدیہ في العرب والسیرۃ المحمدیہ" کے نام سے کتاب لکھ کر ولیم میور کے اعتراضات کا رد لکھا، جس کو بعد میں اردو زبان میں خطبات احمدیہ کے نام سے 1870ء میں شائع کیا گیا اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی لندن سے شائع کیا گیا۔ اسکے علاوہ ڈاکٹر مہر علی نے بھی اپنی کتابSirat-al - Nabi and the Orientalists میں ایسے اعتراضات کا پھر پور جوابات اور تنقیدی جائزہ لکھا ہے۔

اسی طرح لندن میں پیدا ہونے والے چرچ آف انگلینڈ کے ایک معروف پادری ڈیوڈ صموئیل، مارگولیتھ(David Samuel Margoliouth:1858-1940 جس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں 1889ء سے لیکر 1937 تک عربی زبان کی تدریس کی۔ اس کا والد پہلے یہودی تھا پھر عیسائیت قبول کی 1905 ء میں شاہی ایشیائی سوسائٹی(Royal Asiatic Society)کا رکن نامزد ہوا اور 1934ء سے 1937ء تک اس کا صدر رہا۔ بعض عربی کتب کی ایڈیٹنگ اور ترجمہ کرنے کے باعث شہرت پائی۔ جسکی وجہ سے مصری شاعر احمد شوقی نے اپنی نظم نیل کو اسکی طرف منسوب کیا۔

اسکی مشہور کتب میںMohammad and the Rise of Islam ہے جسکی اشاعت 1905ء میں ہوئی۔ اس کے بعد 1907 میں بنی امیہ اور بنی عباس پر اس نے ایک کتابUmayyad's and Abbasids کے نام سے تصنیف کی۔ پھر 1914 میں اس نےThe Early Development of Mohammedanism کے نام سے اسلامی فقہ کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی۔ 1922ء میں بنو عباس کی سلطنت کے زوال پر بھی ایک کتاب The Eclipse of the Abbasid Caliphate شائع کی۔

مارگولیتھ نے بھی اپنے متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے یہی نقطہ نظر اپنایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1]William Muir, *The Biography of the Prophet and Orientialists*, p: 73.

اپنے خوابوں میں دیکھ رہے تھے اسے اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا فرشتہ یا کتاب سمجھ رہے تھے، اسی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب کے تیسرے باب First Dreams of Inspiration میں یہ لکھنے بعد دعویٰ کیا کہ معراج بھی ایک خواب تھا۔[1] ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیت سے متعلق زیادہ تر معلومات شام کے سفر کے دوران حاصل کیں اور ان کو قرآن کریم کا حصہ بنا کر شامل کیا ہے۔[2]

اسی طرح (William Montgomery Watt: 1909-2006) ایک برطانوی مستشرق ہے جو کہ اسکاٹش چرچ کا پادری رہا۔ 1964 سے 1979 تک یونیورسٹی آف ایڈنبرا میں عربی زبان کی تدریس پر مامور رہا۔

واٹ کی مشہور کتب میں سیرت پر دو کتابیں Muhammad at Mecca اور Muhammad at Medina ہیں جو 1953 اور 1956 میں شائع ہوئیں۔ ان دونوں کتب کا خلاصہ Muhammad Prophet and Statesman کے نام سے 1961ء میں شائع ہوا۔ جبکہ اسکے علاوہ اسکی کتب میں Islamic Philosophy and Theology اور Islamic Political Thought شامل ہیں۔

واٹ بھی مشنری عیسائی تھا یہ الگ بات ہے کہ اپنی تحاریر میں آنحضرت ﷺ کی تعریفات سے بھی کام لیتا رہا ہے مگر جب نبوت ورسالت کی بات ہو تو اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اسکا کہنا ہے کہ آپ ﷺ تخلیقی نوعیت کے ایک عظیم مفکر و صلح تھے کہ جن کی بدولت قوم عرب کو ایسا نظام حیات ملا جو اس سے بہت بہتر تھا جو ان کے پاس حضور علیہ السلام کی آمد سے قبل موجود تھا۔[3]

واٹ وہ پہلا مستشرق ہے کہ جس نے سیرت طیبہ کے عنوان پر مستشرقین کو یہ منہج دیا کہ حضور ﷺ کی تعریفات بڑھ چڑھ کر خوب کرو مگر ان کو رسول مت تسلیم کرو۔ چنانچہ بہت سے سادہ لوح مسلمان مستشرقین کے اس طرح کے آپ ﷺ کے حق میں تو تعریفی کلمات کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ یہ بھی ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے تحت آپ کی تعریف کی جائے تاکہ یوں مسلمانوں کی ہمدردی و خیر خواہی کے حصول کے بعد ان کے قلوب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ان کا مقصد وہ مشن ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو عظیم مفکر و مصلح او مخلص اور محنتی انسان کے طور پر دنیا میں اس قدر متعارف کروایا جائے تاکہ عوام ان کو مخلص اس حد تک ہی سمجھے اور ان کی پیغمبرانہ حیثیت کو بہر صورت قبول نہ کرے۔

---

[1] Samuel Margoliouth, *Muhammad and the Rise of Islam*, New York,1905, p: 9.
[2] Samuel Margoliouth, *Ibid* , p: 9
[3] William Montgomery Watt, *Muhammad: Prophet and Statesman*, UK: Oxford University Press, 1961, p: 236

شیخ عبد اللہ محمد الأمین النعیم نے بھی اپنی کتاب **الاستشراق فی السیرۃ النبویۃ** اور دکتور لخضر شایب نے **نبوۃ محمد فی الفکر الاستشراقی** میں بھرپور انداز سے دلائل سے رد کرتے ہوئے واٹ کے نظریات کا تفصیلی جواب دیا ہے۔

خلاصہ بحث:

قرآن کریم کے حوالے سے مغربی مفکرین نے جن جدید موضوعات کو زیر بحث لایا ان میں سے ان کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم وحی خداوندی یا آسمانی کتاب نہیں بلکہ یہ دور جاہلیت کے مذاہب جیسے عیسائیت، یہودیت وغیرہ کے افکار سے مرکب ہے یا اسی طرح قرآن کے حوالے سے یہ کہنا کہ یہ تورات وانجیل سے ماخوذ ہے یا قرآن کریم کو کاہنوں کے اسلوب میں لکھی گئی کتاب کہنا یہ بالکل بے بنیاد دعوے ہیں جن کا مندرجہ بالا سطور میں تفصیلی جائزہ لیکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کریم محض اللہ کا کلام ہے اور جن لوگوں نے قرآن کریم اور اس کی نصوص پر اعتراضات کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت میں کاہنوں کا اسلوب اختیار کیا ہے یہ قرآن کریم کی تعلیمات سے ناواقفیت کی بنیاد پر ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے حوالے سے بھی کچھ ایسے اعتراضات مثلاً جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کو معصومانہ وھم یا مختلف انواع کے نفسیاتی خلل سے تفسیر کیا گیا یا قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تصنیف قرار دیا گیا یا قرآن کریم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سمعی وبصری خطائے حس قرار دیا گیا اسی طرح تدوین حدیث کو ڈیڑھ سے دو صدیاں بعد کی اختراع قرار دے کر غیر معتبر ذخیرہ قرار دیا گیا مذکورہ بالا فصل میں ان تمام شکوک وشبہات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ تمام نظریات اور شکوک وشبہات غلط اور بے بنیاد ہیں.

باب سوم:
وحی ورسالت سے متعلق عصری اشکالات کا تجزیہ

فصل اول: علم الوحی اور منصبِ رسالت سے متعلق ابہامات

فصل دوم: عصمتِ انبیاء اور عقیدۂ ختمِ نبوت سے متعلق مباحث

فصل اول:
علم الوحی اور منصبِ رسالت سے متعلق ابہامات

فصل اول: علم الوحی اور منصبِ رسالت سے متعلق ابہامات

اللہ رب العزت نے اس کائنات میں انسانی تخلیق کے ساتھ تین چیزیں مزید ایسی پیدا کی ہیں جو انسان کے لیے علم کا ذریعہ بن سکیں ان میں اولاً انسانی حواس خمسہ (آنکھ، کان، منہ، ہاتھ اور پاؤں) ثانیاً عقل انسانی اور ثالثاً وحی الٰہی شامل ہیں۔

بہت سی معلومات کا حصول انسان کو اس کے حواس خمسہ کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ جب کہ دیگر بہت سی اشیاء کا علم انسان اپنی عقل کے ذریعے حاصل کرتا ہے لیکن ایک بڑی تعداد جو انسانی حواس و عقل کے ذریعے انسان کو معلوم نہ ہو سکے تو ان کا علم انسان کو وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔ علم کے ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی حدود اور دائرہ کار متعین ہے اور حدود سے باہر وہ ذرائع انسانی معلومات کے حوالے سے قاصر ہیں۔

چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں ان کا علم خالصتاً عقل سے نہیں ہوتا۔ اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف انسانی حواس سے معلوم نہیں کی جاسکتیں۔ لہذا جہاں تک حواس خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی راہنمائی نہیں کرتی اور جہاں حواس خمسہ کام کرنے سے جواب دے دیں وہیں سے عقل انسانی کا کام شروع ہو جاتا ہے مگر اس عقل کی رہنمائی بھی ایک حد تک رہتی ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعے ہوتا ہے اور نہ ہی عقل سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس حوالے سے معلومات فراہم کرنے اور اس قسم کے جملہ سوالات کے جوابات دینے کے لیے جو ذریعہ اللہ رب العزت نے مقرر فرمایا ہے اسی کو وحی کہا جاتا ہے اس کا انداز و طریقہ یہی ہوتا ہے کہ خالق کائنات اپنے بندوں میں سے کسی کا انتخاب فرما کر اس کو منصب پیغمبری عطا فرماتے ہیں اور اسی پر اپنے کلام کا نزول فرماتے ہیں جو کہ وحی الٰہی کہلاتا ہے۔

علم الوحی سے متعلق علمائے اسلام کی توضیحات:

عربی لغت میں وحی کے معنٰی (الأعلام فی خفاء) ہیں [1] جس کا مطلب یہ ہے کہ چپکے سے بتا دینا، یا لطیف (Swift) اشارہ کرنا، یا مخفی طور پر (Secretly) انتہائی سرعت سے کسی کو کوئی بات یا پیغام بھیجنا یا "دل میں کوئی بات ڈال دینے" کے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس فرشتہ حاضر ہو کر اس طرح پیغام خداوندی پہنچاتا تھا کہ لوگوں کو پتہ تک بھی نہیں چلتا تھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ وحی "الأشارۃ السریعۃ" کو کہا جاتا ہے یعنی "جلدی سے

---

[1] عینی، بدرالدین، محمود بن احمد، عمدۃ القاری، دارالفکر، بیروت، س ن، 1\14

اشارہ کر دینا اور بتا دینا"[1] اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کیوں کہ فرشتہ ایک آن میں آکر غیب کی باتیں پہنچا کر چلا جاتا تھا۔

امام لغت راغب اصفہانی نے وحی کے چار معانی اور طریقے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

(وذلك يكون بالكلام على سبيل الرمز والتعريض، وقد يكون بصوت مجرد عن التركيب، وباشارة ببعض الجوارح، وبالكتابة) [2]

(وحی سے مراد 1۔ کوئی بات بطور رمز و تعریض کرنا 2۔ محض آواز کا ہونا جس میں کوئی ترکیب نہ ہو 3۔ کسی انسانی عضو کے ذریعے اشارہ کرنا 4۔ کتابت)

تفسیر المنار کے مؤلف نے مذکورہ مطلب کو یوں ذکر کیا ہے۔

(للوحى معنى عام يطلق على عدة صور من الأعلام الخفى الخاص الموافق لوضع اللغة وله معنى خاص واحد الأقسام الثلثة للتكليم الآلى وغيرهٰذه الثلاثة من الوحى العام لا يعد من كلام الله تعالىٰ)[3]

(وحی کے عمومی معنیٰ کا اطلاق مخفی لحاظ سے آگاہ کرنے کی مختلف صورتوں پر ہوتا ہے اور اس کا خصوصی معنیٰ وہ ہے کہ جس کا اطلاق اللہ رب العزت کے تشریعی کلام کے علاوہ دیگر کسی معنی پر نہیں ہوتا)

امام طبری وحی کے لغوی معانی کے حوالے سے کہتے ہیں:

(الوحى هو القاء الشئ الى الغير) [4]

(کہ وحی کا مطلب کسی چیز کو دوسری چیز میں ڈالنا ہے)

جبکہ اصطلاحی لحاظ سے وحی کا مفہوم علامہ زرقانی نے یوں بیان کیا ہے:

(ان يعلم الله من اصطفاه من عباده كل ماارداطلاعه عليه من الوان الهداية والعلم لكن بطريقة سرية خفية غير معتادة للبشر) [5]

---

[1] الزبیدی، محمد مرتضیٰ الحسینی، تاج العروس، مطبوعہ کویت، 1389ھ بمطابق 1949ء، 10\385

[2] الأصفہانی، راغب، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، ص515

[3] رضا، محمد رشید، تفسیر المنار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، 1429ھ، 11\179

[4] الأعرجی، ستار، الوحی ودلالتہ فی القرآن الکریم والفکر الأسلامی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، 1421ھ، ص14

[5] الزرقانی، عبد العظیم، شیخ، مناھل العرفان فی علوم القرآن مطبوعہ دار الکتاب العربی، 1\63

(وحی سے مراد یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا اپنے بندوں میں سے منتخب کردہ بندوں کو علم و
ہدایت کے رنگوں سے اس انداز میں روشناس کرنا کہ جو انتہائی خفیہ ہو اور انسانی عادات
کے غیر مطابق ہو)

اسی طرح وحی کی اصطلاحی تعریف کے حوالے سے علامہ خلیل القطان (متوفی:1420ھ) یوں رقمطراز ہیں:(اعلام الله تعالىٰ من يصطفيه من عباده ماارادہ من هداية بطريقة خفية سريعة)[1](اللہ تعالیٰ کا اپنے چنیدہ بندوں کو خفیہ مگر تیز ترین طریقے سے ہدایت کے ارادے سے بتلانا اور اطلاع پہنچانا وحی کہلاتا ہے)

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں وحی کی اصطلاحی تعریف یوں کی جائے گی کہ اصطلاح میں وحی کا اطلاق صرف اس کلام پر کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو، چاہے وہ فرشتے کے ذریعے ہو یا کسی اور واسطے سے، اس میں ظاہری اسباب اور عادی امور کا اندیشہ و دخل نہ ہو، یہ وحی نبوت ہے جو کہ انبیاء کے ساتھ خاص ہے۔

اگر وحی بذریعہ القاء فی القلب ہو تو اسے وحی الہام کہا جاتا ہے جو اولیاء اللہ پر بھی ہوتی ہے اور اگر وحی بذریعہ خواب ہو تو اس کو "رؤیا صالحہ" کہا جاتا ہے جو عام مؤمنین اور صلحاء بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں جب لفظ وحی کا اطلاق کیا جائے تو اس سے مراد وحی نبوت ہی ہوتی ہے اور کشف، الہام اور رؤیائے صالحہ پر لغوی اعتبار سے تو وحی کا اطلاق کیا جاتا ہے مگر اصطلاحی طور پر ان پر وحی کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔[2]

اقسام وحی

علامہ ابو القاسم السہیلی وحی کی اقسام کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں.

{ كان نزول الوحي عليه صلى الله عليه وسلم في احوال مختلفة ، فمنها: النوم كما في حديث ابن اسحاق ، وكما قالت عائشة أيضا: أول ما بدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم الرؤيا الصادقة وقد قال ابراهيم عليه السلام : اني أرى في المنام اني اذبحك فانظر ماذا ترى ، فقال له ابنه افعل ما تؤمر ، فدل على ان الوحي كان يأتيهم في المنام ؛ كما يأتيهم في اليقظة ومنها : ان يتنفث في روعه الكلام نفثا ، كما قال عليه السلام: إن روح القدس نفث في روعي: إن نفسا لن تموت حتى تستكمل اجلها و رزقها فاتقوا الله وأجملوا في الطلب، وقال مجاهد، وأكثر المفسرين.

في قوله سبحانه : وما كان لبشر ان يكلمه الله إلا وحيا، قال هو أن ينفث في روعه

---

[1] القطان، خلیل منان، مباحث فی علوم القرآن، 27، مکتبہ وھبیتہ بیروت 2000ء، ص302
[2] الاَصفہانی، راغب، حسین بن محمد، المفردات فی علوم القرآن، ص515

بالوحي ،

ومنها: ان ياتيه الوحي في مثل صلصلة الجرس وهو أشده عليه ، وقيل: إن ذلك ليستجمع قلبه عند تلك الصلصة ، فيكون اوعى لما يسمع ، والقن لما يلقى.

ومنها ان يتمثل له الملك رجلا ، فقد كان يأتيه في صورة دحية بن خليفة ، ومنها ان يتراءى له جبريل في صورته التي خلقه الله فيها له ستمائة جناح، ينتشر منها الؤلؤ والياقوت ، ومنها: ان يكلمه الله من وراء حجاب : اما في اليقظة كما كلمه في ليلة الأسراء، وأما في النوم ، كما قال في حديث معاذ الذي رواه الترمذي ، قال : اتاني ربي في أحسن صورة ، فقال : فيم يختصم الملأ الأعلى ، فقلت: لا ادري فوصنع كفه ، فوجدت بردها بين ثندوتي وتجلى لي علم كل شيء ...الخ فهذه ستة احوال ، وحالة سابعة قد قدمنا ذكرها ، وهي نزول إسرافيل عليه بكلمات من الوحي قبل جبريل عليه السلام ، فهذه سبع صور في كيفية نزول الوحي على محمد صلى الله عليه وسلم.}[1]

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی مختلف کیفیات تھیں جس طرح ابنِ اسحاق اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے نزول وحی کی کیفیت سچے خوابوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ حضرت ابر ھیم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "میں نے دیکھا ہے کہ خواب میں تمہیں میں ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتا تیری رائے کیا ہے۔" آپ کے بیٹے نے کہا، "کر ڈالیے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے۔" ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وحی نیند میں بھی آیا کرتی تھی جس طرح حالت بیداری میں آتی تھی۔ اور ان مراتب وحی میں سے ایک یہ ہے کہ فرشتہ دکھائی دیئے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور میں القاء کر دیتا تھا۔ ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔" جبریل نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ اپنی مدت اور رزق مکمل نہ کر لے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور طلب رزق میں خوبصورت طریقے اختیار کرو." اور مجاہد کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں "اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (بلاواسط) مگر وحی کے طور پر" وحی بالالقاء مراد ہے۔

اور ان مراتب وحی میں سے ایک یہ ہے کہ گھنٹی کی آواز کی طرح وحی کی آواز سنائی دے۔ وحی کا یہ انداز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت مشکل ہوا کرتا تھا۔ جب نزول وحی کی یہ کیفیت جدا ہوئی تو جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح یاد ہو چکا ہوتا۔

---

[1] السہیلی، الروض الانف، 1/266

اور وحی کا ایک مرتبہ یہ بھی ہے کہ فرشتہ انسانی شکل میں حاضر ہوتا جو کہ دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آیا کرتا تھا۔

اور ان مراتب وحی میں سے ایک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو اپنی شکل میں دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تخلیق کیا ہے۔

آپ علیہ السلام کے چھ سو پر ہیں جن سے ہمہ وقت موتی اور جواہرات بکھرتے رہتے ہیں۔

اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ پس پردہ کسی نبی سے کلام فرمائے۔ پھر یا تو یہ سعادت بیداری کی حالت میں ہو یا کہ نیند میں۔ جس طرح ترمذی کی اس حدیث میں ہے جو معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میرا پروردگار میرے پاس احسن صورت میں آیا اور پوچھا: ملأ اعلیٰ کس چیز سے متعلق جھگڑا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا: میں نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان میں رکھا میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی۔ میرے لیے ہر چیز کا علم عیاں ہو گیا۔ نزول وحی کی یہی چھ کیفیات ہیں اور ساتویں حالت یہ ہے کہ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یعنی اسرافیل علیہ السلام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نزول ہے جو کہ کلمات وحی کے ساتھ تھا۔ پس یہ سات کیفیات ہیں جو نزول وحی سے متعلق ہے۔)

السہیلی نے وحی کی سات صورتیں ذکر فرمائی ہیں[1]:

وحی منامی: یعنی خواب میں وحی کا آنا یہ صورت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے جو بخاری شریف کے باب (كيف كان بدؤالوحى الى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم) کی تیسری حدیث ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا کہ:

(اول مابدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحى الرؤيا الصالحة فى النوم)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے وحی کا آغاز رؤیائے صالحہ سے ہوا)

نفث فی الروع: یعنی دل میں بات ڈالنا جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ

(ان روح القدس نفث فى روعى ان نفسالن تموت حتىٰ تستكمل

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1/275، قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، 1/310

اجلها وتستوعب رزقها فاتقوالله واجملو فی الطب)[1]

(کہ فرشتے نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اس کا وقت مکمل نہ ہو جائے اور اس کی روزی ختم نہ ہو جائے)

صلصلۃ الجرس: یعنی وحی گھنٹی کی آواز کی صورت میں آئے جس کی صورت حدیث عائشہ میں مذکور ہے جو کہ باب کیف کان بدء الوحی الخ کی دوسری حدیث ہے

(احیاناً یا تینی مثل صلصلة الجرس)

تمثل ملک: اس سے مراد فرشتے کا صورت انسانی میں متمثل ہو کر گفتگو کرنا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دوسری حدیث میں ذکر ہے:

(واحیاناً یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی)

ظہور جبرائیل: اس صورت سے مراد جبرائیل امین علیہ السلام کا اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہونا ہے۔ چنانچہ وہ اس طرح نمودار ہوتے کہ ان کے چھ سو پر تھے اور ان سے جوہر و یاقوت ٹپک رہے ہوتے تھے۔

براہ راست کلام خداوندی: اس سے مراد اللہ رب العزت کا بیداری میں نبیؐ کے ہم کلام ہونا بھی ہے جیسا کہ معراج کی شب میں ہوا اور خواب کی حالت میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ترمذی میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ:

(اني قمت من الليل فتوضأت و صليت ما قدرلی، فنعست فی صلاتی حتی استثقلت، فاذا انا بربی تبارك وتعالیٰ فی احسن صورة فقال یا محمد، قلت لبیك رب، قال: فیم یختصم الملأ الأعلی الخ)

(آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میرا پروردگار میرے پاس سب سے حسین صورت میں آیا اور پوچھا کہ ملاء اعلی کس حوالے سے لڑ رہے ہیں میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان میں رکھا میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی میرے لیے ہر چیز کا علم عیاں ہو گیا۔ الخ)

---

[1] المناوی، عبد الرؤف، فیض القدیر شرح جامع الصغیر، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت، لبنان 1391ھ/1972ء، 2\450-451

وحیٔ اسرافیل: اس سے مراد یہ ہے کہ جبرائیل علیہ السلام سے پہلے آپؐ کے پاس حضرت اسرافیل علیہ السلام وحی لے کر آیا کرتے تھے۔[1] بعض اہل علم کے ہاں وحی کی چار اقسام ہیں۔

اول: اللہ تعالیٰ کا کلام "من وراء حجاب" سننا،

جیسے موسیٰ علیہ السلام نے طور پر اور حضور اکرمؐ نے معراج کی رات سنا تھا۔

دوم: تلقی بالقلب

سوم: خواب یا وحی منامی

چہارم: وحی بذریعہ فرشتہ بھیجنا، خواہ وہ فرشتہ جبرئیل ہوں، اسرافیل یا کوئی اس کے علاوہ، اور پھر جبرئیل کی آمد چاہے اپنی اصلی شکل وصورت میں ہو یا بشکل انسانی مگر صاحب روح المعانی نے نقل کیا ہے کہ "تلقی بالقلب" عام ہے، خواہ منام میں ہو یا بیداری میں یوں وحی کی کل تین اقسام رہ جاتی ہیں۔ 1۔ تکلم بلاواسطہ 2۔ تکلم بواسطۂ ملک 3۔ تلقی بالقلب (خواب یا بیداری میں ہو)[2]

فقہاء احناف کے ہاں وحی کی دو اقسام ہیں وحی ظاہر اور وحی باطن وحی باطنی سے مراد نبی کا اجتہاد ہے جس پر نبی کو برقرار رکھا جاتا ہے۔[3]

وحی ظاہری کو امام فخر الاسلام بزدوی نے تین اقسام میں بیان کیا ہے:

1۔ فرشتے کا بالمشافہ بیان کرنا۔

2۔ بغیر بیان کے فرشتے کا واضح اشارہ کرنا جس کی تعبیر "نفث فی الروع" سے کی گئی ہے۔

3۔ الہام یعنی اشارے اور زبانی عبارت کے بغیر قلب میں کسی چیز کا القاء کرنا، مگر نبی کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ رب العزت کی جانب سے ہے۔[4]

یہاں الہام کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ وحی ظاہر کی قسم ہے جیسا کہ فخر الاسلام بزدوی کی رائے ہے۔ یا یہ الہام وحی باطن میں داخل ہے۔ جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی کی رائے ہے۔ شیخ قوام الدین اتقانی شمس الائمہ سرخسی

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1/153- 154، قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، 1/312، ابن قیم، 1/1/35-36

[2] الآلوسی، سید محمود، روح المعانی، 13\58

[3] المرداوی، علی بن سلیمان، شرح التحریر، مطبوعہ مکتبۃ الرشد، سن اشاعت 1421ھ/2000ء، 3\295

[4] بزدوی، فخر الاسلام، اصول البزدوی مع شرح کشف الأسرار، مطبوعہ دارالسراج، 1437ھ/2016ء، 3\204

کی رائے کو ترجیح دے کر لکھتے ہیں کہ:(ما یثبت فی القلب بالألہام لیس بظاہر بل ھو باطن)[1] (جو چیز دل میں الہام کے ذریعے ثابت وہ وحی ظاہر نہیں بلکہ باطن ہوگی)

لیکن اگر وحی باطن کی تعریف "ماینال المقصود بہ بالتأمل فی الاحکام المنصوصۃ" ہو اور وحی ظاہر کی تعریف "ما ینال المقصود بہ لا بالتأمل فیھا" قرار دی جائے تو فخر الاسلام بزدوی کی رائے کو راجح قرار دیا جائے گا۔جب کہ علاوہ ازیں "تکلم فی لیلۃ الأسراء والمعراج" اور منام کا بزدوی وغیرہ نے ذکر نہیں کیا۔

علامہ ابن امیر الحاج کے ہاں "تکلم فی لیلۃ الأسراء" وحی ظاہر اور منام وحیٔ باطن میں داخل ہے۔[2] جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا ہے کہ الہام غیر انبیاء یعنی اولیاء کو بھی ہوتا ہے، انبیاء کے الہام کے حوالے سے تو یہ بات مسلم ہے کہ وہ حجت ہے البتہ الہام اولیاء کے بارے میں اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ احکام کے سلسلے میں حجت ہے اس قول کی نسبت صوفیاء کی جانب کی گئی ہے بلکہ اہل تشیع کے ہاں تو اس کے علاوہ اور کچھ حجت ہی نہیں۔

دوسرے قول کے مطابق الہام صاحب الہام کے حق میں تو حجت ہے کسی اور پر نہیں۔یعنی اس پر خود صاحب الہام کا عمل کرنا تو ضروری ہے مگر کسی اور کو دعوت دینی جائز نہیں ہے۔صاحب میزان نے اس قول کی نسبت جمہور علماء کی طرف کی ہے۔امام سہروردی، امام رازی اور ابن الصباغ نے بھی اس قول پر اعتماد کیا ہے۔

تیسرا قول یہ منقول ہے کہ یہ نہ صاحب الہام پر حجت ہے اور نہ کسی غیر پر اور یہی قول مختار ہے۔کیوں کہ غیر نبی کے حق میں ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، نفسانی خواہشات یا خیالات و وساوس نہیں ہیں۔[3]

امام حلیمی نے وحی کی چھیالیس صورتیں ذکر کی ہیں: حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ ان میں سے اکثر حامل وحی کی صفات و خصوصیات ہیں اور وہ تمام مذکورہ صورتوں میں شامل ہیں۔[4] علاوہ ازیں حافظ ابن قیمؒ نے بھی مراتب وحی کے عنوان کے تحت وحی کی آٹھ اقسام و مراتب ذکر کیے ہیں جو مذکورہ بالا اقسام کے ساتھ ملتی جلتی ہیں جن کا تذکرہ ماقبل میں تفصیلاً ہو چکا ہے۔[5]

---

[1] المرداوی، علی بن سلیمان، شرح التحریر، 3\296، السہیلیؒ، الروض الانف، 1/275

[2] المرداوی، علی بن سلیمان، شرح التحریر، 3\296

[3] الحلبی، ابن امیر الحاج، التقریر والتحبیر شرح التحریر، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، 1419ھ/1999ء، 3\296، 295

[4] العسقلانی، ابن حجر، حافظ، فتح الباری، 1\40

[5] الجوزی، ابن القیم، حافظ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، مئی 2015، 1\40-41

وحی کے حوالے سے سر سید احمد خان کی عقلیت پسندی:

سر سید احمد خان (1817ء-1898ء) جنہوں نے اپنے علم کلام سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کے جملہ احکامات عقل کے موافق ہیں اور قرآن حکیم میں کوئی حکم جدید ترقی و تمدن اور تہذیب کے مخالف نہیں۔ انہوں نے اپنے کلامی مؤقف اور افکار کا اظہار اپنی "تفسیر القرآن" میں کیا ہے جس کے لیے وہ اپنے مخصوص تجدد پسندانہ تفسیری اصول وضع کرتے ہوئے قرآن حکیم کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

ان تفسیری اصولوں کے مطابق اللہ رب العزت قادر مطلق اور حاضر وناظر ہے اور کل کائنات کا خالق ہے اس نے وقتاً فوقتاً انسانی رشد وہدایت کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث کیا جن میں آپؐ بھی شامل ہیں۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی مستند وحی اور کلام اللہ ہے۔ جو آپؐ پر بذریعہ جبرئیل بھیجا گیا یا اس کے الفاظ براہ راست قلب نبوی ﷺ پر نازل ہوئے، اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے وحی کسی بھی پیغمبر کی داخلی کیفیت یا فطری ملکہ کا نام نہیں بلکہ اس کا نزول خارج سے بذریعہ فرشتہ ہوتا ہے چنانچہ تمام آسمانی کتب وصحائف اور عقل اس کی تصدیق کرتے ہیں۔[1]

وحی ونبوت کے حوالے سے سر سید کی افکار وخیالات پر مستشرقین کے نظریات نے گہرا اثر ڈالا اور وہی سر سید جنہوں نے (WilliamMuir) کو "خطبات احمدیہ" میں زبردست تردیدی جواب دے کر اپنا سب کچھ قربان کرنے اور کنگال ہو کر مرنے کو دارین کی سعادت سمجھا تھا، اپنی "تفسیر القرآن" میں وہ وحی ونبوت کے حوالے سے جو نظریات ومؤقف پیش کرتے ہیں اس کی کڑی مستشرقین سے جا کر ملتی ہے۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نبوت ایسی فطری چیز کا نام ہے جو انسان کے اندر اس کی دیگر صفات کی مانند خلقی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس فطری صفت کے مختلف نام ہیں جیسے ہدایت کامل کی فطرت، ملکۂ نبوت، جبرئیل اعظم وغیرہ۔ اللہ رب العزت اور نبی کے مابین سوائے اس ملکہ نبوت کے جو کہ جبرائیل کہلاتا ہے کوئی پیغامبر یا قاصد نہیں ہوتا نبی کا قلب ہی وہ آئینہ ہے جس میں انوارات خداوندی کا بھرپور جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ خود ہی ایسی مجسم چیز ہے کہ جس میں سے کلام الٰہی کی آوازیں نکلتی رہتی ہیں اور خود ہی ایسا کان ہوتا ہے جو اللہ کے بے حرف وصوت کلام کو سنتا ہے۔ پیغمبر کے قلب سے وحی فوارہ کی طرح اٹھتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے۔ اسی کا عکس قلب پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے۔ اس کو بلواتا کوئی نہیں خود بولتا ہے اور خود الفاظ سے اس مفہوم کو ادا کرتا ہے:

{ وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ}

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1/268

وہ اپنا کلام خود یوں سنتا ہے جیسے کوئی اور شخص اس سے ہم کلام ہو اور وہ خود کو ان ظاہری آنکھوں سے یوں دیکھتا ہے جیسے کوئی اور شخص اس کے سامنے کھڑا ہو۔ چنانچہ ان کے ہاں وحی وہ چیز ہے جسے پیغمبر کے قلب پر فطرت نبوت کے سبب مبدأ فیاض نے مرتب کیا ہے یہی وہ نقش قلبی ہے جو کسی وقت بولنے والے کی طرح ظاہری کانوں سے سنائی دیتا ہے اور کبھی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے لیکن سوائے اپنی ذات کے نہ وہاں کوئی آواز ہوتی ہے اور نہ بولنے والا اور جسے تمام انسانی ملکات کسی معاملے کے پیش آنے پر اپنا عمل شروع کرتے ہیں ایسے ہی ملکۂ نبوت بھی کسی خاص معاملے کے باعث فعال ہو جاتا ہے۔[1]

مذکورہ بالا خیالات جدید مستشرقین کے مؤقف کے قریب ہیں جن کے مطابق کشف و الہام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داخلی کیفیت کا نام ہے جو کہ (معاذ اللہ) غلطی سے نبیؐ نے وحی سمجھ لی۔ نزول وحی کو نبیؐ کی داخلی کیفیت اور فطری ملکہ سے تعبیر کرنے ک

ے باعث سر سید نے ختم نبوت کے حوالے سے بعض ایسے نظریات کا اظہار کیا ہے جس سے نبوت کے جدید باطل مدعیان نے بھی فائدہ اٹھایا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی وحی کو ایک فطری ملکہ قرار دے کر اپنے دعوے کی تائید کے لیے دلائل دینے شروع کیے کہ نبی کی متابعت سے آدمی کا فطری ملکہ فعال ہو سکتا ہے اور وہ نبی کی مانند ہی وحی بھی پا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام و مخاطب ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔[2]

وحی سے متعلق جدید مستشرقین کے شبہات:

وحی کی کیفیت و حالات کے بیان میں مستشرقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے حوالے سے دریدہ دہنی اور ہرزہ سرائی سے کام لیتے ہوئے بہت بے بنیاد قسم کے اعتراضات سے وحی کی کیفیت اور حجیت و استناد کو جہاں مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو بھی مختلف فیہ کر کے معاشرے میں آپؐ کے سماجی مقام کو کم کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

عہد حاضر کے مستشرقین نے اپنے اس رویے میں مہذب تبدیلی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی بھی اشکال پیدا کرنے سے قبل اس کی بنیاد قرآن، حدیث، سیرت یا تاریخ کی کتب میں تلاش کرنے کے بعد کوئی معمولی اشارہ یا رائی کے دانے کے برابر موقع کو ایک پہاڑ بنا کر پیش کر کے قرآن و سنت اور وحی کو مشکوک بنانے کی جسارت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

---

[1] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن مع اصول تفسیر، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، 1995، ص، 525

[2] قادیانی، غلام احمد، مرزا، تفسیر سورۃ الفاتحہ، ربوہ، دار المصنفین، ص 26،25

کیفیات نزول وحی کے سلسلہ میں ذیل کے معاملات پر مستشرقین[1] نے بحث کی ہے، جب کہ سرت نگاروں[2] کی اولین وضاحتیں تفصیل سے مذکور ہیں:

1۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ کا فرشتوں کو دیکھنا۔

2۔ سیدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا آپؐ کے سر پر بادل کو سایہ فگن دیکھنا۔

3۔ سیدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی روایت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کو فرشتوں نے چاک کیا۔

4۔ نزول وحی کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک اور جسم مبارک کے حالات کا تغیر و تبدل۔

5۔ مشرکین مکہ کا آپؐ کو مجنوں کہنا۔

شق صدر کا واقعہ سیرت و احادیث کی اکثر کتب میں موجود ہے[3] اور اس کے علاوہ واقعہ معراج سے متعلقہ احادیث میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ نکلسن نے اپنی کتاب A Literary History of the Arabs اور ولیم میور نے اپنی کتاب Life of Muhammad میں شق صدر کے واقعہ کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے ایک حدیث کے ٹکڑے کا سہارا لیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

(قالت وقال فی ابوه یا حلیمة لقد خشیت ان یکون هذا الغلام قد اصیب فالحقیه باهله)[4]

(حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ نے کہا کہ اس کے باپ نے مجھ سے کہا کہ اے حلیمہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس بچے کو کچھ ہو نہ جائے لہذا بہتر یہی ہے کہ آپ اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچادیں)

اس کا پہلا غلط مفہوم ڈاکٹر پوکاک (Edward Pococke: 1604-1691) نے نکالا۔ اس نے تاریخ ابو الفداء کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرکے مذکورہ بالا حدیث کا نہ صرف غلط ترجمہ پیش کیا بلکہ حدیث کی اصل عبارت کو بھی خراب کرکے رکھ دیا۔ جب سر سید احمد خان نے سن 1972ء میں آکسفورڈ سے شائع شدہ اس ترجمہ کو دیکھا اور

---

[1] Sprenger, *Life of Muhammad*, Allahabad: Presbyterian Mission 1851, p: 90-91

R. A. Nicholson, *A Literary History of the Arabs*, Routledge 1907, p: 120-130

[2] ابن ہشام، عبد الملک الحمیري، السیرۃ النبویہ، مطبعہ مصطفی البابي الحلبي، مصر، 1955ء، 1/235

البخاري، الجامع الصحیح، باب کیف کان بدء الوحي إلی رسول اللہ، دار طوق النجاۃ، 1422ھ، 1/7.

[3] عرجون، محمد الصادق، محمد رسول اللہ منہج و رسالۃ، مطبوعہ دار القلم، کویت، 2017ء، ص143،، السہیلیؒ، الروض الانف، 1/179

[4] محمد رضا، محمد رسول اللہ، دار الکتب العلمیہ بیروت 1975ء، ص25

مذکورہ عبارت و ترجمہ ان کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اپنی کتاب میں اس کے لاطینی زبان کے مفہوم کا اردو ترجمہ درج کیا۔ مذکورہ چھاپے میں یہ عبارت یوں لکھی ہے لاطینی زبان سے اردو میں اس کا ترجمہ یوں ہے: تب حلیمہ کے خاوند نے کہا کہ مجھے بہت ڈر ہے کہ اس بچے نے اپنے کسی ساتھی سے دماغی بیماری کو لے لیا ہے اس لیے اس کو حلیمہ سے لے کر اس کی والدہ آمنہ کے پاس لے گیا۔[1]

مذکورہ بالا ترجمہ جو ڈاکٹر پوکاک کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان سے ناواقف تھا جب کہ عربی عبارت بھی "قد اصیب فالحقیہ بأھلہ" کی بجائے "قد اصیب بالحقیۃ باھلہ" لکھی ہے۔ لہذا جو شخص عبارت کو غلط لکھ سکتا ہے اس سے اس عبارت کے درست ترجمے کی توقع کیسے رکھی جاسکتی ہے کیوں کہ عربی عبارت میں جو فعل یہاں "اصیب" استعمال ہوا ہے اس فعل مجہول کا کسی بھی ترکیب سے یہ ترجمہ نہیں کیا جاسکتا کہ "اس نے بیماری کو اخذ کر لیا ہے یا لے لیا ہے" اور عربی عبارت کے کسی بھی حصے یا جملے کا یہ ترجمہ نہیں بنتا کہ حلیمہ سعدیہ کا شوہر بچے کو حلیمہ سے لے کر اس کی والدہ آمنہ کے پاس لے گیا۔

اب یہاں مستشرقین جو مشرقی زبانوں کے ماہرین ہونے کے دعویدار ہیں ان کی عربی دانی اور لسانی مہارت کا عالم یہ ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس قسم کے مترجم کو جسے عربی زبان کے درست نقل کا سلیقہ بھی معلوم نہ ہو، اس کو قابل اعتناء ہی نہ سمجھا جاتا مگر افسوس صد افسوس کہ وہ ترجمہ آنے والے بعد کے مستشرقین نے خوب اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف استعمال کیا۔

اس کے علاوہ ولیم میور (William Muir) نے پوکاک سے بھی بڑھ کر جہالت کا ثبوت دیا اور اس نے اپنی کتاب "Life of Mohammad" میں کتاب کے حاشیے پر لفظ اصیب کی بجائے امیب لکھا (یعنی صاد کی جگہ میم) اور اس کے معنی "Fit" یعنی عارضہ ہونے کے تحریر کیے۔[2]

چنانچہ اس نے لفظ "اصیب" اور پوکاک نے "با- قیۃ" کے الفاظ گھڑ کر عربی لغت میں جدید اضافہ کر کے ان خود ساختہ اور من گھڑت الفاظ سے (معاذاللہ) آپ ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیا اور ان کی یہ تحقیقات بعد کے مستشرقین کے لیے ماخذ و مرجع قرار پائیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ جو مستشرقین کے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی کے حملوں کے سراغ لگانے کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ یہ روایت ہے کہ جس میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ بادل

---

[1] سرسید، احمد خان، سیرت محمدی، مکتبہ الکوثر کراچی، س ن، ص 230

[2] ایضاً، ص 230،231

آپؐ پر سایہ کیے ہوئے ہیں وہ اس منظر سے خوف میں مبتلا ہو گئیں۔[1]

مستشرقین نے نزول وحی کے وقت آپؐ کی حالت و کیفیت پر بھی بحث کی ہے اور کفار مکہ والا مجنون کا الزام بی دہرایا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ آپؐ پر اس الزام کو لگانے والوں نے خود اپنے عمل کے ذریعے اس الزام کی تردید کر دی تھی اور جس پیغمبر اسلامؐ کو انہوں نے مجنون و ساحر جیسے القابات سے نوازا تھا بعد میں انہوں نے خود انہی کے دامن سے وابستہ ہونے کو اپنے لیے راہ نجات و فلاح سمجھا اور حالت کفر میں اسلام کے خلاف اپنی تمام تر جدوجہد کا ازالہ و کفارہ ادا کرتے ہوئے اسلام کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر پیش پیش رہے۔

مذکورہ بالا دلائل کو اگر منصفانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مستشرقین کی کسی دلیل میں عقلی و منطقی لحاظ سے بھی کوئی جان نہیں ہے اور نہ ہی ان اعتراضات کی کوئی بنیاد ہے اگر فرشتے کو دیکھنے سے حضرت آمنہ مریض قرار پاتی ہیں تو کیا مستشرقین ان سب لوگوں کے لیے کیا فیصلے کریں گے جن کے بارے میں بائبل میں ذکر ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو دیکھا تھا اور وہ ان سے ہم کلام ہوئے۔[2]

اسی طرح حالت وحی میں آپؐ پر رعب و دبدبہ کی کیفیت کا طاری ہونا ایک قدرتی بات تھی کیوں کہ کلام خداوندی کوئی معمولی چیز نہیں ہے، قرآن نے اسے قول ثقیل[3] قرار دیا ہے۔ یہ بات بدیہی و عقلی طور پر قرین قیاس ہے کہ قلب انسانی پر جب بھی رب کریم کا کلام نازل ہوتا تو وہ رب کے جلال سے کانپنے لگتا ہے یہاں تو حیرت زدہ بات یہ تھی کہ آپؐ پر کلام اللہ کے نزول کے موقع پر کوئی خوف و ہیبت اور رعب و دبدبہ کی صورت میں آپؐ کی حالت و کیفیت میں تبدیلی کے کوئی اثرات نمودار نہ ہوئے۔[4]

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کی تجلی کوہ طور پر پڑتے ساتھ ہی موسیٰ نے جب اس جانب دیکھا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے[5]۔ جب کہ آپ ﷺ تو حالت وحی میں نہ کبھی گرے اور نہ ہی کبھی آپؐ بے ہوش ہوئے اور آپؐ پر وحی مختلف صورتوں میں نازل ہوا کرتی تھی جن میں سے سب سے مشکل ترین صورت آپ کو گھنٹی کی آواز کی طرح آواز سنائی دینا تھا۔

ایسی سخت صورتحال میں شدید سردی کے موسم میں بھی آپؐ کی پیشانی مبارک پسینے سے شرابور ہو جاتی تھی

---

[1] سرسید، احمد خان، سیرت محمدی، ص230

[2] ابن قیم ،زاد المعاد، 1/1

[3] المزمل:5، الحشر:21، السہیلی، ابوالقاسم، الروض الأنف، 1\153-154

[4] أیضا:1/154

[5] الاعراف:143

اور اگر آپؐ اس دوران کسی اونٹنی پر سوار ہیں تو وہ اونٹنی بھی وحی کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی تھی۔ تبھی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ دورانِ نزول وحی آپؐ کی ران مبارک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر تھی تو زید رضی اللہ عنہ یہ محسوس کرنے لگے کہ شاید ان کی ران ٹوٹ جائے گی۔[1]

مستشرقین کے ہاں آپؐ کا نزول وحی کا دعوٰی کرنا کوئی عجیب بات نہ تھی اور جس حالت کو آپؐ نزول وحی کی حالت قرار دیتے تھے اس قسم کی کیفیات سے آپ بچپن میں بھی گزر چکے تھے۔۔۔ دوروں نے آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ آپ خود پر نزول وحی کا دعوٰی کریں اور آپؐ کے پیروکاروں نے بھی آپؐ کی ان کیفیات کو دیکھ کر آپؐ پر نزول وحی کا یقین کر لیا۔

ولیم میور (William Muir)، علمائے اسلام[2] کی آراء کا مطالعہ بھی کرتا رہا ہے، تاہم اس کے باوجود، اس کے ہاں کچھ موقع ایسے آتے جب آپؐ کی بے قراری وجد یا کشف کی صورت اختیار کر لیتی اور وہ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ اس کی تفصیلات سے میں بہت کم واقف ہوں جب کہ بعض عیسائی مصنفین نے ان کیفیات کو مرگی دورے قرار دیا ہے اور ان کا تعلق آپؐ کے بچپن کی علامات سے جوڑا ہے۔[3]

دوران نزول وحی چہرے کے آثار میں تبدیلی اور پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے کا ذکر احادیث میں مذکور ہے۔ ولیم میور (William Muir) نے یہاں یہ اضافہ کیا ہے کہ آپؐ حالت وحی میں یوں زمین پر گر پڑتے تھے جیسے کوئی شخص وجد کی حالت میں گر پڑتا ہے اس بات سے اس نے یہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ زمین پر گرنے والی بات بھی حدیث سے ثابت ہے۔

جہاں تک ان مستشرقین کے ایسے دعوؤں کا تعلق ہے تو ان کو اس لحاظ سے بھی بے بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے کہ جدید میڈیکل سائنس کے ثابت شدہ حقائق کے ذریعے مرگی کی علامات نے تردید کر دی ہے۔[4]

معروف جرمن شاعر گوئٹے (Gothe: 1750-1832) نے اسی قرآن کو پڑھا اور اس کلام الٰہی نے اس کے دل و دماغ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس نے جرمنی اور لاطینی تراجم قرآنی کا مطالعہ کیا۔ بار بار پڑھنے کے بعد ان

---

[1] الازہری، پیر کرم شاہ، ضیاؤالنبیؐ، مکتبہ ضیاء القرآن، لاہور 1418ھ، 2\199

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: السہیلی، ابو القاسم، الروض الأنف، 1\153-154، بزدوی، فخر الاسلام، اصول البزدوی مع شرح کشف الأسرار، مطبوعہ دارالسراج، 2016ء، 3\204

[4] وجدی، محمد فرید، دائرہ معارف القرآن العشرون، مکتبہ علمیہ جدیدہ بیروت، 5\468،
فنک اینڈ ویگنلز نیو انسائیکلوپیڈیا، فنک اینڈ ویگنلز پبلیشرز امریکہ، 1995م، 9\320

قرآنی آیات کا انتخاب کیا کہ جنہوں نے اپنی علمی اور ادبی رفعتوں اور بلاغت وفصاحت سے اس کو ورطہ حیرت میں مبتلا کیا۔[1]

حیرت کی بات یہ ہے کہ (William Muir) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہاں مرگی کا الزام لگانے میں سر فہرست ہے مگر دوسرے مقام پر وہ اس بات کا معترف بھی ہے کہ آپؐ ہمیشہ ساری زندگی صحت مند رہے چنانچہ وہ کہتا ہے:

He never but once had suffered from any serious illness.[2]

چنانچہ اس الزام کے حوالے سے نامور مغربی مؤرخ گبن (Gibbon) لکھتا ہے:

Till the age of sixty,-three years the strength of ,Mohammad was equal to the temporal, and spiritual fatigues of his mission, his epileptic fits,, an absurd clumny of the greeks, would be an object of pity rather ,than abhorrence.[3]

(تریسٹھ سال کی عمر تک محمدؐ کی طاقت ان کی زندگی کے فرائض کی جسمانی اور روحانی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ آپؐ کے مرگی کے دوروں کے حوالے سے یونانیوں کی غیر معقول تہمت آپؐ کے لیے نفرت کے بجائے رحم کے احساسات پیدا کرے گی)

انگریز مذہبی پیشوا جان ڈیون (John-Davenport: 1597-1670) نے واضح کیا ہے کہ آپؐ کے حوالے سے تواتر کے ساتھ مرگی کے عارضے کے لاحق ہونے کا بیان، یونانیوں کی ایک ذلت آمیز اختراع ہے انہوں نے اس عارضہ کے لحوق کو ایک مذہب کے بانی کے ساتھ بایں وجہ منسوب کیا تھا کہ ان کے اخلاقی کردار وچال چلن پر ایک دھبہ ہو جو عیسائیوں کے لیے طعنہ زنی اور نفرت کا باعث ہو۔[4]

---

[1] زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، المجلس الأعلی للشؤن الأسلامیہ 1965، ص182، 181

[2] William Muir, *Muhammad and Islam*, p:24

[3] Gibbon,*The History of the Decline and Fall of the Roman Empire*, 1976, 5/270

[4] John, Devid, *Appology for Muhammad and Quran*, Dary & Sons London, p:246

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ ثابت ہورہا ہے کہ آپؐ کی بہترین صحت، مختلف شعبہ ہائے زندگی میں آپؐ کی مدبرانہ اور حکمت عملی سے بھرپور مساعی، نہایت کٹھن ترین حالات اور مشکلات میں آپؐ کا صبر واستقامت اور عظیم کارہائے نمایاں جو آپؐ کی حیات طیبہ کا روشن پہلو ہیں، آپؐ کو مرگی کا مریض قرار دینے والوں کی عقلوں پر سوالیہ نشان مرتب کررہے ہیں جو بغض وعناد اور مذہبی تعصب وحسد کے علاوہ کچھ نہیں۔[1]

نزول وحی کے حوالے سے مستشرقین میں سے ایک نمایاں نام تھیڈور نولڈیکے (Theodor Noldeke: 1836-1930) کا ہے جو جرمنی کا تھا اور اس نے تاریخ قرآن پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کا مقالہ "The History of Quran" کے نام سے انگریزی زبان میں شائع ہوا جو کہ اصلاً لاطینی زبان میں تھا۔ نولڈیکے کو جرمن مستشرقین کا شیخ (Leader) بھی کہا جاتا ہے۔ وہ فرانس میں علوم شرقیہ کا پروفیسر رہا ہے۔ اس کی مذکورہ بالا کتاب مستشرقین کے ہاں مصدر ومأخذ کا مقام رکھتی ہے۔

نولڈیکے Noldeke کے ہاں قرآن حکیم پیغمبر اسلامؐ کی ذاتی تصنیف ہے اور وحی آپؐ سے ایک ناقابل کنٹرول ہیجانی کیفیت میں صادر ہوتی تھی جسے وہ Uncontrolable Excitement کا نام دیتا ہے۔ وحی نبی علیہ السلام سے خود اپنی ذات سے صدور کرتی ہے اور اس کا نزول آسمان سے نہیں تھا جب کہ اس کی دلیل اس نے یہ پیش کی کہ حضور علیہ السلام بے خوف ونڈر شخصیت کے حامل ایک وژنری انسان تھے۔ غارِ حرا کی مجاہدانہ ریاضتوں اور مشقتوں نے ان کے دماغ کو جلا بخشی تھی۔ آپؐ چونکہ یہودیت وعیسائیت سے متعلق پہلے سے معلومات رکھتے تھے اور وحی، جبرئیل، کتاب وغیرہ جیسے تصورات سے گہری واقفیت تھی چنانچہ ایسے حالات میں ان سے وحی ایسے صادر ہوتی تھی جیسے شعراء کے سینوں سے اشعار نکلتے ہیں اگرچہ شاعر اپنے شعر کو ذاتی تخلیق سمجھتا ہے مگر آپؐ اپنی ذات سے صادر ہونے والے کلام کا درست تجزیہ نہ کرپائے اور ان کا خود سے صادر شدہ کلام وہ اپنی زاہدانہ طبیعت اور بھولے پن کی وجہ سے وحی خداوندی سمجھ بیٹھے۔[2]

اس کے اس اعتراض کا اگر جائزہ لیا جائے تو قرآن حکیم میں بھی اور اس سے ہٹ کر بھی بہت سے دلائل وبراہین ایسے ہیں جو اس کے ان نظریات کو باطل قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ وحی کا باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انفعالی (Passive) خصوصیات واحوال تھے اور اگر وحی کا مصدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1/285

[2] Theodore Noldeke, *The Quran: An Introductory Essay*, USA, Biblical Research Institute, 1992, p:5

ہوتی تو جب منافقین نے سیدہ عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو آپؐ اپنی شدید خواہش کے باوجود کہ جلد از جلد ان سے یہ الزام صاف ہو جائے اور آپؐ کی محبوب ترین اہلیہ برأت اختیار کر سکیں۔[1]

مگر چونکہ آپؐ اس معاملہ میں بے بس تھے اور آپؐ کے اختیار سے باہر کی بات تھی جس کے باعث آیات برأت کے نزول میں کم و بیش ایک ماہ لگ گیا اور آپؐ تب تک شدید ذہنی اذیت اور الجھن کا شکار رہے۔ اسی طرح کفار مکہ نے جب آپؐ سے اصحاب کہف، سکندر ذوالقرنین اور روح کی حقیقت کے حوالے سے سوال کیا تو آپؐ نے فوراً وقت پر جواب دینے کی بجائے وحی کا انتظار کیا جس کے باعث آپؐ کو طعن و تشنیع کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اگر آپ کے اختیار میں وحی ہوتی تو جواب فوری طور پر آپ ﷺ دے دیتے۔

قرآن کی داخلی شہادتوں کے علاوہ ان تمام قرائن اور دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وحی کا مصدر آپؐ کی ذات نہ تھی بلکہ یہ خارج میں تھی اور وہ بھی آسمان میں جو آپؐ کے اختیار سے باہر تھا۔ جب کہ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں بیشتر آیات اس امر پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ کلام آپؐ کی ذاتی تصنیف نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

ولیم کلیر ٹزڈال William St. Clair Tisdall (1859-1928)ء جس کا تعلق انگلینڈ سے تھا اور عربی کے ساتھ ساتھ کئی مشرقی زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ چرچ آف انگلینڈ کی جانب سے ایرانی مشنری سوسائٹی کا سیکرٹری بھی رہا۔ اس نے قرآن مجید پر Original Sources of Quran اور The Sources of Islam کے نام سے کتب لکھیں بالترتیب پہلی کتاب نیویارک، امریکہ سے 1905ء میں اور دوسری 1901ء میں اسکاٹ لینڈ سے شائع ہوئی۔

مستشرقین کے روایتی تصور کے مطابق وہ لکھتا ہے کہ قرآن حکیم آپؐ کی ذاتی تصنیف ہے اور اگر ہم سورتوں کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے جمع کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیش آمدہ واقعات و حالات میں بہت زیادہ مماثلت ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے وقتاً فوقتاً حسب موقع وحی گھڑتے رہتے تھے اور اپنے پیروکاروں کو یہ ظاہر کرواتے رہتے تھے کہ یہ آسمان سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل سے ہوئی ہے۔[2]

موصوف کا یہ اعتراض انتہائی لغو و باطل ہے اس لیے کہ قرآن حکیم کی آیات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال زندگی سے واقفیت بایں وجہ مکمل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اور ان کی امت کی راہنمائی چاہتے ہیں لہذا

---

[1]، السہیلیؒ، الروض الانف، 1/275

[2]William Clair Tisdall, *The Original Source of Quran*, London: 1905, p:6

حالات اور موقع کی رعایت رکھتے ہوئے آپؐ اور صحابہ کرام کی ضروریات اور مسائل کے مطابق وحی کا نزول ہوتا رہا اور یہ تو کسی بھی کلام کے ناقص ہونے کی دلیل ہے کہ اس میں مستقبل کے حوالے سے تو رشد و ہدایت کا سامان ہو مگر حال میں موجود آزمائشوں کے حوالے سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو۔

کلام اللہ کبھی بھی اپنے زمانہ نزول اور قوم کے مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔لہذا اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی جماعت کو درپیش مسائل سے مکمل خطاب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تصنیف نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اور معروف مستشرق آرتھر جیفری (Arthur Jeffery: 1892-1959) جس کا تعلق کینیڈا سے تھا اور یہ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں سامی زبانوں کا پروفیسر تھا۔ مشرق وسطیٰ کے اسلامی مخطوطات اور قرآن حکیم پر بھی اس کا کافی کام ہے۔ اپنی کتاب Material for the History of the Text of the Quran میں لکھتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید تحریری صورت میں موجود نہیں تھا۔ اس کے مؤقف کی بنیاد جو روایت ہے وہ یہ ہے۔

(قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يكن القرآن جمع فى شئ)[1]

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت قرآن حکیم کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا)

مگر یہ استدلال اس وجہ سے ٹھیک نہیں ہے کہ مذکورہ روایت میں قرآن کے ایک جگہ پر جمع ہونے کا مسئلہ مراد ہے نہ کہ کتابت یہاں مراد ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کتابی صورت میں مکتوب تھا جب کہ صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نبیؐ کی زندگی میں قرآن مجید کو تحریر کیا کرتے تھے اور چار صحابہ کرام جن میں ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن حکیم کو جمع کیا۔[2]

آرتھر جیفری یہ بھی کہتا ہے کہ نبیؐ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جیسے(Richard Bell)اور چارلس

---

[1]Arthur Jeffery, *Material for the History of the Text of the Quran*, UK: Brill,1937, p:5

[2] ابن قیم ،زاد المعاد، 1/48 -49 - 50

ٹوری(Charles CutlerTorrey)ءدونوں کا مؤقف ہے۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے آخری ایام میں ایک کتاب مرتب کر رہے تھے جو ان کے متبعین کے لیے تھی۔ واٹ(William Montgomery Watt) بھی یہی کہتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا جانتے تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ ایک تاجر تھے اور تجارت کے پیشے کی ضرورت میں لکھنا پڑھنا ضروری ہے لہذا آپ پڑھے لکھے تھے اور قرآن حکیم میں نبیؐ کے لیے امی کا لفظ جو استعمال کیا گیا ہے تو اس کے ہاں اس سے مراد "غیر یہودی" ہے نہ کہ ان پڑھ۔[1]
تاہم قرآن حکیم میں، خود قرآن سے متعلق ارشاد ہے،

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُواْ مِن قَبْلِهِۦ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَۖ إِذٗا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ﴾[2]

(اور آپ اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔اور اگر یوں ہوتا تو قرآن کا انکار کرنے والے ضرور شک میں پڑ جاتے)

مشہور فرانسیسی مستشرق ریجس لاشیر (Blachere: 1900-1973) ، جس نے مراکش سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1939ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد جامعہ سوربون میں پروفیسر رہا۔اس نے نص قرآنی کی حفاظت سے متعلق دلائل کو نظر انداز کر کے یہ دعوٰی کیا کہ قرآن حکیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں لکھا گیا اور نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدت خوف کا غلبہ رہتا تھا لہذا ایسا ہر گز ممکن نہ تھا کہ آپؐ وحی کو لکھوا سکتے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعوٰی بھی کرتا ہے کہ مسلمانوں اور یہود مدینہ کے مابین، جو تحریر و کتابت کے جملہ وسائل پر قبضہ کیے ہوئے تھے، شدید کشمکش اور لڑائی تھی لہذا بلاشیر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دور نبوت میں قرآن مجید کی مکمل تدوین نہیں ہو سکی اور صرف حافظے کے بل بوتے پر قرآن مجید کو مکمل طور پر محفوظ کرنا ناممکن تھا۔

قرآن کو کتابتاً محفوظ نہ کرنے کا اہتمام نہ ہونے کی اس کی بیان کردہ وجوہات حقیقت سے یکسر مختلف ہیں اور محض مفروضوں کی حد تک ہیں۔ جن کا عقلی و نقلی اور تاریخی لحاظ سے کوئی ثبوت نہیں۔ آپؐ نے قرآن کی تدوین کا جو اہتمام فرمایا وہ اس سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں تھا جو آپؐ نے یادداشت کے ذریعے قرآن کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا۔ آپؐ نے صحابہ کو ابتداء میں حدیث نبوی کی کتابت سے بھی اسی وجہ سے منع فرمایا کہ تنہا قرآن ہی کے لیے تمام وسائل استعمال میں لائے جاسکیں اور احادیث کا قرآن حکیم کے ساتھ اختلاط نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسلم شریف کی

---

[1] Watt, *Muhammad at Mecca*, UK: Oxford University Press.1960, p:52-53
[2] العنکبوت:48

حدیث میں آپؐ کا فرمان ہے:

(لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه وحدثوا عنی ولاحرج)[1]

بلاشیر ایک متعصب مستشرق ہے جس نے قرآنی نص کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ قرآنی مصدر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلیساؤں اور راہبوں سے اخذ کیا اور یہ کہ اس میں ذکر شدہ قصے اور کہانیاں اصلاً جزیرہ عرب کے مشہور افسانے تھے۔ اس قسم کے بے سروپا خیالات پیش کرنے والا شخص قطعاً معتدل اور انصاف پسند نہیں ہو سکتا۔

وحی اور قرآن مجید کے حوالے سے عقلی وکلامی انداز سے استدلال کرنے والوں میں سرفہرست جو مستشرق دکھائی دیتا ہے۔ وہ منٹگمری واٹ William Montgomery Watt ہے جو اپنے مخصوص طرز استدلال سے ایک غیر فطری ماحول پیدا کر کے قرآن وحدیث جیسے محکم اور راسخ مصادر کی تنقیص محض امکانات سے کرتے ہوئے وحی کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

What seems to man to come from outside himself, may actually come from his unconscious.[2]

(یعنی جو خیالات انسان خارج سے آتے ہوئے دیکھتا ہے وہ حقیقتاً اس کے ذاتی لاشعور سے پیدا ہوتے ہیں)

چنانچہ اس کے ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر سالہا سال کے ماحولیاتی عوامل کے اثرات سے ان کے جذبات کی دنیا اس قدر پختہ ہو گئی ہو کہ وہی جذبات ابھر کر وحی کی صورت میں ظاہر ہو گئے ہوں۔ مستشرقین چونکہ اسلامی تعلیمات بالخصوص قرآن وحدیث میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے مشن پر گامزن ہوتے ہیں اس لیے وہ بلا دلیل مؤقف اور دعوے پیش کرنے میں کوئی حجاب وعار محسوس نہیں کرتے۔

پروفیسر واٹ (Watt) رچرڈ بیل (Bell) کے حوالے سے کہتا ہے کہ قرآن حکیم اور الکتاب دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس کے خیال میں اپنے منصب نبوت کے آغاز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا گمان یہ تھا کہ ان پر جو وحی نازل ہو رہی ہے اس کا مجموعہ قرآن کی شکل میں ظاہر ہو گا مگر مدینہ میں ایک دوسالہ قیام کے بعد آپؐ کو "الکتاب" ترتیب دینے کا خیال آیا جس کو اپنی امت کے سامنے وحی کی صورت میں لے کر آنا آپ کا فریضہ تھا۔[3]

---

[1] القشیری، مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، 1\23، ابن قیم، زاد المعاد، 1/50 - 51

[2] Montgomery Watt, *Muhammad at Mecca*, p:80

[3] Watt , *Muhammad The Prophet and Statesman*, Oxford University Press, p: 17

یہاں واٹ (Watt) نے جو قرآن اور الکتاب میں فرق بیان کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد اور نا قابل اعتناء ہے اور بظاہر اس قدر بے سروپا فرضی مفروضوں کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے کہ اس کا کوئی جواب دیا جائے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں مقام ومنصبِ رسالت:

اللہ رب العزت کی طرف سے بندوں کی ہدایت وراہنمائی کے لیے مأمور کیے جانے کو "رسالت وبعثت" کہا جاتا ہے۔ منصب رسالت وہبی منصب ہے نہ کہ کسبی، اور جس کو اللہ رب العزت چاہتے ہیں اس اعلیٰ مقام ومنصب سے سرفراز فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَٱللَّهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهِۦ مَن يَشَآءُۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلۡفَضۡلِ ٱلۡعَظِيمِ ﴾[1]

(اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی:۔ ﴿ٱللَّهُ أَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهُۥۗ ﴾[2]

(اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کس کے حوالے کرے)

رسالت "ر س ل" کے مادے سے اسم مصدر ہے اور پیام، کتاب، پیغمبری اور بھیجنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح جسے ذمہ داری سونپی گئی ہو۔ اس کی جمع رسائل اور رسالات آئی ہے۔[3]

{واما الرسول فهو المرسل ، ولم يأت فعول بمعنى مفعل في اللغة الا نادرا. وارساله : أمر الله تعالى له بالأبلاغ الى من ارسله اليه؛ واشتقاقه من التتابع ؛ ومنه قولهم جاء الناس ارسالا ؛ إذا تبع بعضهم بعضا ، فكانه الزم تكرير التبليغ ، او الزمت الأمة اتباعه.}[4]

(رسول کا معنی مرسل یعنی بھیجے ہوئے ایلچی کے ہیں اور لغت میں فعول کے وزن پر آتا ہے اور مفعل کے وزن پر بہت کم آتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول بنانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ حکم ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے جن تک یہ حکم پہنچانا ضروری تھا۔ اس کا اشتقاق تتابع سے ہے یعنی مسلسل اور تکرار کے ساتھ کوئی کام کرنا اور اسی سے ہے ان کا یہ قول کہ یہ لوگ ارسالا آئے یعنی جب

---

[1] البقرہ:105

[2] الانعام:124

[3] الأفریقی، ابن منظور، لسان العرب، 1\162

[4] قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، 1/311

ایک دوسرے کے پیچھے آئیں۔ گویا تبلیغ کا بار بار کرنا ضروری ہے یا یہ کہ امت پر مسلسل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی لازم کر دی گئی ہے)۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی رشد وہدایت کے لیے جن برگزیدہ ہستیوں کے ذریعے اپنا پیغامِ حق مخلوق تک پہنچایا، انہیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے اور ان کے منصب کو نبوت اور رسالت کہا جاتا ہے۔ عقائد اسلامیہ کی رو سے ایمان بالرسالت کا مطلب سیدنا آدم سے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی تک جملہ انبیاء و رسل کی نبوت و رسالت کو برحق ماننا ہے۔ اس لیے کہ ہر نبی اور رسول اپنی اپنی جگہ اللہ کا بھیجا ہوا حق و صداقت کا مکمل نمونہ رہا ہے اور تمام انبیاء ورسل نے ایک مقصد و مشن کی تکمیل کے لیے حکم ربانی کے تحت کام کیا ہے۔

رسالت سے مراد وہ خاص رتبہ ہے جو رب کریم اپنے بعض اخصّ بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔[1] یہ اللہ اور بندوں کے مابین ایک سفارت کو کہتے ہیں جو اہل فہم و عقل کو ایسی باتوں پر متنبہ کرتی ہے، جہاں ان کی عقول رسائی سے قاصر ہوں یعنی صفات رب کریم، احوال معاد، مصالح دین و دنیا، جیسے محرکات جو باعث رشد وہدایت ہوں اور ایسے امور جو شبہات اور زندقہ کے لیے دافع ہوں۔

اسی طرح لفظ رسول لغت میں پیغامبر اور قاصد کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاحِ شریعت میں "رسول" سے مراد وہ شخصیت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات پہنچانے کے لیے منتخب فرمایا ہو اور پیغام رسانی کا منصب اس کے حوالے کیا ہو۔ عموماً نبی اور رسول دونوں ہم معنیٰ سمجھے اور بولے جاتے ہیں البتہ نبی اس ہستی کو کہا جاتا ہے جسے اللہ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے وحی دے کر بھیجا ہو اور رسول سے مراد وہ ہستی ہے جسے اللہ رب العزت نے جدید شریعت دے کر لوگوں کی طرف مبعوث کیا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی جانب بلائے۔[2]

چنانچہ اس حوالے سے قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-{ والصحيح ، والذي عليه الجماع الغفير ، إن كل رسول نبي، وليس كل نبي رسولا. واول الرسل أدم، وأخرهم محمد."}[3]

(اور صحیح بات جس ہر جمہور اہل علم کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ "ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے۔ سب سے پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)۔"

اسی طرح لفظِ نبی "نبأ" سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ "خبر" ہے۔ چونکہ نبی کا کام اللہ کی جانب سے خبر دینا

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1/91 - 92

[2] القسطلانی، احمد بن محمد، المواہب اللدنیۃ، 2\47، أیضا: 1/95 - 96

[3] قاضی عیاض، کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، 1/312

ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو نبی کو کہا جاتا ہے۔ بعض اہلِ لغت کے ہاں نبوت بمعنی الارتفاع سے ماخوذ ہے اور چونکہ مقامِ نبوت ایک بلند و بالا مقام ہے اس لیے اس کو نبی کہا جاتا ہے۔[1] بعض اہلِ علم کے ہاں یہ دونوں ہم معنیٰ ہیں اور دونوں کے درمیان میں کوئی فرق نہیں ہے۔[2] مگر اہلِ علم کا ترجیحی قول یہی ہے کہ دونوں کے مابین فرق ہے جس کی دلیل قول باری ہے:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٖ وَلَا نَبِيّٖ﴾[3]

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول اور نبی بھیجے یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول کا لفظ ذکر فرما کر پھر نبی کا ذکر بھی کیا ہے اور اگر فقط رسول سے نبی کا مفہوم ادا ہو سکتا تو اللہ تعالیٰ یہاں نبی کو علیحدہ ذکر نہ فرماتے۔ علاوہ ازیں جن احادیث میں انبیاء و رسل کی تعداد میں فرق بیان کیا گیا ہے ان سے بھی دونوں کے مابین فرق معلوم ہوتا ہے۔ امام احمد نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

(قلت يا رسول اللهﷺ، كم الانبياء؟ قالماية الف واربعة وعشرون الفاً، قال قلت يارسول اللهﷺ كم الرسل من ذلك؟ قال ثلاثمائة و ثلاثة عشر، جم غفير كثير طيب)

یہی روایت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی ابن مردویہ نے بھی نقل کی ہے۔ اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ:

(يا نبى الله، كم الانبياء؟ قال: مائة الف و اربعة وعشرون الفاً، الرسل من ذلك ثلاثمائة و خمسة عشر جماغفيراً)

پہلی روایت میں ابراہیم ابن ہشامؒ متکلم فیہ راوی کی وجہ سے علامہ ابن الجوزی نے اس رویت کو موضوع قرار دیا ہے۔ جب کہ دوسری روایت میں معان بن رفاعہ، علی بن یزید اور قاسم ابو عبد الرحمٰن شامل ہیں جو سب کے سب ضعیف ہیں۔[4] ان دو کے علاوہ متعدد مزید روایات بھی ہیں جن تمام کو ملانے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انبیاء اور رسل میں فرق ہے۔

---

[1] تھانوی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون، باب النون، فصل الہمزۃ، لفظ "النبی"، 2\1358

[2] أیضاً، باب الراء، فصل اللام، لفظ "الرسالۃ"، 1\584

[3] الحج:52

[4] ابن کثیر، اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، 1\586، 585

اس حوالے سے قرآن وحدیث کی کسی نص سے تو وضاحت ثابت نہیں البتہ اہلِ علم نے اپنے ذوق و فہم اور معلومات کے حوالے سے فرق بیان کیا ہے۔ چنانچہ کچھ حضرات کے ہاں رسول مامور بالتبلیغ ہوتا ہے بر خلاف نبی کے۔ بعض[1] کی رائے یہ ہے کہ رسول پر جبرئیل امین وحی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق رسول اسے کہتے ہیں جس کو مخصوص شریعت عطا کی گئی ہو اور سابق شریعت پر عمل کرنے کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اسی طرح ایک قول کے مطابق رسول وہ ہے جس پر کتاب نازل کی گئی ہو۔[2]

البتہ مشہور قول یہ ہے رسول سے مراد وہ پیغمبر ہے جس کو نئی کتاب اور نئی شریعت عطا کی گئی ہو اور نبی ہر پیغمبر کو کہتے ہیں چاہے اسے جدید شریعت عطا کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو بلکہ وہ پہلی شریعت اور کسی رسول کا متبع ہو۔ مذکورہ تعریف پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ تعریف جامع نہیں ہے، کیوں کہ بہت سے پیغمبر ایسے ہیں جنہیں نئی شریعت اور کتاب عطا نہیں ہوئی مگر قرآن مجید نے ان کو رسول کہا ہے۔ جیسے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَٱذۡكُرۡ فِي ٱلۡكِتَٰبِ إِسۡمَٰعِيلَۚ إِنَّهُۥ كَانَ صَادِقَ ٱلۡوَعۡدِ وَكَانَ رَسُولٗا نَّبِيّٗا ﴾[3]

(اور کتاب میں اسماعیل کو یاد کرو بیشک وہ وعدے کا سچا تھا اور غیب کی خبریں دینے والا رسول تھا۔)

جب کہ ان کو کوئی جدید شریعت، جدید کتاب یا صحیفہ عطا نہیں ہوا بلکہ وہ ملتِ ابراہیمی ہی کے متبعین میں سے تھے اور اسی کی تبلیغ کرتے رہے۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوسُفُ مِن قَبۡلُ بِٱلۡبَيِّنَٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِي شَكّٖ مِّمَّا جَآءَكُم بِهِۦۖ حَتَّىٰٓ إِذَا هَلَكَ قُلۡتُمۡ لَن يَبۡعَثَ ٱللَّهُ مِنۢ بَعۡدِهِۦ رَسُو ﴾[4]

(اور بیشک اس سے پہلے تمہارے پاس یوسف روشن نشانیاں لے کر آئے تو تم ان کے لائے ہوئے پر شک ہی میں رہے یہاں تک کہ جب انہوں نے انتقال فرمایا تو تم نے کہا: اب اللہ ہر گز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔)

---

[1] السہیلیؒ، الروض الانف، 1\121

[2] تھانوی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون، باب الراء المہملۃ، فصل اللام "الرسالۃ"، 1\584، أیضا: 1/123،122،124

[3] مریم:54

[4] المؤمن:34

سیدنا یوسف علیہ السلام کو بھی کوئی جدید شریعت یا کتاب عطا نہیں کی گئی تھی لہذا یہ حضرات رسول کی تعریف میں شامل نہیں ہیں جب کہ قرآن کریم کی وضاحت کے مطابق یہ حضرات رسول ہیں۔

اس اعتراض کا جواب یوں دیا جائے گا کہ اصلاً نبی ورسول کی تعریف یوں کریں گے کہ اللہ رب العزت کی جانب سے جو لوگ مخلوق کی ہدایت ورہبری اور اصلاح کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں اگر ان کو جدید شریعت وکتاب عطا کی گئی ہو یا کسی کافر قوم کی اصلاح وہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا ہو تو پھر وہ رسول کہلائیں گے اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی جدید شریعت وکتاب ان کو عطا نہیں ہوئی تو وہ نبی کہلائیں گے۔

سیدنا اسماعیل علیہ السلام ملتِ ابراہیمی کی اتباع اور تبلیغ کرتے رہے اور ان کو جدید کتاب نہیں ملی بلکہ صحیفہ ابراہیم ہی کی اشاعت کرتے رہے مگر اس وقت قبیلہ جرہم جو کفار پر مشتمل تھا یہ ان کی ہدایت و اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ اسی طرح سیدنا یوسف علیہ السلام ملت ابراہیمی کے متبع تھے مگر اہل مصر کے کفار کی جانب ان کو مبعوث کیا گیا اس لیے وہ رسول ہیں۔

اس کے بعد اگر آنحضرت ﷺ کی بعثت کے مقاصد ونتائج قرآن مجید میں جس مقام پر ذکر کیے گئے ہیں وہاں صریح طور پر ان چار چیزوں کا تذکرہ موجود ہے۔

1۔ تلاوتِ آیات

2۔ تعلیمِ کتاب

3۔ تعلیمِ حکمت

4۔ تزکیۂ نفوس

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ ٱلَّذِي بَعَثَ فِي ٱلۡأُمِّيِّـۧنَ رَسُولٗا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبۡلُ لَفِي ضَلَٰلٖ مُّبِينٖ ﴾[1]

(وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے)

اسی طرح بعثتِ نبوی کے ان مقاصد کی تائید ایک دوسری آیت کریمہ سے بھی ہوئی ہے جس میں اللہ رب العزت فرماتے

[1] الجمعۃ:2

ہیں کہ

﴿كَمَآ أَرۡسَلۡنَا فِيكُمۡ رَسُولٗا مِّنكُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمۡ تَكُونُواْ تَعۡلَمُو ﴾[1]

(جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے)

دراصل بعثتِ محمدی ان چاروں شعبوں پر مشتمل تھی اور آنحضرت ﷺ نے امت کے لیے ان تمام شعبوں کو زندہ کرکے اللہ رب العزت کی جانب سے خود کو کامل ترین نمائندہ اور رسول ثابت کیا جس کے نتیجے میں ان تمام شعبہ جات کی عملی تصویر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کی تیاری تھی۔ یوں تو رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ رسالت اور تعلیم ان تمام سعادتوں کا سرچشمہ تھی اور اسی سے یہ پوری زندگی اور قرنِ اول کا اسلامی معاشرہ معرضِ وجود میں آیا۔ مگر اس کے طریق عمل کی تفصیلات اور اس کے ذرائع ووسائل کو تحلیل کرکے دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ اس جدید معاشرہ اور جدید امت کی تشکیل کے عناصر وارکان تین چیزیں ہیں۔

1۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی، حیاتِ طیبہؐ اور سیرت واخلاق

2۔ قرآن کریم

3۔ آپ ﷺ کے ارشادات وہدایات، مواعظ ونصائح اور تعلیم وتلقین

چنانچہ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بعثتِ نبویؐ کے مقاصد ونتائج کے مکمل ظہور میں اور جدید امت کی تعمیر وتشکیل میں ان تینوں ارکان وعناصر کا گہرا دخل ہے اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ ان تینوں کے ماسوا ایک کامل معاشرہ مکمل زندگی اور ایسی ہیئت اجتماعی جس میں عقائد اعمال، اخلاق، جذبات، اذواق، رجحانات، تعلقات اور تمام چیزیں پائی جائیں وجود پزیر نہیں ہوسکتیں۔

واقعہ شق صدر اور اس پر اعتراضات کا جائزہ:

آنحضرت ﷺ کو جو نبوت عطا کی گئی اس میں چند واقعات ایسے ہیں جو نبوت ورسالت کی بنیاد کہلاتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ شقِ صدر کا بھی ہے۔ جس کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے رضاعی بھائی بیان کرتے ہیں کہ دو سفید مرد آپؐ کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کے شکم مبارک کو چاک کیا۔ ابن اسحاق

[1] البقرۃ:151

کی دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ کے پاس دو پرندے حاضر ہوئے۔ ایک پرندے نے اپنی چونچ سے حضور ﷺ کے پیٹ مبارک کو چاک کیا اور دوسرے نے اس پیٹ مبارک میں برف کی طرح کی کوئی چیز ڈال دی۔ چنانچہ علامہ ابو القاسم السہیلی صاحب الروض الأنف کہتے ہیں کہ ابن ابی دنیا کی مرفوع سند والی روایت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ہے، جس کا اردو مفہوم ذیل میں دیا جاتا ہے:

میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ کو کیسے علم ہوا کہ آپ نبی ہیں اور کس طرح آپ کو مکمل یقین ہوگیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! میرے پاس دو فرشتے اس وقت آئے جب میں وادی بطحاء میں تھا۔ایک زمین پر اتر آیا اوردوسرا زمین وآسمان کے مابین تھا پھرایک فرشتہ دوسرے سے گویا ہوا۔ کیا یہ وہی ہیں؟ اس نے کہا ہاں یہ وہی ہیں۔ پہلے نے کہا کہ ایک آدمی کے ساتھ ان کا وزن کرو اس نے ایک شخص کے ساتھ میرا وزن کیا اور میرا وزن اس سے زیادہ نکلا پھر اس کے ساتھی نے کہا اب دس افراد کے ساتھ ان کا وزن کرو جب دس افراد کے ساتھ میرا وزن کیا تو میں پھر بھی بھاری تھا پھر اس نے کہا کہ اب سو اشخاص کے ساتھ ان کا وزن کرو جب سو افراد کے ساتھ وزن کیاگیا تو میرا وزن پھر بھی زیادہ تھا پھر اسے ایک ہزار افراد کے ساتھ میرا وزن کرنے کے لیے کہا گیا تو میرا وزن ایک ہزار افراد سے بھی زائد تھا وہ پلڑا اس قدر اوپر اٹھ گیا کہ وہ افراد وہاں سے مجھ پر نیچے گرنے لگے چنانچہ ایک فرشتے نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان کا بطن مبارک شق کردو اس نے میرا پیٹ چاک کر دیا میرے قلب کو نکالا اس میں سے شیطان کا حصہ اور خون کا لوتھڑا باہر نکال دیا ایک فرشتے نے دوسرے سے کہا اب ان کے قلبِ انور کو یوں غسل دو کہ جیسے برتن کو دھویا جاتا ہے اور ان کے قلب مبارک کی یوں صفائی کرو جیساکہ چادر کو صاف کرتے ہیں پھر اس فرشتے نے کہا اب ان کے پیٹ مبارک کو سی دو اس نے میراشکم مبارک سی دیا اور میرے دونوں شانوں کے درمیان مہر لگادی جیسا کہ اب بھی وہاں مہرہے پھر وہ فرشتے وہاں سے واپس چلے گئے۔ مجھے اب بھی وہ منظر بالکل یاد ہے)[1]

مذکورہ بالا حدیث مبارکہ میں زیادہ وضاحت ہے کیوں کہ یہاں یہ بات ذکر ہے کہ فرشتے نے شیطان کا حصہ

[1] السہیلی، ابوالقاسم، الروض الأنف، 1\82، 81

اور خون کا لوتھڑا باہر نکالا گویا فرشتے نے اس چیز کی تلاش کی جو شیطانی حصہ ہوتی ہے اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کے بغیر ہر مولود میں پائی جاتی ہے مگر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام اپنی ماں کی دعا کے باعث محفوظ رہے:

﴿وَإِنِّيٓ أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ ٱلشَّيۡطَٰنِ ٱلرَّجِيمِ ﴾[1]

(اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے)

چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی اور وہ شیطانی ایذا رسانی سے محفوظ رہے جب کہ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق نفخہ روح القدس سے ہوئی تھی۔ یہاں سے یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ سیدنا عیسی علیہ السلام جناب رسول اللہ ﷺ سے افضل ہیں کیوں کہ آنحضرت ﷺ کے قلب اطہر سے وہ گوشت کا لوتھڑا نکال لیا گیا پھر روح القدس نے اس کو ثلج اور برد سے دھو کر حکمت و ایمان سے بھر دیا۔

مذکورہ حدیث سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ خاتم النبوۃ (مہر نبوت) کو حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ہی تخلیق کیا گیا یا پھر ولادت کے بعد یا بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت یہ مہر نبوت لگائی گئی۔ اس حدیث نے یہ عقدہ بھی حل کر دیا کہ مہرِ نبوت کب اور کیسے لگائی اور کس نے اس کو لگایا۔ چنانچہ ابوذر رضی اللہ عنہ کے اس سوال پر کہ آپ ﷺ کو کیسے پتہ چلا کہ آپ رسول اللہ ہیں تو آپ ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اس تمام کیفیت سے مطلع فرمایا۔

اس حدیث مبارکہ میں بعض رُواۃ کی جانب سے ایک وہم واقع ہوا ہے اور وہ آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ میں اس وقت بطحاء مکہ میں تھا جب کہ یہ واقعہ تب پیش آیا تھا کہ جب آپ ﷺ سیدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے گھر بنو سعد میں تشریف فرما تھے چنانچہ البزار نے اسی روایت کو عروۃ کی سند سے بیان کیا ہے اور وہاں بطحاء مکہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس روایت میں یہ ذکر بھی ہے کہ پھر میرے پاس سکینہ لایا گیا سکینہ کوئی سفید رنگ کی شے تھی اور پھر اسے میرے سینے میں انڈیل دیا گیا۔

مگر عروہ کی سماعت حضرت ابوذر سے ثابت نہیں ہے جب کہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذر سے فرمایا کہ (اے ابوذر! میرا چالیس آدمیوں کے ساتھ وزن کیا گیا ان چالیس آدمیوں میں تم بھی شامل تھے لیکن میرا وزن پھر بھی سب سے زیادہ تھا)[2]

---

[1] آل عمران:36

[2] السہیلی، ابو القاسم، الروض الأنف، 1\85،84

آنحضرت ﷺ کے سر مبارک پر تاجِ نبوت کب سجایا گیا؟ سیدنا میسرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے آپ سے یہ درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ کو نبوت و رسالت سے کب نوازا گیا؟ تو آپ نے فرمایا:: (مجھے نبوت اس وقت عطا کی گئی جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے)۔

ایک دوسری روایت کے مطابق آدم علیہ السلام مٹی میں گوندھے ہوئے تھے۔ شقِ صدر کی روایت آنحضرت ﷺ سے دو طرح منقول ہے۔ پہلی دفعہ حضور اکرم ﷺ کا سینہ اطہر تب چاک کیا گیا جب آپؐ اپنی رضاعی والدہ سیدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ آپؐ کے پاس سونے کے ایک طشت کو لایا گیا جس میں ثلج تھا اور اس کے ساتھ آپؐ کے قلب اطہر کو دھویا گیا۔

دوسری دفعہ شق صدر اس وقت پیش آیا جب آنحضرت ﷺ سفر معراج پر تھے تب آپؐ کے قلبِ اطہر کو آبِ زم زم سے دھویا گیا اور ایک سونے کا طشت لایا گیا جو حکمت و ایمان سے بھرا تھا اور طشت مبارک آپؐ کے قلبِ اطہر میں انڈیلی گئی بعض محدثین کے ہاں مذکورہ دونوں روایات میں تضاد ہے چنانچہ وہ اس لیے ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دیتے ہیں مگر ان کا یہ کہنا درست نہیں ہے اور یہ تقدیس و تطہیر دو دفعہ پیش آئی تھی پہلی دفعہ کم سنی میں آپؐ کا شقِ صدر ہوا تاکہ آپؐ کے قلب مبارک کو شیطانی لوتھڑے سے پاک کر دیا جائے اور وہ ہر طرح کے اخلاق ذمیمہ سے طاہر ہو جائے اور ہر طرح کے عیوب سے منزہ ہو سکے وہاں پر فقط توحید ہی ہو تبھی آپؐ نے فرمایا کہ جب فرشتے مجھ سے الگ ہوئے تو میں معاملے کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کر رہا تھا۔

دوسری دفعہ جب واقعہ شقِ صدر پیش آیا تو آپؐ اس وقت اس حریم ناز میں تشریف فرما تھے جہاں صرف آپؐ ہی جا سکتے تھے چنانچہ اس موقع پر چونکہ نمازوں کی فرضیت کا حکم صادر ہونا تھا اس لیے نماز چونکہ پاکیزگی پر مبنی عبادت ہے تبھی آپؐ کے ظاہر و باطن کی تطہیر و تقدیس کا اہتمام کیا گیا۔

جب پہلی دفعہ شقِ صدر ہوا تو آپؐ کے قلب مبارک میں یقین کا ثلج انڈیل دیا گیا تاکہ آپؐ کو رب کریم کی توحید اور اس امر کا بھرپور یقین ہو جائے جو آپؐ کے ساتھ مختص ہونے والا تھا اور جب دوسری دفعہ شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا تو تب آپؐ یقین کی منزل پر فائز تھے اور منصبِ نبوت سے بھی بہرہ مند تھے اور چونکہ اللہ کریم سے ملاقات کا شرف ملنے کے قریب تھا تبھی روح القدس نے آپؐ کے دل مبارک کو ماءِ عزم سے دھویا اور ویسے بھی یہ اسی روح القدس کا چشمہ تھا اور انہی کی ایڑی کا فیض تھا کہ آپؐ کے جد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے جاری ہوا۔ اس کے بعد حکمت و ایمان سے بھرا ہوا طشت لا کر آپؐ کے قلب مبارک میں انڈیل دیا گیا۔ حضور ﷺ کے ایمان میں اس سے پہلے بھی کوئی کمی نہ تھی مگر اس کا مقصد آپؐ کے ایمان کو بلحاظِ قوت مزید بڑھانا تھا۔ جیسا کہ:

﴿لِيَزْدَادُوٓاْ إِيمَٰنًا مَّعَ إِيمَٰنِهِمْ﴾[1]

(تاکہ ان کا ایمان مزید پہلے ایمان کے ساتھ بڑھ جائے)

اگر چہ یہاں پر اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایمان چونکہ اعراض میں سے ہے اور اعراض کا انتقال وہیں ممکن ہوتا ہے جہاں وہ قائم ہوتے ہیں اس لیے کہ انتقال اجسام کی صفت ہے اعراض کی صفت نہیں۔ مگر اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حکمت و ایمان کے اس طشت کی تعبیریوں کی جاسکتی ہے کہ جس طرح اس دووھ کی تعبیر علم سے کی گئی جس میں آپؐ نے کچھ نوش فرمایا اور بچا ہوا دودھ آپؐ نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

چنانچہ آپؐ کے قلب انور میں منتقل شدہ شے کو حکمت اور ایمان سے تعبیر کیا جائے گا چنانچہ پہلی دفعہ ثلج کو ثلج ہی سمجھا گیا مگر دوسری دفعہ ثلج کو جب بھرا ہوا دیکھا گیا تو اس کی تعبیر حکمت و ایمان سے کی گئی اور پہلی مرتبہ آپؐ کم سن تھے جب کہ دوسری دفعہ آپؐ کی بعثت ہو چکی تھی بائیں وجہ آپؐ کے یہ الفاظ دونوں مقامات پر آپؐ کے رتبہ و مقام کے غماز ہیں۔[2]

چنانچہ مستند احادیث سے اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ آپؐ کا سینہ مبارک چاک کیا گیا اور کم از کم تین صحابہ کرام جن میں مالک بن صعصعہ، ابوذر اور انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات احادیث میں ملتی ہیں۔ بعض حضرات پانچ مرتبہ شقِ صدر کے قائل ہیں بعض چار مرتبہ اور بعض کے ہاں یہ واقعہ آپؐ کے ساتھ دو مرتبہ پیش آیا۔[3]

چنانچہ جب آپؐ کی نبوت سب انبیاء کرام کی نبوت سے افضل اور دائمی ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ آپؐ کے اندر خصوصیات و جامعیت کو منتقل کرنے کے لیے اللہ رب العزت نے مختلف موقعوں پر بہت ساری تدابیر فرمائیں جن میں سے ایک شقِ صدر بھی ہے۔

اسی لیے قرآن وحدیث کی تعلیمات اور سیر و تاریخ کی کتب کے بہت سے واقعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بچپن سے جوانی تک اور پھر جوانی سے نبوت عطا کیے جانے تک غیبی طریقے سے آپؐ کی تربیت و نگرانی فرماتا رہا ہے اور (وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدَىٰ) سے اسی حقیقت کی جانب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے قرآن حکیم کے اندر شرح صدر کی آیات مثلاً : { فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن

---

[1] الفتح:4

[2] السہیلی، ابو القاسم، الروض الأنف 1\87

[3] العسقلانی، ابن حجرؒ، فتح الباری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیفیت فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء، 1\90

يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ} اور { أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ} سے بتکلف انشراح صدر کی بجائے شقِ صدر مراد لینے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا محققین نے رد کیا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ شقِ صدر کا واقعہ احادیث سے ہی ثابت ہے، قرآن حکیم سے اس کا یوں شرح صدر کو شقِ صدر قرار دینا کسی طور پر درست نہیں ہے چنانچہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:(حمل الشرح فی الآیة علی شق صدر ضعیف عند المحققین)[1](محققین کے ہاں ان آیات میں شرح کو شقِ صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے)

اسی طرح آنحضرت ﷺ کے دونوں شانوں کے مابین جو مہرِ نبوت لگائی گئی اس میں حکمت یہ تھی کہ جب آپؐ کا قلب مبارک حکمت و یقین سے لبریز ہو گیا تو یوں مہر لگا دی گئی جیسا کہ کسی تھیلی میں کستوری یا موتیوں کو بھر کر اوپر سے مہر لگائی جاتی ہے اس لیے کہ آپؐ وساوس شیطانی سے معصوم تھے تبھی یہ مہر آپؐ کے مبارک شانے کی ہڈی پر اس وجہ سے بھی لگائی گئی کہ شیطان انسانوں کے اندر وسوسہ اندازی کا آغاز یہیں سے کرتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے حوالے سے میمون بن مہران نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کی کہ اس کو وہ جگہ دکھائیں جہاں سے شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اسے ایک صاف و شفاف جسمِ انسانی دکھایا گیا وہ جسم اس قدر شفاف و سفید تھا کہ اندر سے بھی دکھائی دے رہا تھا اور شیطان مینڈک کی شکل میں کندھے کی ہڈی کے ساتھ تھا اس کی سونڈ مچھر کی سونڈ کی طرح تھی اور وہ اپنی سونڈ اس شخص کے قلب میں ڈال کر وسوسہ اندازی کر رہا تھا اور جیسے ہی وہ بندہ ذکر اللہ شروع کرتا تو شیطان دور بھاگ جاتا تھا۔[2]

شقِ صدر سے متعلق اشکالات:

لزلے ہزلٹن (Lesley Hazelton: 1945-2024)جو برطانوی نژاد امریکی شہری ہیں اور ایک مستشرق خاتون ہیں۔ کئی کتب کی مصنفہ ہے اس کی ایک کتاب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے حوالے سے بھی ہے۔ جس کا نام ہے۔The First Muslim-The Story of Muhammad

مذکورہ کتاب میں جناب رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والے بیانات کا ذکر ہے اور حقائق کو مسخ کر کے مذموم اعتراضات ذکر کیے ہیں مذکورہ کتاب پہلی مرتبہ 2013ء میں شائع ہوئی جس کے اندازِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ پر اپنے پیش رو(Predecessors) مستشرقین کے بہت گہرے

---

[1] الآلوسی، روح المعانی، 2\95

[2] السہیلی، ابو القاسم، الروض الأنف، 1\90

اثرات ہیں۔

موصوفہ نے واٹ (William Montgomery Watt)اور کیرن آرم سٹرانگ (Karren Armstrong: 1944) کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کئی مقامات پر آپؐ کی تعریف سے بھی کام لیا ہے مگر پھر اکثر مقامات پر شکوک وشبہات کرتے ہوئے ضعیف اور موضوع روایات کا سہارا لے کر نبی علیہ السلام کی سیرت پر تخیلاتی انداز میں کام کیا ہے۔ تین سو بیس صفحات کی اس کتاب میں کل 121 ابواب ہیں جس کو مصنفہ نے کل تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کے نام علی الترتیب یتیم (Orphan)، جلاوطنی (Exile)اور قائد(Leader)رکھا ہے۔

ان کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیگر کئی مستشرقین کی طرح وہ بھی آپؐ کو بانیٔ اسلام وجدید مذہب سمجھتی ہیں حالانکہ آپؐ جدید دین کے بانی اور ایجاد کنندہ نہیں بلکہ انبیاء کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں اور آپؐ خاتم النبیین ہیں موصوفہ اپنی کتاب میں دیگر اعتراضات کے علاوہ نبوت، وحی اور معجزات جیسے بنیادی موضوعات سیرت کے باب میں یوں رقمطراز ہیں:

> A man navigating between idealism and pragmatism, faith and politics, non-voilence and violence[1]۔
>
> (کہ آپؐ معاذاللہ ایسی شخصیت ہیں جو ساری زندگی تصوریت وعملیت، مذہب وسیاست اور عدم تشدد اور تشدد ہی کے درمیان بھٹکتے رہے)

چنانچہ موصوفہ کی تمام تر کوشش اس کتاب سے آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو مشکوک اور داغدار بنانا ہے اور اس نے تقریباً ہر واقعے کی اصلی حیثیت کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے آپؐ کی کردار کشی کی انتہا کی ہے،

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی سباعی مستشرقین کے اسی طرزِ فکر کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ مستشرقین کی فکری پسماندگی اور نفسیاتی الجھن و خلجان کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ آپؐ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے اور یہ عدم تصدیق ہی ان کی تمام حیلہ سازیوں اور کذب وافتراء کا منبع ہے۔[2]

لزلے معجزات کے حوالے سے شدید اختلافات و تحفظات میں مبتلا ہیں اور آپؐ کو عام انسانوں کی سطح پر لانے کی کوشش کرتی ہے وہ صرف چند معجزات کا تذکرہ کرتی ہے جن میں معراج اور شقِ صدر شامل ہیں لیکن ان کو

---

[1]Hazleton, Lesely, *The First Muslim-The Story of Muhammad*, London 2013, p:11

[2]السباعی، مصطفیٰ حسنی، ڈاکٹر، استشراق اور مستشرقین، (مترجم: محمد نور الحسن خان ازہری،) کتاب محل، لاہور 2017ء، ص:41

بھی بطور معجزہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس نے پیدائش سے وصال تک سینکڑوں واقعات سیرت کا احاطہ کیا ہے لیکن احادیث وسیر کی کتب میں موجود معجزات نبوی ﷺ غزوات وسرایا میں سے کسی ایک کا تذکرہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا جو کہ عملی بددیانتی اور خیانت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے معجزاتی پہلو پر اصرار کم کیا جائے تو آپؐ کی زندگی زیادہ غیر معمولی نظر آتی ہے، چنانچہ وہ لکھتی ہے:

> Muhammad is one of those rare lives that is more dramatic in reality that in legend. In fact, the less one invokes the miracolous, the more extraordinary his life becomes.[1]
>
> (یعنی محمد ﷺ کی زندگی ان چند نایاب زندگیوں میں سے ایک ہے کہ جو ایک کہانی کے بجائے در حقیقت ڈرامائی طور پر زیادہ ظاہر ہوتی ہے، واقعاتی طور پر اگر معجزات کا سہارا جتنا کم کیا جائے گا تو ان کی یہ زندگی اتنی ہی غیر معمولی نظر آئے گی)

اسی طرح واقعہ شقِ صدر کے حوالے سے کہتی ہے:

> It become less specifically Arabian as it develops, calling on elements of hero legends worldwide; on Greek and Egyptian god legends.[2]
>
> (یعنی شقِ صدر کا واقعہ بڑھتے بڑھتے یونانی اور مصری دیوتاؤں سے وابستہ روایات کی صورت اختیار کرتی جاتی ہیں)

چنانچہ لزلے کے ہاں اسی کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کی شخصیت سے بہت سے واقعات جو غیر فطری طور پر ہیں، ان کو شامل کیا گیا ہے ایسے ہی مسلمانوں نے بھی شقِ صدر کے واقعے کو خود سے وضع کر لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ سطورِ بالا میں یہ وضاحت تفصیل سے ہو چکی ہے کہ واقعہ شقِ صدر دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ چنانچہ مولانا مودودی رحمہ اللہ اس واقعہ کا ذکر کر کے اس کے حاشیے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

> واقعہ شقِ صدر اسرارِ الٰہی میں سے ہے جس کی حقیقت انسان نہیں پا سکتا۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ایسے بہت سارے واقعات پیش آئے ہیں کہ جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کی جا سکتی اور توجیہات کا ممکن نہ ہونا

---

[1] Hazleton, Lesley, *The First Muslim*, p:10
[2] *Ibid.*

اس کے انکار کا باعث نہیں ہے۔[1]

فترۃ الوحی

فترۃ وحی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابو القاسم السہیلی لکھتے ہیں۔

{ وذكر فترة الوحي عن رسول الله ولم يذكر مقدار مدة الفترة ، وقد جاء في بعض الأحاديث المسندة انها كانت سنتين و نصف سنة ، فمن هنا يتفق ما قاله انس بن مالك إن مكثثة بمكة كان عشر سنين ، وقول ابن عباس ثلاث عشرة سنة ، وكان قد ابتدئ بالرؤيا الصادقة ستة أشهر فمن عد مدة الفترة ، وأضاف إليها الأشهر الستة ، كانت كما قال ابن عباس ، ومن عدها من حين حمى الوحي وتتابع كما في حديث جابر كانت عشر سنين. ووجه آخر في الجمع بين القولين أيضا ، وهو أن الشعبي قال : وكل إسرافيل بنبوة محمد صلى الله عليه وسلم ثلاث سنين ، ثم جاءه بالقرآن جبريل { .[2]

ترجمہ (ابن اسحاق نے وحی کے انقطاع کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ ذکر نہیں کیا کہ کتنے عرصے تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ وحی کا سلسلہ اڑھائی سال تک رکا رہا۔ اس قول سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو تقویت ملتی ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے، مگر ابنِ عباس کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تیرہ سال تک رہے۔ چھ ماہ تک سچے خوابوں کا سلسلہ جاری رہا جس نے فترت کی مدت کو بھی شامل کیا اور اس کے ساتھ یہ چھ ماہ بھی شمار کیے تو اس کا قول ابنِ عباس کے قول کے ساتھ موافق ہو گیا، لیکن جس شخص نے اس وقت سے یہ مدت شمار کی جب وحی کا سلسلہ لگاتار شروع ہوا تو اس کا قول جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق ہو گیا۔

امام شعبی فرماتے ہیں کہ اسرافیل علیہ السلام تین سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے پھر حضرت جبریل قرآن کریم کو لیکر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے مذکورہ بالا دونوں روایات کی تطبیق اس طرح بھی کی جا سکتی ہے۔ یعنی اگر تین سالوں کو بھی شمار کیا جائے تو مکہ مکرمہ میں قیام کی مدت تیرہ سال ورنہ دس سال شمار ہو گی)۔

بعض اخبارِ مسندہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدت اڑھائی سال تھی:[3]

أنزلت عليه النبوة و هو إبن أربعين سنة، فقرن بنبوته اسرافيل عليه السلام ثلث سنين، فكان يعلم الكلمة و الشئ و لم ينزل

---

[1] مودودی، ابو الاعلیٰ، سیرت سرورِ عالم ﷺ، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 1415ھ/1994ء، 2\97

[2] السہیلی، الروض الانف، 1/278

[3] السہیلی، ابو القاسم، الروض الانف، 1\161

عليه القرآن على لسانه فلما مضت ثلاث سنين قرن بنبوته جبريل، فنزل عليه القرآن على لسانه عشرين سنة ۔ [1]

(یعنی جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال کو پہنچی، تو آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ کی نبوت کے ساتھ اسرافیل علیہ السلام کو مقرون کیا گیا، چنانچہ وہ آپ کو کبھی کبھی کچھ چیزیں القاء کیا کرتے تھے یہ سلسلہ تین سال تک برقرار رہا اور ان دنوں میں قرآن کریم کا نزول نہیں ہوا۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے ساتھ لگائے گئے اور اس کے بعد نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ یہ نزولِ قرآن کا عرصہ بیس سال تک جاری رہا (جس میں سے دس سال مکہ مکرمہ میں جبکہ دس سال مدینہ طیبہ میں قرآن حکیم نازل ہوا)

مذکورہ پورے اثر کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں فترتِ وحی کی مدت کا ذکر نہیں ہے کیونکہ یہاں تو یہ ذکر ہے کہ جب نبوت دی گئی تو پہلے اسرافیل علیہ السلام کو حضور ﷺ کی معیت میں دیا گیا پھر تین سال بعد جبرئیل علیہ السلام کو ساتھ کیا گیا اور قرآن کا نزول بعد میں ہوا اور اس سے پہلے قرآن نازل ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ اقرأ باسم ربك۔۔۔ الخ نازل ہو چکی تھی اور اس سورۃ کی ابتدائی پانچ آیات کا نزول بھی ہو چکا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ قرآن بالکل نازل ہی نہیں ہوا تھا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اسی وجہ سے واقدی اس اثر کا سرے سے انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

(ليس يعرف أهل العلم ببلدنا ان اسرافيل قرن بالنبيﷺ، و ان علماؤهم و أهل السيرة منهم يقولون: لم يقرن به غير جبرئيل من حين أنزل عليه الوحي الى ان قبضﷺ) [2]

مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کے اس انکار پر نکیر کرتے ہوئے کہا کہ نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا مثبت پر نافی کو ترجیح حاصل ہو گی۔ گویا ان کی رائے کی مطابق ابتداءً اسرافیل علیہ السلام کو شامل کر دیا گیا ہو گا۔ لیکن اس واقعہ کو فترت کا بیان قرار دینا مشکل ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی صورت یہ تھی کہ پہلے آنحضرت ﷺ خواب دیکھتے ہیں پھر حضرت اسرافیل علیہ السلام کا اقتران ہوتا ہے اور تین سال بعد جبرئیل امین علیہ السلام کا اقتران ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر شعبی کے

---

[1] ابن حجر، حافظ، فتح الباری، 1\27

[2] ابن سعد، طبقات، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1410ھ/1990م، 1\191

اثر کو ثابت قرار دیا جائے تو یہی توجیہ ہو سکتی ہے۔ پھر ابن سعد نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ مدتِ فترت صرف چند ایام تک رہی۔

(لما نزل عليه الوحي بحراء مكث أياما لا يرى جبرئيل)[1]

چنانچہ مدت فترت وحی کے حوالے سے چار اقوال مشہور ہیں:

1۔ دو سال 2۔ ڈھائی سال 3۔ تین سال 4۔ چند ایام

یہاں ایک بحث اہلِ علم کے مابین وحی کے فتور اور انقطاع کے اسباب سے متعلق بھی ہے، چنانچہ اس کے تین اسباب ہیں:

اول: فترتِ وحی کا سبب وقوع یہ ہے کہ تاکہ آپ ﷺ پر اچانک فرشتے کی ملاقات کے باعث جو بہت زیادہ بوجھ پڑ گیا اس کو دور کیا جا سکے۔

دوم: تاکہ فتور کے بعد آپ ﷺ کی طبیعت مبارک میں شوق پیدا ہو کیونکہ جب اس طرح کی اشیاء کا انسان ایک آدھ دفعہ جب مشاہدہ کر لیتا ہے تو طبعی لحاظ سے دوبارہ دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ لہٰذا شوق کے بعد آنے والی چیز سہل اور آسان ہوتی ہے۔

سوم: کہ جو کچھ آپ ﷺ پر نازل ہوا ظاہر ہے کہ وہ الفاظ قرآنی تھے، تو مختصر سا وقت اس لیے دیا گیا کہ آپ ﷺ اس میں غور و فکر فرما سکیں تبھی فترتِ وحی کا واقعہ پیش آیا۔[2]

اسی طرح فترتِ وحی کے زمانہ میں جبرئیل امین علیہ السلام کے نزول کے حوالے سے بھی یہاں بحث ہے کہ آیا ان کا نزول اس عرصے میں ہوا تھا یا نہیں؟ درست بات یہ ہے کہ ان ایام فترت میں ان کا نزول ہوا تھا، کیونکہ کتاب التعبیر صحیح بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ جب وحی کا فتور ہوا تو آنحضرت ﷺ غایتِ حزن کے باعث پہاڑوں کی چوٹیوں پر جاتے اور ارادہ کرتے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں اور ہلاک ہو جائیں تو جبرئیل علیہ السلام فوراً ظاہر ہوتے اور کہتے:

(يا محمد! إنك رسول الله حقاً)

تو آپ ﷺ کے سینے میں جو جوش اٹھتا وہ ختم ہو جاتا اور آپ ﷺ واپس آ جاتے۔[3] اسی طرح ایک بحث فترت وحی کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ فترت کے بعد سب سے پہلے کیا نازل ہوا؟ صحیحین کی روایت کے مطابق سب

---

[1] ابن سعد، طبقات، دار الکتب العلمیہ، 1\196

[2] ابن حجر، حافظ، فتح الباری شرح صحیح الابخاری، کتاب التعبیر، 2\36

[3] ابن حجر، ایضاً، 12\361

سے پہلے "یا أیھا المدثر" کی ابتدائی آیات کا نزول ہوا۔[1] مگر سلیمان تیمی نے بعض آثار ایسے ذکر کیے ہیں، جن میں سورۃ الضحیٰ اور الانشراح کے نزول کا ذکر ہے۔ مگر یہ تمام آثار ضعیفہ ہیں۔[2] دراصل فترتِ وحی دو قسم کے ہیں:

اول وہ ہے کہ جو نزولِ وحی کی ابتداء میں ہوئی اس کے بعد تو سورۃ المدثر ہی نازل ہوئی۔

جبکہ دوسری فترت تین راتوں کے مختصر دورانیے پر مشتمل تھی، جس کے بعد سورۃ الضحیٰ کا نزول ہوا۔ اسی فترت کے حوالے سے ابولہب کی بیوی کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دو تین دن بیمار ہوئے اور جبرئیل علیہ السلام تشریف نہیں لائے تو ابولہب کی بیوی نے کہا:

(يا محمد! إني لأرجو أن يكون شيطانك قد تركك، لم أره قربك منذ ليلتين أو ثلاث، فأنزل الله والضحى، و الليل اذا سجى، ما ودعك ربك و ما قلى) [3]

(یعنی میرے خیال میں اب تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ دو تین راتوں سے تمہارے پاس نہیں آیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الضحیٰ کا نزول فرمایا)

فترۃ الوحی سے متعلق اعتراضات:

نزولِ وحی کی کیفیت اور فترت الوحی کے حوالے سے مذکورہ بالا تفصیلات پر مغربی مستشرقین نے جو اعتراضات کی بوچھاڑ کر کے ان واقعات کے متعلق من پسند نتائج اخذ کیے ہیں اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔ چنانچہ ولیم میور (William Muir) یوں رقم طراز ہے:

The conviction, however, of being inspired of God was not reached by Mohomet till ofter a protracted trial of mental throes.[4]

(آنحضرت ﷺ کو اپنے رب کی طرف سے خود پر نزولِ وحی کا یقین طویل ذہنی کشمکش اور آزمائش کے بعد حاصل ہوا)

یہی مستشرق ایک اور مقام پر فترتِ وحی کی وجہ سے آپ ﷺ پر طاری ہونے والی کیفیت و پریشانی کی تصویر کشی اس انداز میں کرتا ہے:

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح الابخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ العلق، 2\638

[2] ابن حجر، حافظ، فتح الباری، 8\710

[3] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع صحیح، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الضحیٰ، 2\738-739

[4] William Muir, *Muhammad and Islam*, p: 22

He grew downcast, and fearing possession of derils, had thoughts of destroying himself.[1]

(یعنی آپ ﷺ اس صورت حال کے باعث مایوسی میں مبتلا ہوگیے اور شیاطین کے زیرِ قبضہ ہونے کے باعث انہوں نے خود کو تباہ کرنے کی کوشش کی)

اسی طرح نامور مستشرق واٹ(William Montgomery Watt)نے مختلف تفاسیر و احادیث کی کتب سے مندرجہ ذیل نتیجہ نکالتے ہوئے کہا کہ:

There is no reason for supposing that Muhammad did not try to learn as much as possible from conversation with Christians such as Warqah.[2]

(یہ تصور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آنحضرت (ﷺ) نے ورقہ بن نوفل جیسے عیسائیوں کے ساتھ گفتگو کرکے اکثر معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی)

ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ:

But the marriage also played a part in his spiritual development. Khadijah had a cousin, Warqah, who had become a Christian, and who is said to have supported Muhammad in his belief that he was receiving revelations similar to those of the Jews and the chrisrians. It was to Khadijah too that Muhammad turned when in moments ofdesolation he doubted his commission to be a prophet.[3]

(حضرت خدیجہ کے ساتھ رشتہ ازدواج نے بھی آپ (ﷺ) کے روحانی ارتقاء میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا ایک چچازاد بھائی تھا جس کا نام ورقہ تھا، جو عیسائی ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا

[1]William Muir, *Ibid*, p: 24
[2]William Montgomery Watt, *Muhammad at Medina*, p: 316
[3]William Montgomery Watt, *Muhammad: Prophet and Statesman*, p:12

جاتا ہے کہ اس نے اس حوالے سے یقین دلانے کے لیے آپ کی مدد کی ہے کہ ان پر اسی قسم کی وحی نازل ہو رہی ہے جیسی وحی کی تعلیمات یہود و نصاریٰ کی پاس ہیں، وہ بھی خدیجہ ہی تھیں کہ جب آپ پریشانی کے عالم میں اپنے منصبِ نبوت کے حوالے سے اضطراب اور شک میں مبتلا ہوئے تو انہی کی جانب رجوع کرتے)

اسی طرح اس نے وحی کے نزول کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کی غیر یقینی کیفیت کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

In the early days, soon after the first rerelation, he is said to have been encouraged to believe in his vocation by his wife Khadijah and, more particularly, by her cousin Waraqah…. Nevertheless, the testimony of a christian that the revelations to Muhammad were similar to those formerly received be moses must have greatly strengthened his belief in his vocation.[1]

(کہا گیا ہے کہ محمد (ﷺ) کو شروع میں نزولِ وحی کے بعد خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نے یقین دلایا کہ آپ واقعتاً پیغمبرِ خدا ہیں اور خدیجہ سے بڑھ کر ورقہ بن نوفل نے یہ یقین دہانی کروائی۔ ایک عیسائی کی اس یقین دہانی نے کہ آپ پر نازل ہونے والی وحی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل شدہ وحی سے ملتی جلتی ہے، اپنے نبوت کے منصب پر آپ کے یقین کو مزید راسخ کیا ہو گا)

مذکورہ بالا عبارات میں جو مقدمہ پیش کیا گیا ہے اگر اس کو مانتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرت ﷺ کو آغاز میں اپنی نبوت پر یقین نہیں تھا اور نہ ہی آپ ﷺ کو خود پر نزولِ وحی کا یقین تھا، تو مستشرقین کا مقصودِ اصلی پورا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد اسلام کو الہامی مذہب کے طور پر تسلیم کرنے اور آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ماننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اور جب ایک نبی کو اپنی نبوت کی تصدیق و یقین کسی غیر مذہب کے بتلانے سے آئے تو اس کی حقانیت کو دیگر لوگ کیسے تسلیم کریں گے۔

چنانچہ مذکورہ جملے ان احادیث کا حصہ ہیں جن کا تعلق وحی کے آغاز یا فترتِ وحی سے ہے۔ ان دونوں موضوعات پر کثیر تعداد میں محدثین نے روایات کو اپنی کتب میں شامل کیا ہے۔ مگر مختلف کتب میں مروی روایات میں کافی حد تک اختلاف ہے۔

---

[1] William Montgomery Watt, *Muhammad: Prophet and Statesman*, p: 21

امام بخاری رحمہ اللہ نے بذاتِ خود سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو اپنی صحیح میں تین مختلف جگہوں پر روایت کیا ہے۔ تینوں جگہوں پر غارِ حرا میں آنحضرت ﷺ کے پاس جبرئیل امین علیہ السلام کے تشریف لانے اور سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کے نزول کا بھی ذکر ہے اور فترتِ وحی کا بھی۔ مگر ان تینوں میں سے صرف ایک جگہ وہ جملے مروی ہیں جہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود کو پہاڑوں سے گرانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے باب التعبیر میں تو پہاڑوں سے گرانے والی بات کا تذکرہ کیا ہے لیکن کتاب التفسیر میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو حدیث روایت کی ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے خود کو پہاڑوں سے گرانے کا ارادہ کیا بلکہ اس مقام پر یہ حدیث ان الفاظ پر ختم ہو گئی کہ:

(وفتر الوحي حتى حزن رسول الله ﷺ) [1]

(اور سلسلہ وحی کا انقطاع ہو گیا تو نحضرت ﷺ غمگین ہو گئے)

یہاں ان الفاظ کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے، جس میں جبرئیل امین علیہ السلام کے دوبارہ دکھائی دینے اور سورۃ المدثر کے نزول کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اس حدیث میں نہ ہی حضور ﷺ کے غمگین ہونے کا تذکرہ موجود ہے اور نہ ہی اس غم میں مبتلا ہو کر پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ہے، بلکہ فترتِ وحی کو ذکر کرنے کے بعد اس حدیث کو درج کیا گیا ہے، جس میں سلسلہ وحی کے دوبارہ نئے سرے سے ابتداء ہونے کا بیان ہے۔

اسی طرح امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کو کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے، مگر اس حدیث میں فترتِ وحی کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور اس حدیث کے بعد انہوں نے بھی جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنھم کی حدیث کو بیان کیا ہے جس میں سلسلہ وحی کے انقطاع اور از سر نو آغاز کا ذکر ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ سے مروی ایک حدیث صحیحین میں چار جگہوں پر موجود ہے اور ان میں سے صرف ایک جگہ پر وہ جملہ ہے کہ جہاں آنحضرت ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ملتا ہے۔ مذکورہ جملہ روایت کرنے سے قبل امام زہری رحمہ اللہ نے فیما بلغنا کے الفاظ بیان کیے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں جو اطلاعات پہنچی ہیں ان میں یہ جملہ بھی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ جملہ ان کو کسی حوالے سے پہنچا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ سے یہ حدیث کئی رواۃ نے نقل کی ہے مگر ان بہت ساری

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، رقم الحدیث 4953، 2\153

احادیث میں سے صرف اسی روایت کے ساتھ یہ جملے منسلک ہیں جو حضرت معمر نے امام زہری رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔

"باب کیف کان بدء الوحی" اس حدیث کو امام زہری رحمہ اللہ سے عقیل نے روایت کیا ہے اور اس روایت میں نہ تو حضور ﷺ کی غمگینی کا تذکرہ ہے اور نہ ہی پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا۔ جبکہ کتاب التفسیر میں زہری یہ حدیث عقیل کے علاوہ یونس بن یزید نے بھی بیان کی ہے اور مذکورہ جملہ اس روایت میں بھی موجود نہیں۔ کتاب التعبیر میں جو روایت ہے اس کو امام زہری رحمہ اللہ سے روایت کرنے والے عقیل کے علاوہ معمر بھی ہیں اور صرف اسی روایت میں وہ جملہ ہے۔ تبھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ زیادتی معمر کی روایت کے ساتھ خاص ہے۔[1]

چنانچہ معلوم ہوا کہ فترت سے متعلق کثیر روایات میں سے صرف ایک اسی روایت میں آپ ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کے الفاظ موجود ہیں جو کہ معمر نے امام زہری سے روایت کیے ہیں۔ اور معمر کے بغیر دیگر جن حضرات نے یہ روایت امام زہری رحمہ اللہ سے نقل کی ہے وہ اس جملے کے بغیر روایت کرتے ہیں۔ زہری بھی یہ جملہ حدیثِ مرفوع کے طور پر نہیں کرتے بلکہ حدیث کے اختتام پر اتنی بات کہتے ہوئے اس جملے کو روایت کرتے ہیں کہ اس حوالے سے ہم تک پہنچنے والی روایات میں سے ایک روایت یہ بھی ہے، لیکن وہ یہ ذکر نہیں کرتے کہ یہ جملہ کس حوالے سے ان تک پہنچا ہے؟ اسی لیے یہ جملہ نہ تو آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہے اور نہ ہی اس کی نسبت حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان سے منقول روایت صحاح کے کافی مقامات پر درج ہے جن میں سے صرف ایک روایت کے ساتھ اس جملے کا اضافہ ہے۔

اسی طرح قاضی عیاض رحمہ اللہ جو ایک ماہر محدث ہیں انہوں نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس ابلاغ کی نسبت چاہے زہری کی طرف کی جائے یا معمر کی طرف، یہ مرفوع نہیں ہے کیونکہ درمیان میں دو یا تین واسطے ذکر ہی نہیں کیے گئے اور زہری اگرچہ خود بڑے درجے کے محدث ہیں اور ثقہ ہونے کے باعث ان کا شمار ائمہ حدیث میں کیا جاتا ہے مگر جن لوگوں سے وہ یہ روایت نقل کرتے ہیں ان کا نام تک بھی نہیں لیتے کہ کم از کم ان کی ثقاہت اور عدمِ ثقاہت کی تحقیق تو کی جاسکے۔ اور یہاں یہ بھی لازم نہیں ہے کہ ہر ثقہ راوی ہمیشہ راوی ہی سے روایت کرے بلکہ کبھی ثقہ راوی غیر ثقہ راویوں سے بھی روایت کرتے ہیں۔ ان احتمالات کے باعث یہ

---

[1] عرجون، محمد صادق، محمد رسول اللہ ﷺ، 1\252

روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔[1]

چنانچہ اس روایت کو زیادہ سے زیادہ امام زہری رحمہ اللہ کے مرسلات میں سے قرار دیا جائے گا اور ان کی مرسلات کے حوالے سے اصحابِ جرح وتعدیل نے کافی طویل بحث کی ہے اور ان کے ناقدین میں بالخصوص یحیی بن سعید قطان جو امام الناقدین کہلاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ امام زہری کی قوتِ حافظہ بے مثال ہونے کے باوجود ان کو معصوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح سند کے لحاظ سے اگر اس بلاغ کو درست بھی قرار دے دیا جائے تو بھی صحتِ حدیث کے لیے سند کی صحت کے ساتھ ساتھ متن کا درست ہونا بھی ضروری ہے اور متن کی صحت کے لیے یہ بات لازم ہے کہ وہ حدیث دینی اصولوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ٹکر نہ کھائے۔

چنانچہ اس اعتبار سے یہ روایت معیار تک نہیں پہنچتی کیونکہ اس سے عصمتِ انبیاء کا عقیدہ مجروح ہوتا ہے جو کہ دین اسلام کے مبادی اصولوں میں شامل ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اس قدر مایوسی کے عالم میں بار بار پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس عزم سے جاکر خود کو گرا کر زندگی کا خاتمہ کر دینے کا خیال (نعوذ باللہ) اپنی نبوت پر ایمان راسخ نہ ہونے کی علامت ہے۔ جو کہ آپ ﷺ کی نبوت اور شخصیت پر ایک بدنما داغ قرار پائے گا۔

اس روایت کے ضعف کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ فترتِ وحی کے حوالے سے جو روایت مرفوعاً آپ ﷺ سے مروی ہے اس میں یہ باتیں موجود نہیں ہیں۔ یہ روایت صحیحین کے علاوہ بھی کئی ائمہ کرام سے مروی ہے اور اس کو بھی امام زہری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلمہ بن عبد الرحمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے جابر بن عبد اللہ نے بتایا ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

> ثم فتر الوحي عني فترة فبينا أنا أمشي سمعت صوتا من السماء فرفعت بصري قبل السماء فاذا الملك الذي جاءني بحراء قاعد على كرسي بين السماء و الأرض فجئت منه حتى هويت الى الأرض فجئت أهلي فقلت لهم "زملوني زملوني فزملوني فأنزل الله تعالى: ياأيها المدثر قم فأنذر" الى قوله والرجز فاهجر ثم تتباع الوحي ۔ [2]
>
> (پھر سلسلہ وحی کٹ گیا۔ ایک دن میں جب چلنے لگا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی میں نے آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو وہ فرشتہ تھا جو غارِ حراء میں میرے پاس آیا تھا وہ آسمان اور زمین کے مابین ایک کرسی پر بیٹھا ہے میں خوف کی وجہ سے زمین پر گر گیا پھر

---

[1] عرجون، محمد صادق، محمد رسول اللہ ﷺ، 1\386

[2] ایضاً، 1\398

میں اہلِ خانہ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کمبل اوڑھا دیجئیے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات
اتاریں: یاایھاالمدثر سے والرجز فاھجر تک۔ پھر اس کے بعد وحی کا نزول جاری ہو گیا)

اس مرفوع حدیث کے راوی بھی امام زہری ہیں جس میں آپ ﷺ بذاتِ خود فترتِ وحی کا ذکر فرماتے ہیں مگر یہاں وہ جملے ذکر نہیں کیے گئے جو امام زہری کی مرسل میں ہیں، لہٰذا یہ مرفوع روایت، حدیث مرسل پر مقدم ہو گی۔ چنانچہ مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ مذکورہ حدیث کے ساتھ یہ جملہ بعد میں لگایا گیا ہے اور یہ جملہ جب الحاقی ہے اور عصمتِ انبیاء کے متفقہ عقیدے کے بر خلاف ہے تو پھر یہ روایت کسی صورت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روایت و درایت کے اصول و قوانین اس طرح کے جملوں کو قبول کرنے سے مانع ہیں۔

حدیث بالا کا دوسرا جملہ جس کو مستشرقین نے آپ ﷺ کی اپنے منصب پر بے یقینی ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے وہ یہ ہے "لقد خشیت علی نفسی" یعنی مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جتنی جگہوں پر اس حدیث کو ذکر کیا ہے وہاں سب جگہوں پر یہ جملہ موجود ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اس جملے سمیت یہ روایت ذکر کی ہے۔ بخاری نے اگرچہ اس جملے کو حدیثِ مذکور کے ساتھ تمام جگہوں پر شامل کیا ہے مگر دیگر محدثین نے یہ حدیث اس جملے کے بغیر نقل کی ہے، جس میں نہ تو آپ ﷺ کے خوفزدہ ہونے کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کے غمگین ہونے کا۔

بلکہ اس حدیث میں اس کیفیت کے بر خلاف حضور ﷺ کے اطمینان کا ذکر ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ پہلے آپ کو پورے احترام و اطمینان سے بٹھاتے ہیں پھر منصبِ رسالت کی عظیم نعمت کی خوشخبری دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس نعمت کے ملنے سے آپ کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور اطمینان کا درجہ ایمان سے بھی اعلیٰ ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے احیاءِ موتیٰ کی صفت پر ایمان تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے باری تعالیٰ سے اس عمل کے مشاہدے کی خواہش ظاہر کی جس کی علت انہوں نے اطمینانِ قلبی بیان کی۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے جس اطمینان کے حصول کے لیے احیاءِ موتی کے عمل کے مشاہدے کی درخواست کی تھی آنحضرت ﷺ کو وہ دولت قرآن کریم کی پہلی آیت کے نزول سے قبل ہی عطا کر دی گئی تھی جس کے بعد جبرئیل نے کہا " اقراء باسم ربك الذی خلا "۔

مستشرقین ایک طرف تو آپ ﷺ پر اس طرح کے بے بنیاد الزامات و اعتراضات کا اظہار کرتے ہیں مگر جب دوسری جانب وہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے بے مثال اور حیرت انگیز کارہائے نمایاں دیکھتے ہیں تو یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آپ ﷺ کو اپنے مشن کی سچائی پر مکمل ایمان نہ ہوتا تو یہ کارنامے سرانجام دینے

ناممکن تھے۔ چنانچہ (William Muir) جو ایک طرف آپ پر خودکشی کا الزام لگانے والوں میں سرِ فہرست ہے اور یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ شروع میں آپ کو اپنے مشن کا یقین نہیں تھا۔

اس کے باوجود اپنے اس معاندانہ رویے اور مؤقف رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> Indeed, nothing is so remarkable as the faith reposed by Muhammad in the deity as an ever present and all controlling agency.[1]
>
> (سب سے ظاہر اور حیران کن چیز وہ ایمان ہے جو محمد (ﷺ) کو اللہ پر تھا جو ہر جگہ حاضر و ناظر اور کل کائنات کا نظام چلانے والا ہے)

اسی طرح واٹ (William Montgomery Watt) بھی منصبِ رسالت کے عظیم اور کٹھن راستے پر چلتے ہوئے یقینِ کامل کی اہمیت وضرورت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: اگر آپ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ رسولِ خدا ہیں اور آپ پر نزولِ وحی ہوتا ہے تو تکلیفوں اور مخالفتوں کے طوفان میں ان کے لیے اپنا مشن (نبوت و رسالت) جاری رکھنا ناممکن ہوتا۔[2]

ایک اور مستشرق جس کو تھامس کارلائل Thomas Carlayl کہا جاتا ہے نے آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی کو بغور پڑھا اور وہ روایات جن میں ابتدائے وحی کا بیان ہے تو کہتا ہے کہ آپ نے غارِ حراء میں جو جو کچھ دیکھا اسے خدیجۃ الکبریٰ کے آگے بیان کیا مگر ان کے رویے میں نہ تو کوئی اضطراب و پریشانی تھی اور نہ ہی کوئی ارتیاب و شک۔ بلکہ اس نے کہا کہ آنحضرت (ﷺ) غارِ حراء کے واقعے کے بعد اپنی شریک حیات کے پاس تشریف لائے تو ان کو بتایا کہ جن حقائق کی آپ کو طلب و جستجو تھی وہ آپ پر ظاہر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ تھامس کارلائل کے خیال میں جب آپ کی عمر چالیس برس کو پہنچی تو آپ اس سال رمضان المبارک کا مہینہ غارِ حراء میں گزارنے کے لیے تشریف لے گئے تاکہ عبادت اور کائنات کے نظام کے متعلق اہم امور پر غور و فکر کرنے میں اپنا وقت بسر کر سکیں۔

ایک دن آپ نے خدیجہ کو جو اس وقت آپ کی ضروریاتِ زندگی کے ساتھ آپ کے ہمراہ یا آپ کے پاس تھیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں کرم سے تمام حقائق آپ پر عیاں ہو چکے ہیں اور اب آپ

---

[1] William Muir, *Muhammad and Islam*, p: 9-10
[2] Watt, *Muhammad: Prophet and Statesman*, p: 17

کے دل میں کسی قسم کے شکوک و شبہات باقی نہیں ہیں اور حقیقت مکمل طور پر منکشف ہوگئی ہے۔[1]

اسی طرح واٹ کا خیال ہے کہ آپ کی زندگی میں پریشانی کے مواقع بھی آئے اور جن ناقابلِ تسخیر مشکلات سے آپ کو واسطہ تھا اس کے باعث ان مشکل اور صبر آزما حالات کا آنا کوئی حیران کن نہیں تھا مگر اس کے باوجود آپ کا ایمان کبھی کم نہیں ہوا کہ اللہ نے آپ کو اپنا پیغمبر اور رسول بنایا ہے اور ایک انتہائی اہم ذمہ داری آپ کو سونپی ہے۔ اسی یقین کے پیشِ نظر شدید مخالفت، استہزاء، تکالیف اور الزام تراشیوں کے باوجود آپ ثابت قدم رہے اور جب کامیابی آپ کو حاصل ہوئی تو آپ کے یقین میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ یہ یقین مزید مضبوط ہوگیا اور آپ کو یہ بات باور ہوگئی کہ جس رب نے آپ کو مبعوث کیا وہ تاریخی واقعات میں بھی آپ کی دستگیری کررہا ہے۔[2]

آنحضرت ﷺ کو جب رسالت جیسے عظیم منصب سے سرفراز کیا گیا تو انبیاء ورسل کی ذمہ داریاں چونکہ مشکل ہوتی ہیں اس لیے ان انبیاء کرام علیہم السلام کو صبر و استقامت، عزیمت اور غیر متزلزل یقین جیسی بے مثال ایسی ایسی قوتیں اللہ رب العزت کی جانب سے عطا ہوئی ہیں جس کا کوئی عام شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چنانچہ جو شخص آپ ﷺ کی مبارک زندگی کے نمایاں کارنامے مد نظر رکھ کر آپ ﷺ کی زندگی کے واقعات کو جانچتا ہے اسے نزولِ وحی کی ابتدائی کیفیت بھی ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے تھامس کارلائل کہتا ہے اور جو آپ ﷺ پر الزامات کی بوچھاڑ کر کے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو بھول جاتے ہیں وہ کبھی بھی اپنے غیر جانب دار محقق ہونے کے دعوے میں حق بجانب نہیں ہوسکتے اور غیر جانب دارانہ تحقیق کا یہ مطلب قطعی نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت اور حیاتِ طیبہ سے متعلق تفصیلات بیان کرتے وقت تمام حقائق کو نظر انداز کیا جائے۔

خلاصہ بحث:

وحی سے مراد وہ کلام ہے جو اللہ کی طرف سے بذریعہ فرشتہ یا کسی واسطے سے نازل ہوا اور اس میں ظاہری اسباب اور امور عادیہ کا خدشہ قطعاً نہ ہو۔ یہ وحی نبوت ہے جس کا تعلق انبیاء کے ساتھ خاص ہے۔ وحی کی حجیت واستناد اور اس کی اقسام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مذکورہ بالا صفحات میں مستشرقین کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے حوالے سے ہرزہ سرائی اور دیدہ دینی پر مبنی ابہامات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا جنمیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] Thomas Carlyle, *On Heroes, Hero-Worship*, Everyman lib, NewYork, 1973, p: 290
[2] Watt, *Muhammad: Prophet and Statesman*,p:15-16

جسمانی صحت پر سوالات اٹھاتے ہوئے سلسلہ وحی کو مشکوک بنا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی حیثیت کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ سراسر خلاف واقع اور گستاخی پر مبنی ہیں۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی ہونے پر بھی بہت سارے اعتراض کیئے ہیں جو کہ بے بنیاد اور حقیقت کے برعکس ہیں۔

اسی طرح منصب رسالت جو کہ خالصتاً وھبی منصب ہے نہ کہ کسبی، اس پر بھی طرح طرح کے اعتراضات کا یہاں پر جائزہ لیا گیا ہے اور واقعہ شق صدر اور فترۃ الوحی وغیرہ واقعات پر ان کے مؤقف کو دلائل اور حقائق کی روشنی میں غلط ثابت کیا گیا ہے چنانچہ وحی ورسالت کے حوالے سے ان کے اس رویے کی بنیاد پر غیر جانبدارانہ تحقیق کے دعوے حق بجانب نہیں ہیں۔

فصلِ دوم:
عصمتِ انبیاء اور عقیدۂ ختمِ نبوت سے متعلق مباحث

فصلِ دوم: عصمتِ انبیاء اور عقیدۂ ختمِ نبوت سے متعلق مباحث

انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ بنیادی دینی ضروریات میں سے ہے اور اس میں کسی حوالے سے جھول ایمان کے لیے مضر ہے۔ عصمتِ انبیاء کا معنیٰ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اقوال و اَفعال، عبادات و عادات، معاملات و مقامات اور اخلاق و کردار میں اللہ تعالیٰ اپنی کامل قدرت کے باعث ان کو نفس و شیطان کی مداخلت اور خطا و نسیان سے محفوظ رکھتے ہیں اور ملائکہ کو ان کی حفاظت پر مامور کر دیتے ہیں تاکہ بشریت کا غبار ان کے پاکیزہ دامن کو گرد آلود نہ کر دے اور نفسِ بہیمہ اپنے مختلف اَفعال کو ان پر طاری نہ کر دے اور اگر قانونِ خداوندی کے برخلاف بہت کم کبھی کوئی ایسا امر سرزد ہو بھی جائے تو فوراً اللہ تعالیٰ ان کو اس سے مطلع کر دیتے ہیں اور غیبی عصمت ان کو راہ راست پر لاکر گامزن کر دیتی ہے چنانچہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام بالعموم اور سرورِ دو عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بالخصوص کی عصمت پر امت کا اجماع ہے۔ جس کے باعث تمام انبیاء کرام علیہم السلام کفر و شرک اور کبائر و صغائر سے پاک ہیں۔

عصمتِ انبیاء- قرآنی آیات کی روشنی میں:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے حق میں ارشاد فرمایا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کیا۔ اور نبی علیہ السلام کو اذیت سے مراد اقوال و اعمال کے ذریعے اذیت دینا جیسے جادوگر، شاعر، کاہن اور مجنون قرار دینا-اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کے لیے ہر طرح کے توہین آمیز الفاظ کا استعمال بھی ممنوع ہے تو ان کے لیے زجر و توبیخ کیسے درست ہو گی۔

ایسے ہی اگر نبی سے فسق کا صدور ہوتا تو پھر امت کو بھی اس فسق کی اتباع کرنی لازم ہوتی اور یہ ناجائز اور حرام ہے اور اگر ان کی اتباع کا حکم نہ ہو گا تو یہ بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۚ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴾[1]

(کہہ دیجئیے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے)

اس آیت کی رو سے نبی سے فسق کا صدور محال ہے۔ اگر انبیاء کرام سے گناہ صادر ہوں تو وہ (معاذاللہ) ضرور جہنم کی

[1] آل عمران:31

وعیدات کے مستحق ہوں گے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُۥ يُدْخِلْهُ نَارًا خَٰلِدًا فِيهَا وَلَهُۥ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾[1]

(اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے نکل جائے اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں ڈالیں گے یہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہےاور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿أَلَا لَعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ﴾[2]

(خبردار ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے)

جبکہ یہ بایں وجہ باطل ہے کہ امت کا اجماع ہے لہٰذا انبیاء کرام علیہم السلام سے گناہ کا سرزد ہونا باطل ہے۔

عصمتِ انبیاء کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ ٱلْمُصْطَفَيْنَ ٱلْأَخْيَارِ﴾[3]

(بے شک وہ ہمارے نزدیک منتخب نیک بندوں میں سے تھے)

آیتِ کریمہ میں دونوں الفاظ "المصطفین، الاخیار" تمام نیکیوں کی انجام دہی اور برائیوں کے ترک کو شامل ہیں چنانچہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کی زندگی کے تمام شعبوں میں برگزیدہ اور چنیدہ ہوتے ہیں اور اس طرح کے تعریفی وتوصیفی کلمات ان کے لیے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر استعمال کیے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے

﴿إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰٓ ءَادَمَ وَنُوحًا وَءَالَ إِبْرَٰهِيمَ وَءَالَ عِمْرَٰنَ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ﴾[4]

(بے شک اللہ نے آدم اور نوح اور ابراہیم اور عمران کی اولاد کو تمام جہان والوں پر پسند کیا ہے)

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

---

[1] النساء:14

[2] ھود:18

[3] ص:47

[4] آل عمران:33

﴿وَٱذۡكُرۡ عِبَٰدَنَآ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ أُوْلِي ٱلۡأَيۡدِي وَٱلۡأَبۡصَارِ إِنَّآ أَخۡلَصۡنَٰهُم بِخَالِصَةٖ ذِكۡرَى ٱلدَّارِ ﴾[1]

(اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب(علیہم السلام) کو یاد کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔ بے شک ہم نے انہیں ایک خاص فضیلت دی یعنی آخرت کے ذکر کے لیے چن لیا تھا)

اس آیت کے حوالے سے امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(إحتج العلماء بهذهِ الآية في إثبات عصمة الأنبياء قالوا لأنه تعالى حكم عليهم بكونهم اختيارا على الإطلاق و هذا يعم حصول الخيرية في جميع الأفعال و الصفات)[2]

(اہلِ علم نے مذکورہ آیت سے عصمت انبیاء کو ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں مطلقا خیر ہونے کا حکم دیا ہے اور یہ تمام افعال اور صفات میں خیر حاصل کرنے کو شامل ہے)

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{ وَإِذۡ قَالَ إِبۡرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجۡعَلۡ هَٰذَا ٱلۡبَلَدَ ءَامِنٗا وَٱجۡنُبۡنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعۡبُدَ ٱلۡأَصۡنَامَ }

(اور جس وقت ابراہیم نے کہا اے میرے رب! اس شہر کو امن والا کردے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی عبادت سے بچا)

اس آیت کی تفسیر میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

(والمراد هاهنا طلب الثبات و الدوام على التوحيد و البعد عن عبادة الأصنام و الا فالأنبياء معصومون عن الكفر و عن عبادة غير الله)[3]

(سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہاں دعا کرنے سے مراد ثبات اور طلب کا دوام ہے توحید اور بتوں کی عبادت سے دور رہنے پر، ورنہ انبیاء کرام علیہم السلام ارتکابِ کفر

---

[1] ص:45-46

[2] الرازي، مفاتيح الغيب، 7/202

[3] الآلوسی، شهاب الدين محمود، روح المعانی، 13/7

اور غیر اللہ کی عبادت سے ویسے بھی معصوم ہیں)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی منشاء یہاں یہ ہے کہ اگرچہ انبیاء کرام علیہم السلام کفر اور شرک سے منزہ ہیں مگر ان کے لیے اللہ سے توحید پر قائم رہنے کے لیے دوام وثبات کا طلب کرنا جائز ہے اور طلبِ عصمت بھی انبیاء کے لیے درست ہے کیونکہ عصمتِ انبیاء کے امور طبعیہ میں شامل نہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے۔

چنانچہ وہ مزید فرماتے ہیں:

(والجواب الصحيح عندي ما قيل إن عصمة الأنبياء ليس لأمر طبعي فيهم بل بمحض توفيق الله تعالى إياهم و بفضله عليهم و لذلك صح طلبها) [1]

(میرے ہاں درست جواب یہ ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ عصمتِ انبیاء ان کی طبعی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خالص توفیقِ خداوندی اور اس کے فضل سے ان کو عطا کی گئی ہے اور تبھی اس کی طلب بھی درست ہو گی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ عصمت انبیاء کے امورِ طبعیہ میں سے نہیں ہے جو بذاتِ خود ان کو حاصل ہو۔ جیسے ان کو نبوت اللہ کی رحمت و فضل سے عطا ہوئی ہے ویسے ہی عصمت بھی ان کو اللہ کی توفیق اور فضل و کرم سے ہی حاصل ہوئی ہے لہذا اللہ سے اس کی طلب بھی صحیح ہو گی، یعنی منصبِ نبوت وہبی اور عطاءِ خداوندی ہوتا ہے نہ کہ کسبی کہ از خود محنت سے حاصل کیا جاسکے۔

عصمتِ انبیاء-احادیث کی روشنی میں:

عصمتِ انبیاء کے حوالے سے احادیث کی رو سے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اکرم ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(ما منكم من أحد الا و قد وكل به قرينه من الجن قالوا و إياك يا رسول الله قال وإياي إلا أن الله أعانني عليه فأسلم فلايامرني إلا بخير) [2]

---

[1] الآلوسی، روح المعانی، 13/23

[2] القشیری، مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، کتاب صفۃ القیامۃ والنار، حدیث نمبر 2814

(تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک شیطان اور ایک فرشتہ ہم نشین مقرر نہ کیا گیا ہو، صحابہ نے عرض کیا اور یارسول اللہ! آپ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر غلبہ عطا فرمایا ہے پس وہ اسلام لایا ہے اور مجھ کو ہمیشہ نیکی کی ہی راہنمائی کرتا ہے)

چنانچہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(قال الشيخ محي الدين النووي: يروي فاسلم بفتح الميم و ضمها فمن رفع قال: معناه فاسلم انا من شره و فتنته۔ و من فتح قال معناه أن القرين أسلم من الإسلام، يعني صار مؤمنا لا يأمرني إلا بخير۔ قال الخطابي الصحيح المختار الرفع۔ و رجح القاضي عياض: الفتح قال الشيخ و هو المختار لقوله فلايأمرني إلا بخير قال القاضي عياض و أعلم أن الأمة مجتمة على عصمة النبيﷺ من الشيطان في جسمه و خاطره و لسانه) [1]

(لفظِ اسلم میم کے زبر اور پیش دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے لہذا جنہوں نے اس کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے ہاں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں شیطان کے شر اور فتنے سے امن میں ہوں اور جو لوگ لفظ اسلم کے میم کو فتح کے ساتھ پڑھتے ہیں تو ان کے ہاں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم نشین شیطان نے اسلام قبول کیا ہے، یعنی مؤمن ہو گیا ہے جو مجھے صرف نیکی کا کہتا ہے۔ خطابی نے کہا ہے کہ صحیح اور پسندیدہ پیش سے پڑھنا ہے۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے زبر سے پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے ہاں یہی قول پسندیدہ ہے اور اس کی دلیل آپ ﷺ کا قول کہ "وہ مجھے ہمیشہ نیکی کا ہی کہتا ہے" قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جان لو کہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ بایں طور کہ شیطان کے شر سے آپ ﷺ کا جسم، خیال اور زبان ہر چیز معصوم و محفوظ ہے)

مذکورہ حدیث آپ ﷺ کی مکمل عصمت کی دلیل ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان اگرچہ میرے

[1] النووی، یحیٰ بن شرف، شرح النووی علی مسلم، دار الخیر، 1416ھ/1996ء، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، ص293

ساتھ ہے مگر اس کو اللہ نے میرے لیے مسلمان بنادیا ہے اور وہ مجھے گناہ اور شر کے بجائے نیکی اور خیر کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ محدثین اس حدیث کے ضمن میں صراحت فرماتے ہیں کہ اجماعِ امت کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ مکمل طور پر شیطان کے شر اور اثر سے محفوظ ہیں۔ نامور محدث امام طحاوی رحمہ اللہ آپ ﷺ کی ایک حدیث استغفار کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

(عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: سمعت رسول اللهﷺ يقول: إني لاستغفر الله و أتوب إليه في اليوم أكثر من سبعين مرة الخ۔ قالوا فهذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقوله لأنه معصوم من الذنوب و أما غيره فلاينبغي أن يقول ذلك لأنه غير معصوم من العود في ما تاب منه) [1]

(ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ میں دن میں ستر دفعہ سے زائد اللہ تعالیٰ سے طلبِ بخشش کرتا ہوں اور اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ علماء نے کہا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی شان ہے کہ وہ اس طرح فرماتے تھے کیونکہ آپ ﷺ گناہوں سے معصوم ہیں اور آپ ﷺ کے سوا کسی اور کا یہ مقام نہیں کہ وہ اس طرح کہے کیونکہ اس نے جس چیز سے توبہ کی ہے وہ اس کی طرف لوٹنے سے معصوم نہیں ہے)

چنانچہ اس حدیث کے حوالے سے امام طحاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا گناہ سے توبہ یہ ہے کہ آدمی گناہ سے توبہ کرے پھر اس کی جانب نہ لوٹے۔ یہی توبہ کی حقیقت ہے اور یہ کسی سے ممکن نہیں سوائے آپ ﷺ کے کہ آپ ﷺ معصوم ہیں۔[2] اسی طرح ملا علی قاری لکھتے ہیں: (عن بعض المشائخ أن القرين من الجن ربما يدعوه إلى الخير) [3] (کچھ مشائخ کے نزدیک بعض اوقات انسانی قرین اس کو خیر کی جانب بھی بلاتا ہے)

لیکن امام طحاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "بعض علماء کے ہاں یہ جائز ہے کہ انسان یہ کہے کہ "میں اللہ کی جانب

---

[1] الطحاوی، شرح معانی الآثار، الکراہت، الاستغفار، 2/404

[2] ایضاً، 2/403

[3] القاری، ملا علی بن سلطان محمد، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، دارالفکر بیروت، 1422ھ، 1/135

لوٹتا ہوں "[1] برصغیر کے نامور محدث شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ عصمتِ انبیاء کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اصل نبوت میں فرق کیے بغیر تمام انبیاء پر مساوی لحاظ سے ایمان لانا واجب ہے اور ان کو ہر قسم کے گناہوں سے پاکیزہ سمجھنا اور ان کا احترام کرنا واجب ہے، جب کہ ان کو گناہوں سے معصوم سمجھنا بھی واجب ہے چاہے کبیرہ ہوں یا صغیرہ اور قبل النبوۃ ہوں یا بعد النبوۃ۔ اور یہی مذہب پسندیدہ ہے۔

بعض مفسرین اور قصہ گو حضرات اور راویوں نے بعض انبیاء کرام علیہم السلام مثلاً حضرت یوسف اور داؤد علیہما السلام سے متعلق جو روایت کیا ہے وہ غلط ہے۔ اور قرآن کریم میں جو آدم علیہ السلام کی جانب "وعصیٰ ادم ربہ فغوی" میں عصیان کی نسبت کرکے ان پر عتاب کیا گیا ہے یہ دربارِ الٰہی میں ان کے قرب کی بلندی مرتبت پر دال ہے۔ اور مالک اس بات کا حقدار ہے کہ افضل و اولیٰ کے ترک پر جبکہ وہ معصیت کی حد کو نہ پہنچتا ہو اپنے بندے کو جو چاہے کہے اور عتاب کرے۔ مگر کسی دوسرے کو قطعاً یہ لائق نہیں کہ وہ بھی ایسا کچھ کہہ سکیں۔ یہاں مقامِ ادب کی خصوصیت ہے کہ جس کی رعایت کرنا لازم ہے اور وہ یہ کہ اگر اللہ رب العزت کی جانب سے اپنے بعض مقرب انبیاء پر کوئی خطاب مبنی بر عتاب ہو یا ان پر تواضع، ذلت اور عاجزی ظاہر ہو جائے جس سے ان کی شان میں نقص کا احتمال و امکان ہو تو ہمارے لائق قطعاً مناسب نہیں کہ ہم اس میں مداخلت کی جسارت کریں۔[2]

امام رازی رحمہ اللہ ایک اور روایت سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے دعوے کے مطابق گواہی دی جب کہ آپ ﷺ کے معاملہ کے وقت آپ موجود نہیں تھے۔ اس گواہی پر معترضین نے کہا کہ آپ نے کیوں تصدیق کی؟ تو انہوں نے کہا کہ جب میں عالمِ بالا کی خبروں پر ان کی تصدیق کر رہا ہوں تو دنیوی معاملے میں ان کی تصدیق کیوں نہ کروں؟ جب یہ بات آپ ﷺ سے ذکر کی گئی تو آپ ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی اور خزیمہ کو ذوالشہادتین (یعنی ان کی گواہی دو بندوں کے برابر) کا لقب دیا۔ چنانچہ اگر انبیاء کرام سے گناہوں کا سرزد ہونا جائز ہوتا تو خزیمہ رضی اللہ عنہ کی یہ گواہی قطعاً جائز نہ ہوتی۔[3]

مذکورہ بالا حدیثِ مبارکہ اور مختلف محدثین کی تشریحات و توضیحات اس امر پر دلالت کر رہی ہیں کہ آپ ﷺ معصوم ہیں جس پر حدیثِ توبہ و استغفار باقاعدہ دلالت کر رہی ہے۔

---

[1] الطحاوی، شرح معانی الآثار، 2/404

[2] دھلوی، عبد الحق، شیخ، لمعات التنقیح فی شرح مشکاۃ المصابیح، مکتبۃ المعارف لاہور، 1/39

[3] الرازی، فخر الدین، عصمۃ الانبیاء، دار الھدیٰ، الجزائر، 2006ء، ص14

عصمتِ انبیاء اور فقہائے کرام:

انبیاء کرام علیہم الصلاۃ و السلام کی عصمت کے حوالے سے حضرات فقہائے کرام علیہم السلام کے اقوال درج ذیل ہیں: امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحم اللہ کے اصحاب میں سے جمہور فقہا کی رائے یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام صغیرہ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں؛

جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ کی تصریح سے واضح ہے:

(قال جمہور من الفقہاء من اصحاب مالك و ابی حنیفة والشافعی انہم معصومون من الصغائر) [1] (یعنی فقہاء کی اکثریت جن کا تعلق امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی سے ہے کا مؤقف ہے کہ انبیاء کرام صغیرہ گناہوں سے پاک ہیں)

اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ: (الأنبیاء علیہم السلام کلھم منزہون عن الصغائر و الکبائر والکفر والقبائح) [2]:(تمام انبیاء کرام صغیرہ و کبیرہ گناہوں اور کفر وافعالِ قبیحہ سے معصوم تھے)

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامی اپنے معروف رسالہ عصمت انبیاء علیہم السلام میں لکھتے ہیں:

(انہم معصومون عن الصغائر والکبائر قبل النبوة وبعدھا عمداً و سھواً) [3]:(یعنی انبیاء کرام نبوت سے قبل اور بعد میں چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے گناہوں سے سھواً اور قصداً معصوم ہوتے ہیں) اسی طرح علمائے اصول کے حوالے سے شیخ علامہ عبد الوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ:

> قال الأئمة الأصول الأنبیاء علیھم الصلوٰة والسلام کلھم معصومون لا یصدر عنھم ذنب ولاصغیرة سہواً ولایجوز علیھم الخطأ فی دین اللہ قطعاً وفقاً للأستاد ابی اسحٰق الأسفرائنی وابی الفتح الشھر ستانی والقاضی عیاض والشیخ تقی الدین سبکی وغیرھم وقال جماعته لاینبغی اجراءالخلاف فی الأنبیاء والمرسلین ابداً ۔ [4]

---

[1] القرطبی، الجامع لأحکام القران: تفسیر القرطبی، 1/308

[2] ابو حنیفہ، نعمان بن ثابت، الفقہ الأکبر، مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ، 1999ء، ص37

[3] آفندی، محمد امین، رسائل ابن عابدین: الرسالۃ الرابعۃ عشر: ص307

[4] الشعرانی، عبد الوہاب، الیواقیت الجواہر فی بیان عقائد الأکابر، دار الأحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، 2/2

(ائمہ اصول کہتے ہیں کہ تمام انبیاء کرام معصوم ہیں اور ان سے بھول کر بھی کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا چاہے وہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو اور ان سے دینِ خداوندی میں وقوع خطا بھی جائز نہیں اس پر استاد ابو اسحاق اسفرائنی، ابوالفتح شہرستانی، قاضی عیاض اور شیخ تقی الدین سبکی وغیرہ حضرات کا اتفاق ہے جب کہ ایک جماعت کہتی ہے کہ انبیاء و مرسلین سے امر خداوندی کے برعکس کرنا دائمی طور پر ناجائز ہے)

آگے علامہ شعرانی مزید یوں رقم طراز ہیں:

(وایضافان الرسول مشرع لنا بجميع اقوالهٖ وافعالهٖ وتقريراتهٖ فلو انهٗ صدق عليه الوقوع فی معصية ما تصدق عليه تشريح المعاصی ولاقائل بذلك ابداً وعبارة الشيخ محی الدين فی الفتوحات ويشترط فی حق الرسول العصمة فی جميع ما يبلغه عن الله عزوجل) [1]

(اور اسی طرح رسول ہمارے لیے اپنے اقوال وافعال اور تقریرات کے ذریعے شریعت کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں تو اگر وہ کسی ایک گناہ کے وقوع کا بھی مصداق بنتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے شریعت کے بیان میں گناہوں کی آمیزش ہو گی اور اس کا کچھ بھی کوئی قائل نہیں رہا شیخ محی الدین ابو بکر بن العربی کی فتوحات مکیہ کی عبارت ہے کہ رسول کے حق میں شرط ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ دینی امور کی تبلیغ میں عصمت حاصل ہو)

شیخ علاؤالدین عبد العزیز بن احمد رحمہ اللہ یوں رقم طراز ہیں:

(لا يصح وقوع ماهو معصية من الأنبياء عليهم السلام فانهم عصمو امن الكبائر عند عامة المسلمين وعن الصغائر عنداصحابنا وان لم يعصموا من الزلات) [2]

(انبیاء علیہم السلام سے گناہوں کا صدور اور وقوع درست نہیں کیوں کہ عام طور پر تمام

---

[1] الشعرانی، عبد الوہاب، الیواقیت الجواہر فی بیان عقائد الأکابر، 2/2

[2] عبد العزیز، احمد بن محمد الابخاری، علاؤالدین، کشف الأسرار عن اصول فخر الاسلام البزدوی، مطبعۃ الشرکۃ الصحافیۃ العثمانیہ، اعادۃ طبع دار الکتاب العربی، بیروت، 1308ھ، 3/375

مسلمانوں کا عقیدہ ان کے متعلق بڑے گناہوں سے عصمت کا ہے جب کہ ہم اور ہمارے مشائخ کا قول یہ ہے کہ انبیاء کبھی صغائر کا بھی ارتکاب نہیں کرتے البتہ ان سے زلات صادر ہونے ممکن ہیں)

اسی طرح شیخ حافظ الدین نسفی رحمہ اللہ اپنی تصنیف "شرح العمدۃ" میں لکھتے ہیں کہ: (ان النبی لابدوان یکون معصوماً فی اقوالہٖ وافعالہٖ ما یعیبه ویسقط قدره) [1] ترجمہ:(یعنی نبی کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اقوال وافعال میں ہر اس چیز سے پاک ہو جو اس کو عیب دار بنائے اور اس کی قدر کو خراب کرے)

اس مؤقف کو مزید صراحت کرتے ہوئے یہاں مزید کہا گیا ہے کہ یہ کہنا واجب ہے کہ انبیاء معصوم ہیں اور وجوب کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ انبیاء سے گناہ کبیرہ صادر نہیں ہوتے اور اسی پر اجماع ہے اور صغیرہ گناہوں کا صدور بھی نہیں ہوتا۔[2]

چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے اسی مؤقف کی توثیق فرمائی ہے اور ان کا حتمی قول یہی ہے کہ قابلِ اعتماد اور صحیح بات یہی ہے کہ جس کی طرف قاضی عیاض اور دیگر ائمہ کرام نے مراجعت کی ہے کہ انبیاء کرام صغائر و کبائر سمیت ہر طرح کے گناہوں سے چاہے وہ سہواً ہوں یا عمداً، قبل النبوۃ ہوں یا بعد النبوۃ ہر حالت میں معصوم ہیں

اسی مؤقف پر علامہ تفتازانی جو نامور متکلم اور فقیہہ گزرے ہیں یوں مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں:

(انہم معصومون عن الکفر قبل الوحی وبعده بالاجماع، وکذا عن تعمدالکبائر عند الجمہور) [3] (جمہور کے ہاں انبیاء کرام متفقہ طور پر ارتکاب کفر اور عمداً ارتکاب کبائر سے نبوت سے پہلے اور بعد بالکل صاف وطاہر ہوتے ہیں)

چنانچہ معروف فقیہہ اور حنفی عالم علامہ شامی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ:

فظهر مما ذکرنا ان الانبیاء کلہم علیہم الصلوٰۃ والسلام لم تقع منهم معصیة قط لاقبل النبوة ولابعدها وان ساحتهم منزهة عنها کیف ولوصدر منهم ذلك للزم استحقاقهم العذاب واللعن واللوم والذم لدخولهم تحت قولہٖ تعالیٰ:(ومن یعص اللہ

---

[1] ابن عابدین، محمد امین آفندی، رسائل ابن عابدین، الرسالۃ الرابعۃ عشر: ص308

[2] ایضاً: ص308

[3] التفتازانی، سعد الدین، شرح العقیدہ النسفیہ، مکتبہ دارالہدی، الجزائر، ص102

ورسوله)، وقوله تعالیٰ: (الا لعنة الله على الظالمين)، وقوله تعالیٰ:(اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسكم)، وكل ذلك منتف باجماع الثقاة لكونهٖ من اعظم المنفرات، فاتضح ان القول الصريح والوجه الصحيح، ان شاء الله تعالیٰ: تنزههم عن كل عيب، وعصمتهم عن كل مايوجب الريب ۔ [1]

(جو مسائل ہم نے ذکر کیے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ سب نبیوں سے قطعاً نبوت سے قبل اور بعد میں گناہ واقع نہیں ہوئے اس لیے کہ اگر ان سے گناہ صادر ہو جائیں تو وہ معاذاللہ عذاب، لعنت و ملامت اور مذمت کے مستحق ہوں اس لیے کہ وہ ان آیات کریمہ کے مصداق قرار پائیں گے۔ آیت کریمہ:(اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔۔۔الخ) اور آیت کریمہ:(خبر دار اللہ کی لعنت ظالموں پر ہے) اور آیت کریمہ:(کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو) یہ تمام باتیں ثقہ اہل علم کے اجماع کی رو سے انبیاء سے منتفی ہیں بائیں وجہ کہ یہ سب باتیں نفرت دلاتی ہیں چنانچہ واضح ہوا کہ واضح قول اور درست وجہ انشاء اللہ یہی ہے کہ انبیاء کرام جملہ عیوب سے پاک ہیں اور شک پیدا کرنے والی ہر چیز سے معصوم ہیں)

عصمت انبیاء کے حوالے سے نامور متکلم وفقیہہ علامہ ابی شکور السالمی رحمہ اللہ کہتے ہیں۔

وقال اہل السنة والجماعة ان الانبياء صلوات الله عليهم قبل الوحی كانو انبياء معصومين واجب العصمة والرسول قبل الوحی كان رسولاً نبيا مامونا وكذلك بعد الوفات والدليل عليه قوله سبحانه وتعالیٰ خبراً عن عيسیٰ بن مريم صلوات الله عليه تصديقاً له حيث كان فی المهدصبيا قال انی عبدالله اٰتنی الكتاب وجعلنی نبياً ومعلوماً ان الوحی لايكون للصبيان والأطفال والكتب لايكون الا النبی ومرسل وہذا نص من غير تأويل ولاتعريض ومن انكر ذلك فانه يصير كافراً ۔ [2]

---

[1] ابن عابدین، محمد امین آفندی، رسائل ابن عابدین الرسالۃ الرابعۃ عشر: ص312

[2] السالمی، ابو شکور، التمہید فی بیان التوحید مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الأسلامیۃ، الریاض، ص73

(اہل السنت والجماعت کہتے ہیں کہ انبیاء نزول وحی سے قبل بھی معصومین اور واجب العصمۃ تھے اور رسول بھی وحی سے قبل رسول ہی تھے اور نبی اور مامون تھے اسی طرح بعد از وفات بھی وہ رسول ہی ہوں گے اس دعوے کی دلیل قول باری تعالیٰ ہے کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خبر دی گئی ہے جب کہ وہ ماں کی گود میں تھے (کہا اس نے بے شک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی گئی ہے اور نبی بنایا گیا ہے مجھے) اور یہ بات معلوم ہے کہ وحی لڑکوں اور بچوں کو نہیں بھیجی جاتی بلکہ نبی مرسل کو بھیجی جاتی ہے اور یہ ایسی نص ہے کہ جس میں تاؤیل اور تعریض درست نہیں ہے اور جو اس کا انکار کرے گا تو کافر ہو جائے گا)

اسی طرح نامور فقیہہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انبیائے کرام اللہ رب العزت کی طرف سے جس دین اور وحی کی اطلاع دیتے ہیں اس میں اور پیغامِ خداوندی کے پہنچانے میں وہ امت کی طرف سے متفقہ طور پر معصوم قرار دیے گئے ہیں لہذا وہ جو بھی من جانب اللہ لاتے ہیں اس پر ایمان لانا فرض ہے۔[1]

علاوہ ازیں امام عبد الوہاب شعرانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پیغمبر یا رسول ہمارے لیے اپنے اقوال وافعال اور تقریر کے ساتھ شریعت بناتے ہیں اور اگر ان سے بھی کسی گناہ کا سرزد ہونا پایا گیا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت کے بنانے اور تشکیل دینے میں گناہوں کی آمیزش شامل ہے جب کہ اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں اسی طرح شیخ محی الدین کی فتوحات میں یہ عبارت ہے کہ رسول کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کو اللہ کی جانب سے جملہ امور دینیہ کی تبلیغ و اشاعت میں عصمت حاصل ہو۔[2]

مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آیات واحادیث اور مفسرین و محدثین کے اقوال و تشریحات اور فقہاء کرام و متکلمین کی آراء کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انبیاء کرام صغائر و کبائر سمیت ہر قسم کے گناہوں سے چاہے وہ سہواً ہوں یا قصداً اور چاہے نبوت سے پہلے ہوں یا بعد میں ہوں ہر حالت میں معصوم اور محفوظ ہوتے ہیں البتہ بعض انبیاء کرام سے "زلات" کا صدور ہوا ہے مگر امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ زلات سے ترک اولیٰ یا ترک افضل کی نوعیت کے امور مراد ہیں اور یہ کہ ان پر کسی لحاظ سے گناہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ معصیت یا گناہ سے مراد یہ ہے کہ جو نافرمانی کے ارادے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پامالی کی جائے اور معصیت سے مراد وہ گناہ ہے جو قصداً کیا

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، دار الوفاء اسکندریہ، مصر، 6/155

[2] الشعرانی، عبد الوہاب بن احمد بن علی، الیواقیت الجواہر فی بیان عقائد الاکابر، دار الاحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، 2/2

جائے۔لہذا معلوم ہوا کہ جو گناہ قصداً اور نیت کے بغیر صادر ہو جائے اس پر سرے سے گناہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا اور گناہ گار وہ کہلائے گا جو رغبت وارادے سے گناہ کبیرہ سرانجام دے۔

اس طرح کا فعل عصمت کے منافی ہے اور اس کا صدور حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام سے ناممکن اور محال ہے۔اسی طرح زلت یا لغزش سے مراد ایسا فعل ہے جو قصد وارادہ کے بغیر سرزد ہو جائے اور یہ بظاہر خلاف فعل بھی ان امور میں سرزد ہوتا ہے جو اولیٰ وافضل کے ترک پر مبنی ہوں اور ان پر امت کے اہل علم کے مطابق متفقہ طور پر معصیت اور گناہ کا اطلاق ناجائز ہے چنانچہ اس طرح کی لغزش نہ ہو تو عصمت اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ بائیں معنی انبیاء کرام سے لغزشوں کا انجام پانا ممکن ہے مگر انبیاء کو ان لغزشات پر بھی قائم نہیں رہنے دیا جاتا اور علی الفور ان کو تنبیہ کر دی جاتی ہے جیسا کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے جو لغزش صادر ہوئی تو اس کے سرزد ہونے میں ان کے ارادے ونیت کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔

عصمتِ انبیاء کی کلامی تعبیر:

لغت میں لفظِ عَصَمَ یعصِمُ سے ہے جو باب ضرب یضرب سے مصدر ہے، اس کا لغوی مطلب روکنا، محفوظ رکھنا اور گناہوں سے بچانا ہے۔ اصطلاح میں عصمتِ انبیاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے جس کے سبب ان سے صدورِ گناہ شرعاً محال ہے۔

بعض حضرات کے نزدیک عصمتِ انبیاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انبیاء کرام علیہم السلام کی جسمانی اور نفسیاتی فضیلت کی وجہ سے اعلیٰ مرتبے میں ان پر نزولِ رحمت وبرکت میں ان کی مدد کی ہوتی ہے جس کے باعث ان کے قلوب کی حفاظت ہوتی ہے اور ان کے ساتھ توفیقِ خداوندی بہر صورت شامل ہوتی ہے۔پھر عصمت کے معانی میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔

بعض علما کے ہاں عصمت سے مراد عدم قدرت علی المعصیۃ ہے جبکہ جمہور اہلِ علم کے ہاں لفظِ عصمت کے معانی یہ ہیں کہ عصمت ایک ایسی خصلت کو کہا جاتا ہے جو معصوم کو کسی معصیت کے ارتکاب سے بلا کسی اکراہ واجبار کے روکتی ہے، یہاں تک کہ معصوم ترک معصیت اور فعلِ واجب میں مجبور نہیں ہوتا۔

اسی لیے امام رازی رحمہ اللہ کے مطابق معصوم سے مراد وہ ہے جو گناہ پر قادر نہ ہو۔ جبکہ بعض کے نزدیک گناہ پر قدرت تو ہوتی ہے مگر معصوم کے جسم اور نفس میں ایسی صفات ہوتی ہیں کہ وہ ان کو گناہ کے صدور سے روکتی ہیں۔

عصمت کا یہ معنیٰ نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے قدرت واختیار کو سلب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ سعد

الدین التفتازانی رحمہ اللہ شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں:

وحقيقة العصمة: ان لا يخلق الله تعالى في العبد الذنب مع بقاء قدرته و اختياره و هذا معنى قولهم هي لطف من الله تعالى يحمله على فعل الخير و يزجره عن الشر مع بقاء الأختيار)

(عصمت کی حقیقت یہ ہے کہ بندے کی گناہ پر قدرت و اختیار کے باوجود اللہ تعالیٰ اس میں گناہ نہ پیدا کرے۔ اور اہلِ علم کے اقوال کا معنیٰ یہی ہے کہ عصمت ربِ کائنات کا لطف و کرم ہے جو انسان کو اس کے اختیار کے باوجود اچھے فعل پر آمادہ اور برے فعل سے روکے رکھتا ہے)

اس کا مطلب یہی ہوا کہ قدرت و اختیار کے باوجود ان سے گناہ کا صدور ناممکن ہے یہ ان پر اللہ کے بے پناہ لطف و عنایت کے باعث ہے اور یہی فضلِ خداوندی ان کو درجہ عصمت پر فائز کرتا ہے۔ چنانچہ ان عبارات سے یہ ظاہر ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور فرشتوں کی عصمت میں کافی واضح فرق ہے کیونکہ فرشتوں کے معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں گناہ کے صدور کی طاقت و اختیار ہی نہیں ہوتا جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ اختیار و طاقت کے باوجود ان سے فضلِ خداوندی کے پیشِ نظر گناہ کا صدور مشکل ہوتا ہے۔

متکلم اسلام قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

{ واما عصمتهم من هذا الفن قبل النبوة فللناس فيه خلاف ؛ والصواب انهم معصومون عليهم السلام قبل النبوة من الجهل بالله وصفاته والشك في شيء من ذلك. و قد تعاضدت الأخبار والآثار عن الأنبياء بتنزيلهم عن هذه النقيصة منه ولدوا ، ونشأتهم على التوحيد والإيمان ، بل على اشراق انوار المعارف ، ونفخات الطاف السعادة . " }[1]

(انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے بارے میں یہ حضرات بعثت سے پہلے بھی ذات و صفات باری میں کسی طرح کے شک و اوہام میں ہر گز گرفتار نہ تھے اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے قبل بھی معصوم عن الخطاء ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس بابت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تمام واقعات و حالات جو انبیاء کرام کے حوالے سے خود ان ہی کی زبان سے نقل کیے جاتے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اپنی پیدائش سے بھی ہر قسم کے نقائص سے مبرا و منزہ ہیں)۔

[1] قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی, 1/633.

یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اللہ عزوجل کی توحید کے سائے میں اور ایمان باللہ کے ہمراہی ہو کر پرورش پاتے ہیں بلکہ معارف وانوار کی بارشوں میں ان کی نشو ونما ہوتی ہیں۔

اس حوالے سے پوری امت کا اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کفر وشرک اور ہر اس چیز سے جو مخلوق کے لیے نفرت وعار کا باعث ہو ان سب سے بہر صورت معصوم و منزہ ہیں اور گناہِ کبیرہ اور صغائرِ رذیلہ سے بھی بالاجماع معصوم ہیں۔ چنانچہ شرح صاحب المواقف علامہ سید شریف جرجانی کی عبارت کا مفہوم یوں ہے کہ:

ہمارے ہاں عصمت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام میں گناہ پیدا نہ کرے۔ جب کہ حکماء کے ہاں عصمت ایک ملکہ ہے جو گناہوں کی قباحت اور عبادات کی فضیلت کے علم کے باعث ان کو گناہوں سے روکتی ہے اور عبادات پر ابھارتی ہے اور اوامر و نواہی کی مسلسل وحی کے باعث یہ صفت مزید راسخ ہو جاتی ہے۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام سے جو بھول کر اور بعض کے ہاں عمداً صغائر صادر ہوتے ہیں یا وہ کسی اولیٰ اور افضل کام کو چھوڑ دیتے ہیں، اس سے ان کی عصمت متاثر نہیں ہو گی، کیونکہ انسانی صفات ابتداءً غیر راسخ ہوتی ہیں، بعد میں آہستہ آہستہ راسخ ہوتی رہتی ہیں جبکہ ایک قوم نے عصمت کی تعریف سے متعلق بولا ہے کہ "کسی انسان کی روح یا اس کے بدن میں ایسی خصوصیت کا نام ہے کہ جس کے باعث اس سے گناہوں کا صدور واقع ہوتا ہے" یہ تعریف اس لیے باطل ہے کہ اگر ان سے گناہوں کا صدور محال ہو تو وہ گناہوں کے چھوڑنے پر دنیا میں تعریف اور آخرت میں ثواب کے مستحق نہ ہوں۔ کیونکہ جو چیز محال ہو اس کے چھوڑنے سے تعریف ہوتی ہے نہ ثواب۔ اس لیے کہ اس کا کرنا قدرت اور اختیار میں نہیں ہے۔

اس بات پر اجماع بھی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ترک معاصی سے ثواب ہوتا ہے اور وہ گناہوں کے چھوڑنے کے مکلف ہیں۔ اور اگر ان سے گناہوں کا صدور محال ہوتا تو ان کو مکلف نہ کیا جاتا نہ ہی ثواب دیا جاتا، کیونکہ محال کو چھوڑنے کا مکلف نہیں کیا جاتا نہ اس پر ثواب دیا جاتا ہے۔ تبھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: اے نبی! آپ فرما دیجئیے کہ میں تمہاری طرح بشر ہی ہوں، میری جانب وحی کی جاتی ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو امور بشریت کی طرف راجع ہیں آپ ان میں تمام بشر کی مانند ہیں اور آپ ﷺ کا امتیاز صرف وحی سے ہے۔ اس لیے جیسے دیگر تمام بشر سے گناہوں کا صدور محال نہیں ہے انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی معاصی کا صدور محال نہیں ہو گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور عام لوگوں میں صرف بلحاظِ وحی ہی فرق نہیں ہوتا بلکہ خصوصیات کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی بشریت مادی کثافتوں سے منزہ ہوتی ہے اور کمال قرب الٰہی کی وجہ سے ان کا دل انوارات ربانی سے منور ہوتا ہے اور جتنا خوفِ خداوندی ان کو ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ہوتا۔

اسی طرح مواقف وشرح المواقف میں ہے:

(أجمع أهل الملل و الشرائع) كلها (على وجوب عصمتهم عن تعمد الكذب فيما دل المعجز) القاطع على صدقهم فيه (و اما سائز الذنوب فهي اما كفر او غيره) من المعاصي۔ (و اما الكفر فأجتمعت الأمة على عصمتهم عنه) قبل النبوة و بعدها، و لا خلاف لاحد منهم في ذلك (و اما غير الكفر، فاما الكبائر او الصغائز۔۔۔اما الكبائر) أي صدورها عنهم (عمدا فمنعه الجمهور) من المحقيقين و الأئمة (و لم يخالف فيه إلا لحشوية و الأكثر على إمتناعه سمعا)۔۔۔فامتناع الكبائر عنهم عمدا مستفاد من السمع و اجماع الأمة قبل ظهور المخالفين في ذلك)

(تمام اصحاب مذاہب و ارباب شرائع کا اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی جن باتوں کی صداقت کا ثبوت معجزہ سے ہو ان میں جھوٹ سے ان کا معصوم ہونا ضروری ہے۔۔۔بقیہ گناہ دو قسم کے ہیں، کفر اور غیر کفر۔۔کفر سے قبل نبوت اور بعد نبوت معصوم ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس میں کسی کا بھی کوئی اختلاف نہیں۔ جہاں تک کفر کے علاوہ دوسرے گناہ ہیں تو وہ صغائر اور کبائر دو اقسام پر مبنی ہیں، قصداً صدورِ کبائر انبیاء سے جمہور ائمہ و محققین کے ہاں ناممکن ہے اور اس باب میں سوائے ایک فرقہ حشویہ کے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ جمہور میں سے اکثر محققین دلیل سمعی کتاب و سنت کے نصوص اور مخالفین کے ظہور سے پہلے اجماعِ امت کے قیام کی بنیاد پر کبائر کے صادر ہونے کو محال کہتے ہیں۔ جب کہ بعض اشاعرہ اور جمہور معتزلہ عقلی دلیل کے باعث محال مانتے ہیں)

اسی طرح وہ صغائر جو مخلوق کے لیے ننگ و عار کا باعث نہیں ہیں ان کا صدور بھول چوک سے ہو سکتا ہے، مگر یہ فی الواقع کوئی گناہ نہیں ہے کہ بھول چوک پر شریعت کا قلم جاری نہیں ہوتا، چنانچہ ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

و اما مايكون بغير قصد و تعمد كالسهو و النسيان في الوظائف الشرعية مما تقرر الشرع بعدم تعلق الخطاب و ترك المؤاخذة عليه) كالسهو في الصلوة و النسيان في الصيام (فاحوال الأنبياء في ترك المؤاخذة به، و كونه ليس بمعصية لهم مع أممهم سواء) كما يشير اليه قوله تعالى: "ربنا لا تؤاخذنا ان نسينا او أخطأنا" و حديث "رفع عن أمتي الخطاء و النسيان" كما رواه الطبراني عن ثوبان مرفوعا بسند صحيح۔

(انبیاء کرام علیہم السلام سے بغیر ارادہ و قصد امورِ شرعیہ میں جو خلاف ورزی ہو جائے یعنی بھول چوک سے (کوئی غیر شرعی کام ہو جائے) جس سے شریعت کی قرارداد کے مطابق خطابِ الٰہی کا تعلق ہی نہیں، اور نہ ہی اس پر کوی گرفت ہو گی۔ جیسے نماز میں سہو اور روزے میں بھول، تو یہ جیسے امت کے لیے معصیت نہیں ہے اور نہ ہی اس پر

مؤاخذہ ہے ویسے ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے بھی قابلِ مؤاخذہ و معصیت نہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت و حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "اے ہمارے رب! ہماری بھول یا غلطی پر ہم سے مؤاخذہ نہ کرنا"۔۔۔اور حدیث یہ ہے کہ (میری امت سے خطا اور نسیان کا گناہ ہونا اٹھا لیا گیا ہے) اس کو امام طبرانی نے بروایت ثوبان جنابِ رسول اکرم ﷺ سے بسند صحیح روایت کیا ہے)

چنانچہ درج بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ: اول: انبیاء کرام علیہم السلام کفر و شرک اور صغائر و کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ دوم: امورِ شرعیہ میں سے بعض اُمور میں ان سے سہو و نسیان ممکن ہے لیکن یہ معصیت میں شامل نہیں ہوگا۔ سوم: ان جملہ اُمور میں اہلِ علم کا اتفاق ہے اور ان کے مابین کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں سوائے فرقہ حشویہ کے، جس کے عقائد اسلامی اصولوں کے خلاف ہیں۔

محققین نے عصمت کی بحث کے دائرے کو کافی وسعت دی ہے اور بڑی باریکی اور عرق ریزی سے ان تمام اُمور پر بحث کی ہے جن سے انبیاء کرام علیہم السلام کے دامن عصمت کے داغ دار ہونے کے امکانات تھے۔ چنانچہ کتاب الشفاء میں قاضی عیاض مالکی اور شرح شفاء میں ملا علی قاری نے مسئلہ عصمت پر بڑی مفصل گفتگو کی ہے۔ جس کا خلاصہ اردو میں یوں کیا جا سکتا ہے:

آنحضرت ﷺ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ناآشنا ہونے سے معصوم ہیں اور ایسی حالت سے بھی معصوم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے اجمالی علم کے منافی ہو ان برگزیدہ حضرات کے لیے یہ عصمت بعد از نبوت اجماع اور دلائل عقلیہ سے ثابت ہے جبکہ قبل از نبوت آنحضرت ﷺ کی احادیثِ مبارکہ، ارشادات اور ائمہ کرام کے اقوال و توضیحات سے ثابت ہے۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے ناممکن ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کی صفات کا علم انہیں حاصل نہ ہو اور وہ اس معاملے میں معصوم ہیں کہ ان میں ایسی بے علمی کی کیفیت پائی جائے۔

آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن احکامات اور کتاب و سنت کی جس وحی جلی و خفی کی تبلیغ و تقریر کی وہ اس سے بے خبر اور غافل ہوں، ایسا قطعاً نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے یقیناً بدلیل عقلی و شرعی قطعی طور پر معصوم ہیں۔

یعنی یہ بات آپ ﷺ کی عصمت کے خلاف ہے کہ احکامات خداوندی میں آپ ﷺ کے لیے کسی بھی طرح کی بے خبری پیدا ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ اس سے معصوم ہیں کہ امورِ شرعیہ سے آپ ﷺ ناواقف ہوں۔ یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی وقت آپ ﷺ سے سہو و نسیان صادر ہو لیکن دائمی طور پر اس پر برقرار رہنا ناممکن ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کو تنبہ حاصل ہو جائے گا۔

مذکورہ بحث سے یہ بات سامنے آئی کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی عدمِ معرفت سے معصوم ومحفوظ ہیں اور یہ کہ احکاماتِ شرعیہ میں آپ ﷺ کی ذات اقدس پر بے خبری کی حالت نہیں پیدا ہو سکتی کہ یہ بے خبری نبوت جیسے عظیم منصب کے شان کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے کسی خلافِ واقعہ بات کا ظہور ہو یا کذب کا صدور ہو (معاذ اللہ) تو احکامات شرعیہ میں سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ تبھی کذب وغیرہ رذائل سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پاک صاف رکھا ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ اور ان کے اقوال کی تشریح میں ملا علی قاری کا موقف ذیل میں اردو میں بیان کیا جاتا ہے:

آنحضرت ﷺ نبوت کے وقت قصداً یا سہواً خلافِ واقعہ خبر اور کذب سے مطلقاً معصوم ہیں۔ اور یہ کذب وخلف کتاب وسنت کے نصوص، اجماعِ امت اور عقل وبرہان کے مضبوط ادلہ کے باعث آپ ﷺ سے محال ہے۔ نبوت کے ظہور سے قبل بھی کذب سے آپ ﷺ کا معصوم ہونا یقینی وقطعی ہے تاکہ نبوت کے بعد امت کسی بھی لحاظ سے شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو۔ کبیرہ گناہوں سے تو باجماعِ امت آپ ﷺ پاک ومنزہ ہیں جب کہ تحقیق کے مطابق صغیرہ گناہوں سے بھی منزہ ہیں کیونکہ باریک نگاہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جن امور کو صغائر سمجھا گیا ہے وہ خلاف اولیٰ سے زیادہ نہیں۔

مستشرقین کے اشکالات کا محاکمہ:

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کو شرک وکفر اور فسق وفجور کی ضلالت سے نکال کر راہ راست پر لانا اور ان کا تعلق اللہ رب العزت سے مضبوط بنانا تھا۔

آنحضرت ﷺ کے مکی دور زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو بعض ضعیف روایات کا سہارا لے کر ایک غیر معمولی واقعہ جس کو "الغرانیق العلیٰ" کہا جاتا ہے کفار کے معبودانِ باطلہ کو سچا ثابت کرنے اور آنحضرت ﷺ کی بعثت اور مقاصد نبوت کو بے وقعت اور بے معنیٰ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ اسلامی مضبوط اور مستحکم عمارت کی بنیادیں انہدام کا شکار ہو جائیں۔

چنانچہ بعض سیرت نگاروں، محدثین اور مفسرین جن میں ابن جریر طبری، ابن اسحاق، طبرانی، ابن سعد اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ شامل ہیں نے اس واقعہ کو ایسے انداز میں نقل کیا ہے کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے اس موقع پر غلطی سرزد ہوئی۔ ان کے مطابق آنحضرت ﷺ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ جس سے کفار ومشرکین کی مخالفت اختتام پذیر ہو جائے اور لوگ دین میں مکمل شمولیت اختیار کر لیں چنانچہ ایک روز جب آپ ﷺ سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے "تلک الغرانیق

العلیٰ" کے الفاظ ادا کر دیے۔

ابن جریر طبری نے اس واقعہ کی تفصیلات ان الفاظ میں ذکر کی ہیں: محمد بن کعب القرظبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی قوم نے آپ ﷺ سے منہ پھیر لیا ہے اور صرف اس حکم کے باعث جو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا آپ ﷺ کی قوم نے علیحدگی اختیار کر لی ہے تو حضور ﷺ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم اتار لیتا جس سے ان کے اور آپ ﷺ کے مابین تعلقات پھر قائم ہو جائے۔ قوم کی محبت اور ان کی ترقی کی نیت سے آپ ﷺ کی چاہت یہ تھی کہ ان کے معاملے میں جو شدت کا مظاہرہ جو ہوا ہے اب اس میں نرمی پیدا کی جائے جیسے ہی دل میں خیال آیا تو آپ ﷺ نے اس خواہش اور تمنا کی آرزو کی اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم کی آیات نازل فرمائیں جب حضور ﷺ قول خداوندی "افرئیتم اللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ" پر پہنچے تو شیطان نے ان کی زبان پر ان الفاظ کو جاری کر دیا: (تلك الغرانيق العلى---وان شفاعتهن لترتجىٰ)

ان الفاظ کے سننے سے قریش کو بہت خوشی ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ میں ہمارے معبودوں کا تذکرہ کیا ہے تو انہوں نے خوشی سے نعرہ لگایا جب اس سورۃ کا مقامِ سجدہ آیا اور سورۃ کا اختتام ہوا تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام مسلمانوں نے آپ ﷺ کی اتباع، حکم اور وحی کی تصدیق میں آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا اور کیوں کہ مشرکین نے آپ ﷺ کی زبان سے اپنے معبودان کی تعریف سنی تھی اس لیے کفار و مشرکین اور تمام لوگوں نے بھی سجدہ کیا اور تمام مسجد میں جتنے مؤمن و کافر موجود تھے سب سجدہ ریز ہو گئے۔

دوسرے دن جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لائے اور یہ سورۃ پڑھنے کا بولا۔ جبرئیل نے سورۃ سنی تو کہا کہ یہ دونوں کلمے تو میں نے نہیں سکھلائے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہلوایا میں نے اس کے علاوہ کچھ نہیں بولا چنانچہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی آیت 73 تا 75 نازل فرما کر آپ ﷺ کی اس لغزش کی تنبیہ فرمائی۔[1]

مذکورہ واقعہ والی روایت کو دلیل و ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے مستشرقین کا یہ کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب چاہتے تو دین میں تحریف کر دیتے اور جب چاہتے تو آیات قرآنیہ کو اپنی چاہت و مرضی کے مطابق ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ ولیم (William Muir) اس حوالے سے لکھتا ہے:

(کسی آیت کو منسوخ کرنے کا ایک انتہائی اہم واقعہ (وہ دیویاں معزز ہیں اور

---

[1] الطبری، محمد بن جریر، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف القاہرہ، 1977ء، 2/338

ان کی سفارش مقبول ہیں والی آیت کی تنسیخ ہے جسے کافی عرصہ آنحضرت ﷺ قرآن کے جزو کے طور پر تلاوت کرتے رہے ہیں یعنی یہ الحاق جملے اللہ کی جانب سے تھے اور جب ایک عرصہ تک تلاوت نہ کرنے سے اپنے مقصد میں آپ ﷺ کو کامیابی نہ ملی تو پھر ان کو منسوخ کر دیا گیا)[1]

معروف مستشرق منٹگمری واٹ(William Montgomery Watt) بھی یہاں شک کا شکار ہے اس کے مطابق اس سلسلے میں وحی کا نزول بھی ہوا اور آپ ﷺ نے پڑھ کر لوگوں کو سنا بھی دیا مگر محمد ﷺ کو بعد میں یہ اندازہ ہوا کہ یہ درست نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قرآن سے نکال دیا وہ مزید کہتا ہے: محمد ﷺ مکہ کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ افہام و تفہیم کرنا چاہ رہے تھے ان کا مدخولہ الفاظ کی غلطی کا احساس اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کے درمیان مصالحت ممکن نہیں۔[2]

اس حوالے سے لین پول :Lanepole) لکھتا ہے:

(تمام لوگ اس مصالحت سے خوش ہوکر اللہ کے حضور سر بسجود ہوگئے ۔ تمام شہر نے اس مشترکہ مذہب کا اقرار کرلیا مگر صحرا کا یہ رویہ دیکھنے والا ایسا فرد نہ تھا کہ کسی جھوٹی بات پر توقف کرتا۔ مکہ کا پورا شہر بھی اس کی نذر کردیا جاتا تو وہ اپنی اندرونی سچائی کو جھٹلاتے رہنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے سرِ عام اعتراف کیا کہ اس سے لغزش ہوگئی تھی اور اس کو شیطان نے ورغلایا تھا، اس سے واضح طور پر اپنے الفاظ واپس لیے اور کہا کہ ان مورتیوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ محض نام ہیں جن کو ان کے آباؤ اجداد نے وضع کرلیا ہے.[3]

آنحضرت ﷺ نے سورۃ نجم کی تلاوت کفار کے مجمع میں فرمائی تھی، چنانچہ لوگوں پر اس سورت کا ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ ریز ہوگئے جو کہ خلافِ قیاس نہیں ہے اس لیے کہ اس طرح کے واقعات اس کے علاوہ بھی پیش آچکے تھے احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت

---

[1] William Muir, *Muhammad and Islam*, p: 52
[2] Montgomery Watt, *What is Islam*, p: 78
[3] Stanlely Lanepool, *Introduction to Selection from Quran*, OUP, London, 1975, p:124

بتوں کی الوہیت کے تسلیم کرنے کا ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس واقعے کے حوالے سے تفصیلات بیان کی ہیں۔

وضاحت اتنی سی ہے کہ سورۃ نجم کے نزول کے موقع پر عوامی مجمع میں آپ ﷺ نے اس کی آیات تلاوت کیں اور پھر آخر میں سجدہ فرمایا تو آپ ﷺ کے ساتھ نہ صرف مسلمان بلکہ مشرکین اور جنات وانس میں سب لوگ سجدہ میں شامل ہوگئے۔[1] یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ آیا یہ سورت کب نازل ہوئی ہجرتِ حبشہ سے قبل یا بعد میں یا اس ہجرت کے عین موقع پر؟ ابن سعد اور ابن جریر طبری کے مطابق اس سورت کا نزول ہجرتِ حبشہ کے بعد ہوا۔[2]

مستشرقین اور بعض معترضین اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے یہاں لغزش تو ضرور ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات کے ذریعے اس کی تلافی فرمادی اور یہ آیات قرآن کریم سے خارج کردی گئیں جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

﴿وَإِن كَادُواْ لَيَفۡتِنُونَكَ عَنِ ٱلَّذِيٓ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِيَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهُۥۖ وَإِذٗا لَّٱتَّخَذُوكَ خَلِيلٗا ، وَلَوۡلَآ أَن ثَبَّتۡنَٰكَ لَقَدۡ كِدتَّ تَرۡكَنُ إِلَيۡهِمۡ شَيۡـٔٗا قَلِيلًا إِذٗا لَّأَذَقۡنَٰكَ ضِعۡفَ ٱلۡحَيَوٰةِ وَضِعۡفَ ٱلۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيۡنَا نَصِيرٗا﴾[3]

(اے نبی! انہوں نے اس بارے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ وہ آپ کو فتنے میں مبتلا کرکے اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے آپ کی جانب بھیجی ہے تاکہ آپ ہمارے نام پر اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لیں۔ اگر آپ ایسا کرتے تو وہ ضرور آپ کو اپنا دوست بنالیتے اور اگر ہم آپ کو مضبوط نہ رکھتے تو آپ ان کی جانب کسی حد تک جھک جاتے۔ لیکن اگر یوں ہوتا تو ہم آپ کو دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزا چھکاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے سامنے آپ کوئی مددگار نہ پاتے)

چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ اس تنبیہ پر آپ ﷺ کافی رنجیدہ خاطر ہوئے جس کو زائل کرنے کے لیے درج ذیل آیات نازل ہوئیں۔

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع صحیح، کتاب التفسیر، باب فاسجدوا للہ واعبدوا، 2/18

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار الفکر، بیروت، لبنان، 1977، 1/139، طبری، ابن جریر، تاریخ الطبری، 2/338

[3] بنی اسرائیل: 73-75

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٖ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلۡقَى ٱلشَّيۡطَٰنُ فِيٓ أُمۡنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ ٱللَّهُ مَا يُلۡقِي ٱلشَّيۡطَٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٞ لِّيَجۡعَلَ مَا يُلۡقِي ٱلشَّيۡطَٰنُ فِتۡنَةٗ لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٞ وَٱلۡقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمۡۗ وَإِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ لَفِي شِقَاقِۭ بَعِيدٖ﴾[1]

(اور ہم نے اے نبی! آپ سے قبل نہ کوئی رسول بھیجا ہے نہ نبی کہ جب اس نے آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں خلل اندازی کی ہو۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان دخل اندازیاں کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (وہ ایسا اس لیے نہیں ہونے دیتا کہ) تاکہ شیطانی خرابی کو فتنہ بنادے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے اور ان کے دل سخت ہیں۔ اور بے شک ظالم لوگ بغض میں بہت دور نکل گیے ہیں)

مندرجہ بالا سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ حج کی آیات کا زمانہ وجہ نزول الگ الگ ہے جس کا سورۃ نجم سے دور کا بھی کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیات واقعہ معراج کے بعد 11 یا 12 نبوی میں نازل ہوئیں۔ گویا کہ یہ عتاب و سرزنش کا عمل کے لغزش کا صدور سے پانچ یا چھ سال بعد پیش آیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ غلطی تو آج سرزد ہو اور اس پر عتاب اور تنبیہ چھ سال بعد ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح سورۃ الحج کی مذکورہ بالا آیات بھی واقعہ غرانیق کے کافی سال بعد نازل ہوئیں یہ سورۃ اگرچہ مکی و مدنی دونوں ادوار پر مشتمل ہے، مگر مذکورہ آیات سن 1 ھ میں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ واقعہ غرانیق کی سورۃ الحج کی ان آیات سے کوئی تائید نہیں ہوتی اور سورۃ نجم میں آنحضرت ﷺ کی لغزش کی اصلاح کے لیے یہ آیات اسی وقت نازل ہونی چاہیئے تھیں نہ کہ آیات عتاب کے نزول کے بعد۔

لہٰذا ان آیات کو اس واقعہ کی تائید میں پیش کرنا درست نہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بارے میں جو کہا جاتا ہے کہ سورۃ نجم کی تلاوت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے بتوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ایک خاص جگہ پر اس الحاقی جملے کو چسپاں کرنے کی ناکام کوشش کی ہے پھر اسے منسوخ بتایا گیا ہے مگر اس سورۃ کے الحاقی جملے سے قبل

[1] الحج:52-53

اور بعد والی آیات پر اگر غور کیا جائے تو یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس کا اگلی اور پچھلی آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

چنانچہ ان آیات کے مضامین یہ واضح کر رہے ہیں کہ وہاں آپ ﷺ کی نبوت کی حقانیت اور آپ ﷺ کے جملہ اوصاف کا مکمل ذکر ہے اور پھر مشرکین کو کہا جارہا ہے کہ تم نے معبودِ حقیقی کو ترک کر کے ان معروف دیویوں کو معبود بنالیا ہے اور تم نے بیٹوں کو اپنے لیے خاص کر کے بیٹیوں کو رب کے حصے میں ڈال دیا ہے جو کہ غیر متوازن تقسیم ہے۔ ان بتوں کی کوئی اہمیت و اصلیت نہیں اور تم اپنے آباؤاجداد کی روش پر قائم ہو۔

یہ سلسلہ کلام ایسا نہیں ہے کہ جس میں درمیان کلام میں غیر اللہ کی اہمیت کو بھی بیان کر دیا جائے جیسا کہ الحاقی جملے سے پہلے اور بعد والی آیات کو اگر ملا کر دیکھا جائے تو پوری سورت ہی بے وزن معلوم ہو گی اور یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس میں خارج از قرآن الفاظ کی آمیزش قطعاً نہیں ہو سکتی اور اگر اس کی یہ خصوصیت نہ ہوتی تو نا معلوم اس میں کتنی تحریف ابھی تک کی جاچکی ہوتی۔

اگر آپ ﷺ سے (معاذاللہ) دیویوں کے تسلیم کرنے کی لغزش صادر ہوئی ہوتی تو اس کی تنسیخ اسی موقع پر فوراً کر دی جاتی کیونکہ قرآن کریم میں بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جن پر مسلمان کا عمل پیرا ہونا ضروری ہے مگر جیسے ہی اللہ کے منشا کے مطابق اس حکم کی اہمیت ختم ہوتی تو اس کے بدلے اللہ نے دوسرا حکم نازل فرمادیا اور بتادیا کہ کون سی آیت ناسخ ہے اور کون سی منسوخ۔ اور اس بابت مفسرین کی طویل ابحاث ہیں جو مختلف تفاسیر میں ملتی ہیں جب کہ واقعہ غرانیق کے حوالے سے ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی۔

اسی طرح اگر اس واقعہ کے اندر کسی حد تک سچائی بھی ہوتی تو احادیث کے مستند مجموعہ جات میں اس کا تذکرہ ضرور ملتا لیکن ان صحیح احادیث میں اس کا ذکر نہ ہونا اس واقعہ کے من گھڑت ہونے کی دلیل ہے۔ اس واقعے کو بیان کرنے والے وہ لوگ جنہوں نے اس کو بطورِ حقیقت پیش کیا ہے اس کی سند کو دیکھا جائے تو کوئی بھی روایت سند کے لحاظ سے مضبوط نہیں ہے۔ علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے شرح المواہب اللدنیہ میں ان تمام راویوں پر تفصیلی کلام کیا ہے جنہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور جہاں جہاں کمزوریاں موجود ہیں ان کی نشان دہی بھی کی ہے۔

اسی طرح علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی ان تمام روایات کا استقصاء کر کے تمام طرق کی کمزوریوں کو واضح کیا ہے اور اس کو افسانہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی روایات کسی صحابی رسول ﷺ سے کسی معتبر سند کے ساتھ نہیں ملتیں اور اس کے جملہ طرق مرسل ہیں۔ اسی طرح ابن کثیرؒ نے بھی ان تمام روایات کو مرسل اور منقطع کہا ہے اور بیہقیؒ کے نزدیک ازروئے نقل بھی یہ واقعہ درست نہیں۔ ابن خزیمہ کے مطابق یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے جب کہ قاضی عیاض کے نزدیک اس واقعہ کے ضعف کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ صحاح میں اس کا کوئی ثبوت

نہیں ملتا اسی طرح امام نووی کہتے ہیں کہ عقلاً اور نقلاً ہر طرح یہ روایت ثابت نہیں۔[1]

شیخ عبد الحق محدث دہلوی مذکورہ واقعہ کو من گھڑت قرار دیتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی عصمت کے خلاف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ زبانِ حق ترجمان صاحب وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ سے بتوں کی تعریف ہو جائے اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ قرآن کریم میں قصداً یا سھواً کسی چیز کا اضافہ فرمائیں جو قرآن کریم میں سے نہ ہو بالخصوص ایسی شئ جو توحید کے حوالے سے اپنی ہی لائی ہوئی چیز کے منافی ہو۔[2]

چنانچہ مذکورہ واقعہ کو بنیاد بناکر جن لوگوں نے خواہ وہ مستشرقین ہوں یا دیگر معاندینِ اسلام آنحضرت ﷺ کی عصمت کے خلاف استدلال کیا ہے ان کا یہ استدلال اور مذکورہ واقعہ من گھڑت اور خود ساختہ ہونے کے ساتھ ساتھ منصبِ نبوت کی شان اور حضور اقدس ﷺ کی عصمت کے شدید منافی ہے اور پیغمبر جہاں کبیرہ وصغیرہ ہر طرح کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں وہاں ہر طرح کی ایسی لغزشوں سے جو سراسر توحید اور بنیادی عقائدِ اسلام کے منافی ہوں بھی مکمل طور پر منزہ اور پاک ہوتے ہیں۔

عصمتِ انبیاء اور آزادئ اظہارِ رائے کا مغربی تصور:

انبیاء کرام کی عصمت وناموس کے تحفظ اور احترامِ مذاہب کا مسئلہ ایک عرصہ سے بین الاقوامی حلقوں میں زیرِ بحث ہے۔ مغرب نے جب سے اپنی معاشرتی اور سماجی زندگی سے مذہب کو الگ کیا ہے اس فلسفہ کے محرکین انسانی زندگی سے مذہب اور دینی اقدار کو علیحدہ کرنے کے مشن کے ساتھ ساتھ مذہب، دینی اقدار اور خصوصاً شخصیات کی حرمت وناموس کو بھی اپنی منفی سرگرمیوں کا ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

کیونکہ ان کے ہاں یہ امر ضروری ہے کہ عالمی سطح پر مذہب اور مذہبی اقدار کو انسانی سماج سے عملی طور پر لاتعلق کرنے کے لیے مذہب اور مذہبی شخصیات خصوصاً انبیاء کرام کے خلاف بے زاری اور نفرت کی فضا قائم کی جائے جس کے لیے وہ ایک عرصہ سے کوشاں ہیں جبکہ نفرت، توہین اور استخفاف تمام مذاہب و قوانین میں جرم ہے اور تقریباً ہر ملک کے کسی عام سے عام شہری کو بھی توہین اور بے عزتی سے بچانے کے لیے نہ صرف قوانین موجود ہیں بلکہ ان پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے۔

اظہار رائے کی آزادی کو Freedom of Speech and Expression سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا سادہ اور آسان مفہوم بولنے کی آزادی ہے۔ عمل اور لکھنے کی آزادی کو بھی اظہار رائے کی آزادی میں شامل قرار دیا گیا

---

[1] الزرقانی، شرح المواہب اللدنیہ، 1/138، بحث: الغرانیق الاولیٰ

[2] دہلوی، عبد الحق، مدارج النبوۃ مکتبہ دانش، دیوبند، 1971ء، 2/102، 101

ہے، یعنی ان کے نزدیک ہر انسان تحریر و تقریر اور عمل کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کے بین الاقوامی چارٹر کی شق نمبر 18 ملاحظہ ہو۔

> Everyone has the right to freedom of thought, conscience and religion; this right includes freedom to change his religion or belief, and freedom, either alone or in community with others and in public or private, to manifest his religion or belief in teaching, practice, worship and observance.[1]
>
> (ہر شخص کو آزادی فکر، ضمیر اور مذہب کا مکمل حق حاصل ہے اس حق میں مذہب یا عقیدے کو بدلنا، عوامی یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے)

مذکورہ چارٹر میں اقوامِ متحدہ نے اظہارِ رائے کی آزادی کی کوئی حدود متعین نہیں کی ہیں، جس کا واضح مطلب اظہارِ رائے کی آزادی کی آڑ میں ہتک عزت کا دروازہ کھولنا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس شق سے عالمِ اسلام اور مغرب کے مابین آزادئ مذہب اور آزادی رائے کے دو تنازعات کی بنیاد شروع ہوتی ہے۔

آزادی مذہب اور اظہار رائے کی حدود کیا ہیں اور ان کے بارے میں مسلمانوں کے عالمی طاقتوں کے ساتھ تنازعات کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کی عملی صورتیں قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور توہینِ رسالت پر سزائے موت کے قانون کے حوالے سے جو ایک عرصہ سے جاری ہے۔ چنانچہ موجودہ عالمی کش مکش اور بحث و گفتگو کو اس تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مغرب چونکہ ریاستی و حکومتی اور معاشرتی و سماجی معاملات میں مذہبی عمل دخل سے بری الذمہ ہو چکا ہے اور اس کے ہاں مذہب فقط انسان کی ذاتی رائے اور ترجیح کا نام ہے لہٰذا ریاست اور حکومت کو مذہبی معاملات میں فریق بننا روا نہیں اور یہ انسان کا ذاتی حق ہے کہ وہ کوئی بھی عقیدہ رکھے یا نہ رکھے، کسی کی عبادت کرے یا نہ کرے، کسی مذہب کو ترک یا قبول کرے، اپنے مذہب کا اعلانیہ پرچار کرے، دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے اور اپنی مذہبی رسوم کو آزادانہ ادا کرے اس کے اس حق میں مداخلت کا ریاست کو کوئی حق حاصل نہیں نہ ہی ریاست

---

[1]Zeid Ra'ad Al Hussain, *Universal Decleration of Human Rights*, Geneva 10,
Switzerland, p:38

مذہب؛ کے حوالے سے شہریوں کے مابین کوئی فرق روا رکھ سکتی ہے اور اگر حکومت یا ریاست مختلف مذہبی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے مابین الگ الگ قوانین نافذ کرتی ہے، تو یہ امتیازی مذہبی قانون ہو گا اور اس کا خاتمہ ضروری ہو گا۔

مغربی معاشرے میں آزادی کے بارے میں مختلف قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں، مجموعی لحاظ سے غالب تصور یہ ہے کہ انسان اپنے خیر و شر کے معیارات کے تعین کا اصل حق دار خود ہے اور وہ اپنی متعین کردہ اقدار کو آزادانہ طور پر اپنا سکتا ہے چنانچہ اس تصور کے تحت کوئی بھی شخص چاہے وہ آرٹسٹ ہو، کارٹونسٹ ہو، یا ڈرامہ نگار، افسانہ نویس یا کہانی نگار ہو تو وہ اس بابت مکمل آزاد ہے کہ اپنی کہانی یا کارٹون یا افسانے کا خاکہ اپنی مرضی سے منتخب کر سکے چاہے اس تخلیق سے بے شک کوئی مقدس شخصیت ہی کیوں نہ ہدفِ تنقید یا باعثِ تمسخر و استہزاء بنتی ہو یا اس کے کرداروں، مکالموں اور کہانی سے الحاد، عریانیت اور بدعقیدگی کا پرچار ہوتا ہو۔

چنانچہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی دفعہ 18 میں مذہب اور مذہبی شخصیات سے اختلاف اور ان پر تنقید و تمسخر بھی آزادی رائے اور آزادئ ضمیر کے انسانی حق کے منافی ہے جو کہ اہلِ مغرب کا ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کیونکہ اختلاف رائے اور توہین میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسلمانوں نے علمی اختلافات کا جواب ہمیشہ علمی انداز سے دیا ہے جس کا بڑا ثبوت صدیوں سے مستشرقین کے اسلام، قرآن کریم اور محمد ﷺ پر بطورِ شخصیت و کردار اعتراضات چلے آرہے ہیں جن کا مسلمان مصنفین اور اسکالرز نے دلائل کی بنیاد پر جوابات دے کر شائستگی اور تحمل کو رواج دیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ یا کسی بھی سچے رسول اور نبی کی توہین کو مسلمان کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

چنانچہ عصمتِ انبیاء کے مسئلے میں تین صورتیں بنتی ہیں۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی نبی کی عصمت کی توہین اور اس کے مذہبی جذبات کی تحقیر، خصوصاً انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت و شان میں گستاخی بھی اظہار رائے کے حق میں شامل ہے یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ کیا یہ جرم اس حد تک سنگین ہے کہ اس پر سزائے موت دی جائے؟ اور تیسرا یہ کہ سزائے موت کی تنفیذ اور اتھارٹی وسند کس کو حاصل ہو گی؟

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے اس پر پوری دنیا میں یہ اتفاق ہے کہ توہین و تحقیر کا آزادئ رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ عام شہری کو بھی ہر ملک میں ہتک عزت پر قانونی کاروائی کا حق حاصل ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کر کے اپنی عزت کی ہتک پر کسی مجرم کو سزا دلوائے اور عزت مجروح کرنے والا مجرم کہلاتا ہے تو مذاہب کے پیشواؤں اور خصوصاً انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے یہ حق کیوں تسلیم نہیں کیا جارہا؟ دوسرے مسئلے پر پورا عالمِ اسلام اور دیگر مذاہب بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تحقیر و توہین سنگین ترین جرم ہے۔

اس جرم کے ارتکاب میں ان مقدس شخصیات کی توہین کے علاوہ ان سے جڑے ہوئے پیروکاروں کے

مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور امن عامہ کو خطرے میں ڈالنا اس سے بھی سنگین ترین جرائم ہیں۔ البتہ جہاں تک تیسری بات کا تعلق ہے اس پر مکالمہ اور بحث کی گنجائش موجود ہے اور قانون کو ہاتھ میں لینے سے معاشرے میں لاقانونیت، افراتفری اور بدامنی کو فروغ ملتا ہے جس پر قابو پانے کے لیے تمام طبقات اور مذاہب کو باہمی طور پر متفقہ رائے اور مؤقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور قانون ہاتھ میں لینے کی بجائے قانون کے ذریعے نمٹنے کے طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عصمتِ انبیاء اور عصمتِ رسول ﷺ سے متعلق اربابِ علم و دانش اہلِ مغرب کے اس فکری تضاد کو واضح کر کے مغربی لامذہبیت اور انتہا پسندی و دہشت گردی کو اجاگر کریں جو اس نے مذہب کے معاشرتی کردار کو دنیا سے ختم کر دینے کی مہم میں مسلسل ناکامی کے بعد اختیار کر رکھا ہے اور جو اس امر کی غماز ہے کہ مغرب کی لامذہبیت انسانی معاشرہ میں اپنی پسپائی کو یقینی سمجھتے ہوئے ایسے طرز عمل کی علمبردار بن گئی ہے۔

چنانچہ تمام اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہوئے انسانی حقوق اور آزادی رائے کے مصنوعی نعرے کی آڑ میں انبیاء کرام کی عصمت اور عزت و حرمت کو متنازعہ بنانا انتہائی غیر قانونی، غیر شرعی اور غیر اخلاقی کام ہے جب کہ سب لوگ بخوبی یہ جانتے ہیں کہ کسی بھی شخصیت کی توہین و استخفاف نہ تو آزادی اظہارِ رائے کا تقاضہ ہے اور نہ ہی اس کا کسی بھی درجہ میں انسانی حقوق کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔

عقیدہ ختم نبوت از روئے قرآن و حدیث:

ختمِ نبوت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جس کی رو سے آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین قرار دیا گیا ہے اور اس میں کسی بھی قسم کے شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ اسلام کی حقانیت، کاملیت اور ابدیت صرف عقیدہ ختمِ نبوت ہی سے ممکن ہے۔ عقیدہ ختمِ نبوت اسلام کے ان اجماعی عقائد میں شامل ہے جو دین کے اصول اور ضروریات کا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم اور احادیث متواترہ و مشہورہ سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اگر کوئی شخص دعوائے نبوت کرے گا تو وہ دعویٰ باطل ہو گا۔

امتِ محمدیہ کا پہلا اجماع اسی بابت منعقد ہوا تھا کہ مدعی نبوت کو قتل کیا جائے۔ چنانچہ جہاں مسلمانوں کی زندگی کے چند پہلو اغیار کے نشانے پر ہیں ان میں سے عقیدہ ختمِ نبوت کے حوالے سے بھی مسلمانوں اور اسلام پر آئے روز نت نئے انداز سے تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے ہیں، جس کا بنیای مقصد مسلمانوں سے حبِ رسول ﷺ اور روحِ محمدی کو نکالنا ہے۔

قرآن وحدیث اور اجماع سے یہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ کو خاتم النبیین بایں معنیٰ تسلیم کرنا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوا اور نہ قیامت تک ہو گا لہٰذا اس سے اختلاف قرآن وحدیث اور اجماع امت کی مخالفت ہو گی۔

لغت میں کسی شے پر مہر لگانا اور اس کو اختتام اور تکمیل تک پہنچانا "ختم" کہلاتا ہے۔ جیسا کہ نامور ماہرِ لغت خلیل بن احمد لکھتے ہیں:

ختم يختم ختما أي طبع فهو خاتم و الخاتم ما يوضع على الطينة، اسم مثل العالم، و الختام: الطين الذي يختم به على كتاب، و يقال: هو الختم يعني: الطين الذي يختم به۔ وختام الوادي: اقصاه ۔ [1]

(ختم مہر لگانے کو کہا جاتا ہے، جو کیچڑ پر لگا دی جائے اور خاتم، بروزن عالم ہے اور خِتام مٹی سے بنی ہوئی اس مہر کو کہتے ہیں جس سے کتاب پر مہر لگا دی جائے۔ اور خِتام وادی کے آخری سرے کو بھی کہتے ہیں)

لفظِ ختم چونکہ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے صاحب معجم الرائد اس کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ختم يختم: ختاما و ختما۔ 1۔الشئ بلغ نهايته، 2۔الكتاب: حفظ ما فيه و فرغ منه، 3۔الشئ أو عليه: طبعه بالخاتم، 4۔الله على قلبه: جعله لايفهم، 5۔على فمه: منعه الكلام، 6۔الزرع أو عليه: سقاه اول سقية بعد البذر، 7۔البذر۔ غطاه، 8۔الله له الخير: أتمه، 9۔الأناء: سده بالطين أو نحوه ۔ [2]

(کسی چیز کی انتہا کو پہنچنا، 2۔ کسی کتاب کو حفظ یاد کرنا، 3۔ کسی شئ پر مہر لگانا، 4۔ کسی کا فہم ختم ہونا، 5۔ منہ پر مہر لگانا یعنی کلام نہ کر سکنا، 6۔ فصل اگانے کے بعد پہلی مرتبہ پانی دینا، 7۔ دانے کو مٹی میں ڈھانپنا، 8۔ اللہ نے اس کے لیے خیر کو تمام کیا، 9۔ کسی برتن کو بند کرنا وغیرہ)

چنانچہ یہاں ختم سے مراد رسالتِ محمدی کا اپنے انتہا و اختتام کو پہنچنا ہے یہ موضوع اب بند کر دیا گیا اور اللہ نے

---

[1] الفراہیدی، خلیل بن احمد، کتاب العین، تحقیق: مہدی المخزومی وغیرہ دار مکتبۃ الہلال، س ن، 14/4

[2] جبران بن مسعود، معجم الرائد، دار العلم للملایین 1992ء، 1/559

اپنے بندوں کے لیے خیر کی تکمیل فرمادی ہے اور کوئی کمی باقی نہیں رہنے دی۔

اسی طرح صاحب لسان العرب نے بھی ختم کا معنی "کسی شے کا بالکل خاتمہ ہونے" کو بیان کیا ہے۔ یعنی کسی جماعت کے خاتم یا خاتم دونوں کے معنیٰ ان کے آخر کے ہیں یعنی محمد رسول اللہ ﷺ جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کے خاتم ہیں۔ خاتم قوم اور خاتم دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہوں گے۔ یعنی قوم کا آخری فرد اور خاتم النبیین کے بھی یہی معنیٰ ہوں گے۔[1]

عقیدۂ ختمِ نبوت اور دلائلِ قرآنی:

قرآن کریم میں تقریباً ایک سو سے زائد آیاتِ کریمہ ایسی ہیں جن میں واضح طور پر ختمِ نبوت کی تصریح ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیت جس کو آیتِ ختمِ نبوت سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اس میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾[2]

(محمد (ﷺ) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ رسول اللہ اور انبیاء کے خاتم ہیں)

آیتِ مذکورہ ختمِ نبوت کے حوالے سے قطعی اور برہانِ جلی ہے جو کہ صراحتاً آنحضرت ﷺ کو آخری نبی اور انبیاء کا ختم کرنے والا بیان کر رہی ہے۔ خاتم مہر کو کہا جاتا ہے اور مہر سے مراد آخری عمل ہوتا ہے۔ یعنی آپ ﷺ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے آپ ﷺ کے بعد جو بھی دعوائے نبوت کرے گا وہ نبی نہیں بلکہ دجال و کذاب ہو گا۔ یہاں یہ بات بھی محل نظر ہے کہ اسی آیت سے جو واضح طور پر ختمِ نبوت کے مفہوم میں واضح ہے اجرائے نبوت کے مفہوم کو بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ جیسے ڈاک خانے سے مہریں لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں ویسے ہی آپ ﷺ کی مہر سے نبوت جاری ہوتی ہے جو کہ آیت کے معانی کے بالکل خلاف اور حیرت انگیز ہے۔

جمہور مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خاتم النبیین کے معانی آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا ہے چنانچہ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، ہر ایک ان میں سے یہی دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں حالانکہ میں خاتم

---

[1] الأفريقي، ابن منظور، لسان العرب، 4/25

[2] الاحزاب:40

النبیین ہوں، میرے بعد کسی قسم کا کوئی نبی نہیں ہو گا۔)[1] نانچہ اس حدیثِ مبارکہ میں آنحضرت ﷺ نے لفظ خاتم النبیین کی تفسیر "لا نبی بعدی" کے الفاظ سے خود فرمائی ہے، تبھی علامہابن کثیرؒ رحمہ اللہ مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور رسول خدا ﷺ نے متواتر حدیث کے ذریعہ بتلایا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تاکہ لوگوں کو یہ بات پتہ چل جائے کہ حضور ﷺ کے بعد جس نے بھی اس مقام کا دعویٰ کیا وہ انتہائی جھوٹا، مکار و فریبی، افتراء پرداز، خود بھی گمراہ اور دوسروں کے لیے بھی گمراہی کا باعث بننے والا ہو گا اگرچہ وہ خلافِ عادت اور شعبدہ بازی کے مظاہر دکھلائے اور طرح طرح کے جادوئی کرشموں کا مظاہرہ کیوں نہ کرے)

چنانچہ ابن کثیرؒ رحمہ اللہ مذکورہ تفصیل کے بعد لکھتے ہیں کہ جب حضور ﷺ کے بعد نبی نہیں آسکتا تو رسول بدرجہ اولیٰ نہیں آسکتا کیونکہ مقامِ رسالت نبوت کے مقام سے خاص ہے کہ ہر رسول تو نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اور ختمِ نبوت پر آپ ﷺ سے متواتر احادیث منقول ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت نے بیان کی ہیں۔[2] علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کا خاتم النبیین ہونا ایسی حقیقت ہے جس پر قرآن ناطق ہے احادیث نے جس کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور امت نے جس پر اجماع کیا ہے لہذا جو شخص اس کے برخلاف مدعی ہو گا وہ کافر قرار پائے گا اور اگر اس کا اس پر اصرار ہو تو اس کو قتل کیا جائے گا۔[3]

اسی طرح ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِي لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ﴾[4]

(آپ کہہ دیجئیے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جس کی

---

[1] السجستانی، ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، السنن، کتاب الفتن والملاحم، باب ذکر الفتن ودلائلھا، حدیث نمبر 4252

[2] ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ للنشر والتوزیع 1999ء، 3/494

[3] الآلوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی، 22/39

[4] الاعراف:158

بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے)

مذکورہ بالا آیت میں صراحت ہے کہ رسول اکرم ﷺ زمین پر رہنے والے جملہ انسانوں کے رسول ہیں۔ قیامت تک جو بھی انسان نیا پیدا ہو گا وہ آنحضرت ﷺ کی امت میں شامل ہو گا اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی اتباع اس کا اہم فریضہ ہو گی۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

﴿ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا﴾[1]

(آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر کے اپنی نعمت کا اتمام کر دیا ہے اور اسلام کو بطورِ دین تمہارے لیے پسند کیا ہے)

اس آیت میں اللہ رب العزت نے واضح انداز سے یہ بتلایا ہے کہ دینِ اسلام مکمل ہو چکا ہے اب قیامت تک اس میں ترمیم اور اضافے کی کوئی گنجائش نہیں ہے نہ ہی کوئی ضرورت۔ لہذا اب یہ امت مزید کسی نبی یا کتاب کی تا قیامت محتاج نہیں۔ اور اس تکمیل نعمت و ہدایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو محفوظ بھی بنایا ہے اور اس میں ہر طرح کی تحریف و تخریب کا احتمال بھی ختم ہو کر رہ گیا ہے تبھی دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ٱلذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ﴾[2]

قرآن کریم سے قبل صحفِ سماویہ میں ہمیشہ سے پہلے رسول کی آمد کے حوالے سے پیشن گوئی ہوئی تھی اور امت سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ ان پر ایمان لائیں گے مگر یہ طریقہ شریعتِ محمدیہ میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کو موقوف کر دیا گیا ہے۔

عقیدۂ ختمِ نبوت احادیث کے تناظر میں:

قرآن کریم کی آیات کے علاوہ متعدد احادیث بھی آنحضرت ﷺ کے آخری نبی ہونے پر دلالت کرتی ہیں جن سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس پر سلسلہ نبوت و رسالت ختم ہو چکا ہے اور قیامت تک مزید کوئی نبی نہیں آئے گا چنانچہ اس حوالے سے چند احادیثِ مبارکہ کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لا تقوم الساعة حتى تلحق قبائل من أمتي بالمشركين و حتى

---

[1] المائدۃ:3

[2] الحجر:9

يعبدوا الأوثان و انه سيكون في أمتي ثلاثون كذابون كلهم يزعم أنه نبي و أنا خاتم النبيين لا نبي بعدي ۔ [1]

(قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی جب تک کہ میری امت کے کچھ قبائل مشرکین سے نہ مل جائیں اور بتوں کی پرستش نہ کریں اور میری امت میں عن قریب تیس کذاب نمودار ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں)

اسی طرح سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن مثلي و مثل الأنبياء من قبلي كمثل رجل بنىٰ بيتا فاحسنه و اجمله، إلا موضع لبنة من زاوية، فجعل الناس يطوفون به و يعجبون له، و يقولون: هلا وضعت هذه اللبنة، قال: فأنا اللبنة و أنا خاتم النبيين ۔ [2]

(میری اور مجھ سے قبل نبیوں کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور اس میں ہر طرح کی زینت پیدا کی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ اب تمام لوگ آکر مکان کو چاروں جوانب سے چکر لگا کر حیرت سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں پر ایک اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی؟ تو میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جنابِ رسول اللہ ﷺ سے روایت بیان فرمائی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

فضلت على الأنبياء بست: أعطيت جوامع الكلم، و نصرت بالرعب و أحلت لي الغنائم، و جعلت لي الأرض طهورا و مسجدا و أرسلت الى الخلق كافة،و ختم بي النبيون ۔ [3]

(مجھے دیگر انبیاء کرام پر چھ باتوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی ہے: مجھے جوامع الکلم بنایا گیا ہے، دشمن پر رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے، میرے لیے غنائم کو حلال کر دیا گیا

---

[1] الترمذی، محمد بن عیسیٰ، السنن، باب ماجاء لا تقوم الساعۃ حتیٰ یخرج کذابون، حدیث نمبر: 2219

[2] البخاري، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب خاتم النبیین، حدیث نمبر: 3535

[3] القشیری، مسلم بن حجاج، الجامع، باب جعلت لی الأرض مسجدا و طهورا، حدیث نمبر: 521

ہے، میرے لیے زمین کو پاکیزہ اور مسجد قرار دے دیا گیا ہے مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے اور میرے ذریعہ انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا)

اسی طرح ایک اور حدیث میں واضح طور پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن الرسالة و النبوة قد انقطعت فلا رسول بعدي و لا نبي ۔ [1]

(بے شک سلسلہ نبوت و رسالت منقطع کر دیا گیا ہے پس میرے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں)

اس کے علاوہ صحیح بخاری میں ایک اور مقام پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

كانت بنواسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبي خلفه نبي و أنه لا نبي بعدي و سيكون خلفاء فيكثرون ۔ [2]

(بنی اسرائیل کا حال یہ تھا کہ ان کی قیادت انبیاء کرام کیا کرتے تھے جب کوئی نبی وفات پاجاتا تو دوسرا نبی اس کا خلیفہ بنتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، بلکہ بہت سے خلیفہ ہوں گے)

مندرجہ بالا تمام احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اب کسی جدید نبی کی آمد کی قطعی طور پر کوئی سبیل و گنجائش نہیں ہے اور قیامت تک اب آنحضرت ﷺ کی نبوت کا ہی سکہ چلتا رہے گا مذکورہ بالا جملہ احادیث اس حوالے سے بالکل واضح اور قطعی الدلالت ہیں۔ ان احادیثِ مبارکہ میں آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا آپ کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے اور اتنی صراحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص ختم نبوت کے عقیدے کا قائل نہیں ہے تو وہ قطعاً مسلمان نہیں ہو سکتا۔

ختمِ نبوت کے اصطلاحی مفاہیم:

تمام متقدمین و متاخرین مسلمان اہلِ علم کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے کہ سلسلہ نبوت سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ ﷺ تک اختتام کو پہنچا اور آپ ﷺ کے بعد کوئی حقیقی، ظلی اور مجازی نبی بحیثیتِ رسول نہیں آسکتا اور ایسا دعویٰ کرنے والا شخص دجال و کذاب اور ضال اور مضل ہے۔ ایسے شخص کا انکار لازم اور فرض ہے اور جو کوئی ایسے شخص کی تکذیب نہ کرے بلکہ اس کو مجدد، مصلح یا نبی مانے یا اس کو مؤمن و مسلم سمجھے تو ایسا شخص بھی

---

[1] الترمذی، السنن، ابواب الرؤیاء، حدیث نمبر: 2272

[2] البخاري، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر: 3455، 4/169

دائرہ اسلام سے خارج ہو گا۔ جیسے اس بات پر سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ انسان کی آمد اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں ہوئی، بعینہ اسی طرح انسانی راہنمائی اور ہدایت کا معاملہ بھی کسی کی خواہش پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت پر چھوڑتے ہوئے جس کو چاہا نبی بنا کر بھیجا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ٱللَّهُ أَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهُۥ ﴾[1]

(اللہ خوب جانتا ہے کہ کس سے کام لے اپنی رسالت کا)

چنانچہ آدم علیہ السلام جیسے پہلے انسان تھے اسی طرح پہلے پیغمبر بھی تھے ایسے ہی آخری نبی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کا انتخاب فرمایا اور یہ بات بھی اللہ نے پہلے سے فرمادی کہ سلسلہ نبوت کا اتمام بھی آپ ﷺ پر ہو گا۔ امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ (م:502ھ) فرماتے ہیں: (وخاتم النبيين لأنه ختم النبوة أي: تممها بمجيئه) [2] (کہ آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ نے نبوت کو کمال و تمام تک پہنچایا ہے)

علامہ ابو البقاء الحسینی (م:1094ھ) جنہوں نے مصطلحات عربیہ پر "کلیات ابی البقاء" کے نام سے نہایت وقیع و مستند کتاب تحریر کی ہے اس میں صراحتاً لکھتے ہیں: (وتسمية نبينا خاتم الأنبياء لأن الخاتم آخر القوم) [3] (کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کا نام خاتم الانبیاء ہے کیونکہ خاتم کے معنیٰ آخر قوم کے ہیں جیسے مہر خط کے آخر میں لگاتے ہیں، خاتم کے بھی یہی معنیٰ ہیں)

اربابِ لغت کے ساتھ مفسرین میں سے ابن جریر طبری (م:310ھ) لکھتے ہیں:

(ولكنه رسول الله و خاتم النبيين، الذي ختم النبوة فطبع عليها، فلا تفتح لأحد بعده إلى قيام الساعة---- و اختلف القراء في قرأة قولهٖ (و خاتم النبيين)---- فقرأ ذلك قراء الأمصار سوى الحسن و عاصم بكسر التاء من خاتم النبيين، بمعنى: أنه ختم النبيين۔ ذكر أن ذلك في قرأة عبدالله (ولكن نبيا ختم النبيين) فذلك دليل على صحة قرأة من قرأه بكسر التاء، بمعنى أنه الذي ختم الأنبياء صلى الله عليه وسلم و عليهم، و قرأ ذلك فيما يذكر

---

[1] الانعام:124

[2] الاصفہانی، راغب، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، ص275

[3] ابو البقاء، اَیوب بن موسیٰ الحسینی، الکلیات معجم فی المصطلحات والفروق اللغویہ، بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، ص431

الحسن و عاصم (خاتم النبيين) بفتح التاء، بمعنى أنه آخر النبيين) [1]

(اور لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ یعنی جنہوں نے نبوت کو ختم کیا اور اس پر مہر لگادی کہ اس کے بعد قیامت تک وہ کسی کے لیے نہیں کھل سکے گی۔ اور لفظ خاتم النبیین کی قرأت میں قراء کے مابین اختلاف ہے حسن اور عاصم کے علاوہ تمام ممالک کے قراء نے اس کو خاتم النبیین بالکسر پڑھا ہے اس معنیٰ کے تحت آپ ﷺ نے انبیاء کے سلسلے پر مہر لگادی اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ امام عاصم نے اس کو خاتم النبیین بالفتح پڑھا ہے اس معنیٰ میں آنحضرت ﷺ آخری نبی ہیں)

اسی طرح علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ (م1270ھ) لکھتے ہیں:

و المراد بالنبي ما هو أعم من الرسول فيلزم من كونه صلى الله عليه وسلم خاتم النبيين كونه خاتم المرسلين و المراد بكونه عليه الصلوة و السلام خاتمهم انقطاع حدوث وصف النبوة في أحد من الثقلين بعد تحليه عليه الصلاة و السلام بها في هذه النشاة ۔ [2]

(اور لفظِ نبی جو کہ رسول سے اعم ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے سے لازم آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ خاتم المرسلین بھی ہوں اور ان کے خاتم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس زندگی میں نبی علیہ السلام کے نبوت سے فیض یاب ہو جانے کے بعد اب انس و جن میں سے کسی شخص میں بھی از سر نو وصفِ نبوت پیدا نہیں ہو گا)

عقیدۂ ختمِ نبوت اور اجماعِ امت:

جیسا کہ سطورِ بالا میں یہ واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے ک عقیدہ ختمِ نبوت امت کا اجماعی اور متفقہ عقیدہ ہے اور اس میں کبھی بھی مسلمانوں اور اہلِ علم کا اختلاف نہیں ہوا اور بقول علامہ انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ یہ کہتے ہوئے کہ تاریخِ اسلامی کا سب سے پہلا اجماع مسئلہ ختم نبوت پر ہی منعقد ہوا تھا، لکھتے ہیں:

---

[1] الطبري، محمد بن جرير، جامع البيان، مکہ مکرمہ: دار التربية والتراث، 20/279

[2] الآلوسي، شهاب الدين محمود، روح المعاني، بيروت: دار الكتب العلمية، 1415ھ، 11/213

و اول اجماع کہ دریں امت منعقد شدہ اجماع بر قتلِ مسیلمہ کذاب بودہ کہ بسبب دعویٰ نبوت بود، شائع دگر و صحابہ رابعد قتل معلوم شدہ، چنانکہ ابن خلدن اور دہ سپس اجماع بلا فصل قرناً بعد قرن بر کفر و ارتداد و قتل مدعی نبوت مائدہ۔[1]

(کہ سب سے پہلا اجماع جو اس امت کا منعقد ہوا وہ مسیلمہ کذاب کے قتل پر اجماع تھا جس کا سبب فقط اس کا دعویٰ ہے اور اس کے بعد قرنا بعد قرن مدعی نبوت کے کفر و ارتداد اور قتل پر ہمیشہ بلا فصل اجماع رہا ہے)

اسی طرح حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں مسئلہ ھذا پر تفصیلی بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ امت نے لفظ خاتم النبیین سے بالاجماع یہی مفہوم اخذ کیا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی ہو گا اور نہ رسول۔ چنانچہ اجماعی طور پر امت کا یہ مؤقف ہے کہ اس لفظ میں کسی بھی قسم کی کوئی تاویل و تخصیص کی گنجائش نہیں اور اس کا منکر اجماع کا منکر ہو گا۔[2]

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مندرجہ بالا جملہ نقلی دلائل قرآن و حدیث اور اجماعِ امت سے یہ بات بدیہی طور پر سمجھ میں آرہی ہے کہ جنابِ رسول کریم ﷺ آخری نبی ہیں اور بقائے امت تک کے لیے مزید آگے بابِ نبوت بند ہو چکا ہے۔

عقیدہ ختمِ نبوت دینِ اسلام کا وہ بنیادی عقیدہ ہے جس میں ادنیٰ سا شائبہ بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ اسی لیے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد جو شخص کسی مدعیٔ نبوت سے دعوائے نبوت کی دلیل بھی طلب کرے گا تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اس لیے کہ اس کا یوں دلیل کا طلب کرنا اجراءِ نبوت کے امکان کو تسلیم کرنا ہے جو کہ باطل و محال ہے۔

عقیدۂ ختمِ نبوت عقلی دلائل کی روشنی میں:

عقیدہ ختمِ نبوت پر نقلی دلائل کے بعد اب دلائلِ عقلیہ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ عقیدہ ختمِ نبوت کے حوالے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ نے بڑی دقیق علمی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب

---

[1] کشمیری، انور شاہ، علامہ، خاتم النبیین، 67

[2] الغزالی، محمد بن محمد، الاقتصاد فی الاعتقاد، دار الکتب العلمیۃ بیروت: لبنان، ص 137

قرآن حکیم سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کو مقرر کرنے کی ضرورت کیسے اور کن کن حالات میں پیش آئی ہے؟ تو معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ انبیاء کی چار صورتیں ہیں:

اولاً : یہ کہ کسی مخصوص قوم میں نبی کے مبعوث کرنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کوئی نبی کبھی نہ آیا ہو اور نہ کسی دوسری قوم میں مبعوث کردہ نبی کا پیغام اس قوم تک پہنچ سکا تھا۔

ثانیاً : اس لیے کہ بعثتِ نبوی کی ضرورت بایں وجہ ہو کہ پچھلے نبی کی تعلیمات فراموش کر دی گئی ہوں یا ان میں تحریف کر دی گئی ہو جس کے باعث ان کی اتباع ممکن نہ ہو۔

ثالثاً : یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں تک نہ پہنچی ہو جس کے باعث تکمیلِ دین کے لیے مزید نبی کی ضرورت ہو۔

رابعاً : یہ کہ ایک نبی کی مدد کے لیے اس کی معیت میں دوسرے نبی کی بھی احتیاج ہو۔

اب ظاہر ہے کہ مذکورہ چاروں صورتوں میں سے کوئی بھی ضرورت آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد باقی نہیں رہی اور قرآن کریم خود کہہ رہا ہے کہ آنحضرت کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرما دیا گیا ہے۔ اور دنیا کی تمدنی تاریخ یہ بتلا رہی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ ﷺ کی دعوت تمام اقوام تک پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔

چنانچہ اس کے بعد الگ الگ اقوام میں انبیاء کرام کی مزید تشریف آوری کا کوئی مقصد اور حاجت باقی نہیں ہے۔ قرآن کریم، احادیثِ نبویہ اور سیرتِ طیبہ کا مکمل ذخیرہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم مکمل طور پر اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے جو کہ تحریف و تغیر سے مکمل پاک ہے۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب میں ایک لفظ کی کمی و بیشی بھی آج تک نہیں ہوئی نہ ہی تا قیامت ہو گی، لہذا جو ہدایت آپ ﷺ کے قول و عمل سے ہم تک پہنچی ہے اس کے تمام آثار آج بھی اسی طرح ہمارے پاس موجود ہیں جیسا کہ آپ ﷺ کے زمانے میں موجود تھے۔ لہذا دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی ہے۔

قرآن کریم خود بار بار کہہ رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعے تکمیلِ دین ہو چکی ہے لہذا مزید تکمیلِ دین کے لیے بھی کسی نبی کی ضرورت نہیں اور رہ گئی چوتھی ضرورت تو اگر اس کے لیے کسی نبی کی ضرورت ہوتی تو وہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ کے ساتھ مقرر کیا جاتا اور جب وہ اس وقت مقرر نہیں کیا گیا تو یہ ضرورت بھی ساقط ہو گئی ہے۔

اب ان چار وجوہات کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ پانچویں ایسی کوئی وجہ موجود ہے کہ جس کے لیے مزید کسی نبی کی آمد کی گنجائش موجود ہے تو اگر کوئی کہے کہ قوم کے بگاڑ کے باعث اصلاح کی ضرورت ہے لہذا نبی کی بھی ضرورت ہے

تو اس سے ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ محض اصلاح کے لیے کوئی نبی اس سے قبل کب آرہا ہے جو آج نبی آئے، نبی اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس پر وحی کی جائے اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی جدید پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے یا گذشتہ پیغام کی تکمیل کے لیے یا اس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن و سنت نبی علیہ السلام کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی جملہ ممکن ضروریات پوری ہو چکی ہیں تو اب اصلاح کے لیے بھی مصلحین کی ضرورت تو باقی رہ سکتی ہے مگر انبیاء کی قطعاً نہیں۔[1]

اسی طرح نبی جب بھی کسی قوم میں آتا ہے فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو اس کو مانیں گے وہ ایک امت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہیں مانیں گے وہ لامحالہ دوسری امت ہوں گے ان دونوں امتوں کا اختلاف محض فروعی نوعیت کا اختلاف نہیں ہو گا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہو گا جو انہیں اس وقت جمع نہیں ہونے دے گا جب تک ان میں سے کوئی اپنے عقیدے کو نہ چھوڑ دے اور پھر ان کے لیے عملی طور پر بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ علیحدہ علیحدہ ہوں گے کیونکہ ایک فریق اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لے گا جب کہ دوسرا فریق اس کے قانون کے ماخذ ہونے کا سرے سے منکر ہو گا لہذا اس بناء پر ایک مشترکہ معاشرے کی تشکیل ناممکن قرار پائے گی۔

مذکورہ حقائق کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ختمِ نبوت امتِ مسلمہ کے لیے بہت بڑی رحمتِ خداوندی ہے جس کی وجہ سے یہ امت ایک دائمی اور عالم گیر برادری بنی ہوئی ہے اسی کی بنا پر مسلمان ہر اس بنیادی اختلاف سے محفوظ ہو چکے ہیں جو ان کے لیے تفرقے کا باعث بن سکتا تھا۔ انسان اگر سوچ بچار کرے تو اس کی عقل خود یہ بات کرے گی کہ جب ساری دنیا کے لیے ایک نبی مبعوث کر دیا جائے اور اس کے ذریعے دین کی تکمیل بھی ہو جائے اور اس کی تعلیمات مکمل محفوظ بھی کر دی گئی ہوں تو نبوت کا دروازہ پھر بند ہو جانا چاہیئے تاکہ اس آخری نبی پر جمع ہو کر اہلِ ایمان ایک اجتماعی امت بن سکیں اور یوں خواہ مخواہ بلا ضرورت نئے نبیوں کی آمد سے امت میں تفرقہ پیدا نہ ہو۔ پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> قدرت کے کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جب آنحضرت ﷺ کی نبوت جملہ اقوام عالم کے لیے تا قیامت ہے جب آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب بغیر کسی ادنیٰ تحریف کے من و عن ہمارے پاس موجود ہے جب حضور ﷺ کی سنتِ مبارکہ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام

---

[1] مودودی، ابوالاعلیٰ، سید (م:1979ء) تفہیم القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 4/152-154

دینا کی صورت میں ہو تو پھر کسی مزید نبی کی بعثت کا کیا فائدہ ہے؟ اور اس سے کس مقصد کی تکمیل مقصود ہے؟ آفتابِ محمدی طلوع ہوچکا ہے عالم کا ہر گوشہ اس کی کرنوں سے منور ہورہا ہے تو پھر دن کی روشنی میں کسی چراغ کو روشن کرنا کون سی عقل مندی کی بات ہے؟[1]

اسی طرح نبی کی موجودگی میں عادۃً یہ بھی محال اور ناممکن ہے کہ وہ ہر آدمی کے سامنے پیش آنے والے ہر جزئی مسئلے کے حوالے سے قرآن و حدیث کا بیان اور اس کی تشریح پیش کرے ذرائع مواصلات اور ابلاغ کے تیز ترین ہونے کے باوجود بھی کسی آدمی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہر روز لاکھوں کروڑوں لوگوں کے سوالات کے جوابات دے۔ خود آنحضرت ﷺ کے مبارک دور میں بہت سے مسائل و جزئیات کے بارے میں صحابہ کرام کو اجتہاد سے کام لینا پڑا۔ ایسے مسائل اگرچہ بہت کم ہیں مگر پھر بھی کافی تعداد میں موجود ہیں کہ جن میں صحابہ نے خود اجتہاد کرکے اپنی فہم و سمجھ سے نصوص کی وضاحت و تشریح کی ہے۔

چنانچہ یہ صرف حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فعل ہی نہیں بلکہ خود آپ ﷺ نے اس انداز کی تعلیم فرمائی ہے۔ جیسا کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی مسئلے میں کتاب و سنت کی صریح نصوص کی عدمِ موجودگی میں اجتہاد و استنباط کی تلقین فرمائی تھی جس سے وضاحت ہوتی ہے کہ ہر جزئی مسئلے کے لیے نبی کی احتیاج نہیں ہوتی بلکہ نبی کی احتیاج بھی ایک مخصوص حد تک ہے جس کی وسعت کا اندازہ انسانی عقل پہلے تو نہیں کرسکتی مگر نبی کے تشریف لے جانے کے بعد عقلِ انسانی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کی حدود اب ختم ہوچکی ہیں اور اس کے بعد مزید کسی دوسرے نبی کی آمد اس مقصد کے لیے بالکل بلاضرورت ہے۔

جب تک دلیلِ شرعی قطعی و یقینی سے کسی نبی کی ضرورت و احتیاج ثابت نہ ہوجائے تب تک وہ عقلِ انسانی اسے تسلیم کرنے پر قطعاً تیار نہیں ہوسکتی اور اگر امت کچھ مسائل کے متعلق قرآن و حدیث کی تشریح و بیان خود کرسکتی ہے تو غیر منصوص مسائل میں ایسا کرنے سے کون مانع ہے؟ اور اس کی استطاعت کے لیے کسی نبی کی کیا حاجت مزید رہ جاتی ہے؟

چنانچہ قرآن و سنت کے نقلی دلائل کو ذکر کرنے کے بعد مذکورہ بالا عقلی دلائل و براہین بھی اس بات کی

---

[1] الازھری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن 4/73

مکمل تائید کر رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کسی نبی ورسول کی بعثت نہ صرف ابھی بلکہ تا قیامت نہیں ہو گی اور قرآن وحدیث اور اجماع کے ساتھ ساتھ عقلِ سلیم بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے اور اس سے اختلاف امتِ محمدیہ کی مخالفت، عقل وخرد سے بغاوت اور فہم وفراست سے بھی انحراف کرنا تصور ہو گا۔

مہرِ نبوت کی تفصیل اور امام سہیلی:

سیرت نگاروں کی مہرِ نبوت کے حوالے سے رائے یہ ہے کہ خاتم النبوۃ سینگی کے اثرات کی مانند تھی یہاں تک کہ اس جگہ میں سوزش آجائے۔ چنانچہ سیرت نگار حدیث کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ختم النبوۃ شکل وصورت کے لحاظ سے گول تھی جس کے ارد گرد کالے بال تھے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ حجلہ کے بٹن کی طرح تھی لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح کی ہے کہ اس میں ان کو وہم ہوا ہے۔ اور ان کے ہاں یہ چکور کے انڈے کی طرح تھی۔ یعنی ان کے ہاں حجلہ سے مراد چکور ہے مگر اس سے اصل مراد ابن ہشامؒ کے نزدیک حجلہ عروسی کا بٹن ہے اور اس کی گرہ میں جو بٹن داخل کرتے ہیں اس کو "زِرّ" کہتے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ عراق سے فرمایا تھا: (يا أشباه الرجال و لا رجال و يا طغام الأحلام و يا عقول ربات الحجال) [1] (اے وہ لوگو جو مردوں کے مشابہ مرد نہیں ہو! اے بے وقوفو اور اے چکور کے پالے ہوئے کی عقل والے لوگو!)

ایک اور روایت میں ہے کہ ختمِ نبوت کبوتری کے انڈے کی مانند تھی چنانچہ عیاذ بن عبد عمرو کہتے ہیں کہ میں نے مہرِ نبوت کو دیکھا تھا اور وہ بکری کے گھٹنے کی مانند تھی۔[2]

چنانچہ علامہ ابو القاسم السہیلی نے مہرِ نبوت کے اوصاف سے متعلق آٹھ روایات ذکر کی ہیں جن میں سے سب سے پہلی روایت کے مطابق مہرِ نبوت سیب کی طرح تھی، دوسری روایت کے مطابق وہ کبوتری کے انڈے کی طرح تھی، تیسری روایت کے تحت وہ حجلہ عروسی کے بٹن سے ملتی جلتی تھی۔ چوتھی روایت یہ ہے کہ وہ سینگی کے اثر سے مشابہ تھی، پانچویں روایت کے مطابق اس کی صورت بکری کے گھٹنے کی طرح تھی۔ چھٹی روایت جس کے راوی حضرت عبد اللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس مہرِ نبوت کی زیارت کی تھی اور وہ ایسے آلے کی مانند ہے کہ جس میں کوئی حجام پچھنے لگا کر خون جمع کرتا ہے۔ اسی طرح ساتویں روایت کے مطابق جو کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے کہ ان سے ختمِ نبوت کے حوالے سے سوال کیا گیا تو انہوں نے انگشتِ شہادت کو اپنے

---

[1] السہیلی، ابو القاسم، الروض الانف، 1/404

[2] النمری، ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، مطبوعہ دار الجیل، بیروت، 1412ھ/1992ء، 1/398

انگوٹھے کے جوڑ پر رکھا یا اس سے تھوڑا نیچے رکھا اور یوں اشارہ کیا۔

جب کہ اس کے حوالے سے ایک آٹھویں روایت میں اسے پھولے ہوئے جسم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔[1] جہاں تک مہرِ نبوت کی حکمت کا سوال ہے تو اس میں حکمت یہ تھی کہ جب آپ ﷺ کے قلب مبارک کو یقین و حکمت سے بھر دیا گیا تو اس طرح مہر لگادی گئی کہ جیسے کسی تھیلی میں کستوری یا موتی بھر کر اوپر سے مہر لگادی جاتی ہے۔ کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام وساوسِ شیطانی سے معصوم تھے۔ تبھی یہ مہر آپ ﷺ کے مبارک شانے کی ہڈی پر لگادی گئی تھی جس کی وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ شیطان انسان کے اندر وسوسہ اندازی اسی مقام سے کرتا ہے۔

یہاں صاحب الروض الانف نے امام ترمذی رحمہ اللہ کی مصنف کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ابو بکر بن ابی موسیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو طالب شام کی طرف رو بسفر ہوئے اور آنحضرت ﷺ بھی آپ کے ساتھ تھے، جب وہ ایک راہب کے پاس پہنچے تو وہاں خیمہ زن ہوئے، اپنا سامان اتارا تو راہب ان کے قریب آگیا۔ اس سے قبل بھی ان کا اسی شاہراہ سے گزر ہوتا رہتا تھا مگر راہب نے کبھی ان کی جانب توجہ نہیں کی تھی، چنانچہ وہ ہر چہرے پر بغور نگاہ ڈالنے لگا اور جیسے ہی آپ ﷺ کے پاس پہنچا تو اس نے آنحضرت ﷺ کا دستِ اقدس پکڑ کر کہا کہ "یہ تمام جہانوں کے سردار ہیں۔ یہ رب العالمین کے رسول ہیں ان کو اللہ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گا"۔

جب قریش کے بڑوں نے یہ سنا تو کہنے لگے کہ اے راہب! تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ تو اس نے کہا کہ "اے سردارانِ قریش! جب تم لوگ گھاٹی سے اتر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ تمام پتھر اور درخت سجدہ ریز تھے اور یہ شجر و حجر صرف انبیاء کو ہی سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے انہیں اس مہرِ نبوت سے بھی دیکھ کر پہچانا ہے جو کہ ان کے شانے کی ہڈی کے نیچے ہے" اس کے بعد راہب نے واپس آکر اپنے گرجے میں کھانا تیار کروایا اور اس کو لے کر قافلے کے پاس پہنچایا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ اونٹوں کی نگرانی میں مصروف تھے۔

راہب نے کہا کہ اس مبارک بچے کو بھی بلوائیں۔ جب آنحضرت ﷺ تشریف لا رہے تھے تو راہب نے دیکھا کہ ایک ٹکڑائے بادل حضور ﷺ پر سایہ فگن ہے اور جب آپ ﷺ اپنی قوم کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ درخت کے سائے کے نیچے جگہ خالی نہ تھی، جب آنحضرت ﷺ وہاں تشریف فرما ہوئے تو درخت آپ ﷺ پر سایہ کناں ہو گیا۔ راہب نے کہا:

(اے جماعت قریش! ذرا درخت کے سائے کو دیکھ کہ وہ خود آنحضرت ﷺ کی طرف

---

[1] السہیلی، ابو القاسم، الروض الانف، 1/405-406

بڑھ رہاہے) پھر راہب نے سردارانِ قریش سے کہا کہ ان کو روم کی سرزمین پر مت لے جانا کہ اہلِ روم کہیں ان کے اوصافِ نبوت پہچان کر ان کو شہید کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جب راہب نے یہ بات ختم کی تو دیکھا کہ روم کے سات آدمی وہاں کھڑے تھے راہب نے ان کو روک کر پوچھا کہ تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے تو انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آخری نبی ﷺ اس شہر سے باہر نکلنے والے ہیں اس لیے ہم نے تمام راستوں پر لوگوں کے دستے روانہ کر دیئے ہیں اور خود ہم نے اپنے لیے سب سے عمدہ راستے کا انتخاب کیا ہے جو سب سے بہتر ہے۔ راہب نے سوال کیا کیا تمہارے پیچھے ایسے دشمن بھی ہیں جو تم سے بہتر ہوں تو ان کا جواب تھا کہ ہم نے ہی بہتر راستہ پسند کیا ہے۔

راہب نے ان سے پوچھا کہ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا ہو کیا کوئی شخص اس فیصلے کو رد کر سکتا ہے انہوں نے کہا "نہیں" ان رومیوں نے اس راہب سے بیعت کرلی اور اسی کے پاس رہنے لگے۔ راہب نے سردارانِ قریش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

آپ کو اللہ کا واسطہ ہے سچ بتاؤ کہ اس مبارک بچے کا ولی کون ہے؟ انہوں نے ابوطالب کی جانب اشارہ کیا۔ راہب مسلسل اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ ابو طالب نے جنابِ رسول اللہ ﷺ کو واپس لوٹا دیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے ساتھ بھیجا اور راہب نے جاتے وقت آپ ﷺ کو کیک اور زیتون پیش کیے۔ چنانچہ علامہ سہیلیؒ لکھتے ہیں کہ ابو عیسی ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے اور ہم اس کی صرف ایک ہی سند کو جانتے ہیں۔[1]

مذکورہ بالا واقعے میں مہرِ نبوت (ختم نبوت) کے حوالے سے یہ تفصیل موجود ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے شانے کی ہڈی کے پیچھے تھی۔

اسی طرح مہر نبوت میں حکمت کیا تھی اس حوالے سے علامہ ابوالقاسم السہیلی یوں رقمطراز ہیں۔

{ والحكمة في خاتم النبوة على جهة الإعتبار انه لما ملئ قلبه حكمة و يقينا، ختم عليه كما يختم على الوعاء المملوء مسكا او درا، واما وضعه عند نغص كتفه ، فلا نه معصوم من وسوسة الشيطان ، وذلك الموضوع منه يوسوس الشيطان لأبن أدم .

روي ميمون بن مهران عن عمر بن عبد العزيز ان رجلا سأل ربه إن يريه

---

[1] السہیلی، الروض الأنف، 1/ 408، 407

موضع الشيطان منه ، فأرى جسدا ممهي يرى داخله من خارجه ، والشيطان في صورة ضفدع عند نغض كتفه حذاء قلبه ، له خرطوم ، كخرطوم البعوضة ، وقد أدخله الى قلبه يوسوس ، فإذا ذكر الله تعالى العبد خنس } .[1]

(مہر نبوت میں حکمت یہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب انور حکمت ویقین سے لبریز ہو گیا تو اسی طرح مہر نبوت لگا دی گئی جس طرح کسی تھیلی میں کستوری یا موتی بھر کر اوپر مہر لگا دی جاتی ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شیطان کے وسوسے سے معصوم تھے، اس لیے یہ مہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شانے کی ہڈی پر لگائی گئی۔ کیونکہ ابن آدم میں شیطان وسوسہ سازی اسی جگہ سے کرتا ہے۔

میمون بن مہران نے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی کہ اسے وہ جگہ دکھا دی جائے جہاں سے شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔ اسے ایک صاف وشفاف انسانی جسم دکھایا گیا۔ وہ جسم اتنا شفاف تھا کہ وہ اندر سے بھی دکھائی دیتا تھا۔ شیطان مینڈک کی شکل میں کندھے کی ہڈی کے ساتھ تھا۔ مچھر کی سونڈ کی طرح اس کی سونڈ تھی، وہ اسے اس شخص کے دل میں ڈال کر وسوسہ سازی کرتا تھا، وہ بندہ جب اللہ کا ذکر کرتا تھا تو وہ شیطان اس سے دور ہو جاتا تھا)۔

کتب سماویہ میں ختم نبوت سے متعلق بشارات:

حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے زمانہ سے تا زمانۂ رسول اللہ ﷺ لوگ آپ ﷺ کی آمد کے منتظر تھے اور تورات وانجیل کو الہامی کتب ماننے والے ان کی پیش گوئیوں اور بشارات کو سچ مانتے تھے مگر نہ ماننے والوں پر بھی ان کے بشارتوں کے اثرات تھے اور ایک آخری نبی کی آمد کے وہ سب لوگ بھی منتظر تھے ان پیش گوئیوں نے آنے والے نبی کے خدوخال، رتبہ ومقام، کردار واخلاق، خصائل وعزم، تربیت وتعلیم اور ان کے ساتھیوں کی درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی مصاحبت نے ان کو دیگر تمام انبیاء سے ممتاز بنا دیا تھا چنانچہ تورات اور انجیل میں آپ ﷺ سے متعلق بشارات درج ذیل ہیں۔

بائبل کے قدیم عہد نامہ میں تحریف ہونے کے باوجود جنابِ رسول اکرم ﷺ سے متعلق تشریف آوری کی بشارات موجود ہیں اور یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ﷺ جب تشریف لائیں گے تو تم ان کی طاعت وسمع اختیار کرنا جیسا کہ کتاب استثناء میں ذکر ہے کہ:

(خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں سے میری

[1] السہیلی، الروض الآنف، 1/191.

طرح ایک نبی بپا کرے گا تم اس کی بات ضرور سننا)[1]

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخری نبی کی بعثت سے متعلق اللہ رب العزت سے دعا کی تو جواباً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں آپ کی طرح ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس کو حکم دوں گا وہ ان سے وہی کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو میرا نام لے کر کہے گا اگر نہ سنے تو میں اس سے ان کا حساب لوں گا)[2]

چنانچہ اس پیش گوئی کا مصداق چونکہ جنابِ رسول اکرم ﷺ کے بعد کوئی بھی نہیں ہو سکتا لہذا اسی حوالے سے نامور عرب مصنف بسام داؤد عجک لکھتے ہیں:

اذا كانت هذه الكلمات لا تنطبق على النبي محمدصلى الله عليه وسلم فانهاتبقى غير متحققة ولافائدة، فالمسيح نفسه لم يدع ابدا انه النبي المشار اليه وحتى حوارىه كانو على نفس الرأي ۔ [3]

(اگر بشارت کے یہ کلمات آنحضرت ﷺ پر منطبق نہ ہوں تو یہ غیر محقق اور غیر مفید رہ جاتے ہیں اور مسیح نے بھی کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا تھا کہ جس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے وہ میں ہوں اور اسی طرح یہی رائے آپ علیہ السلام کے حواری بھی رکھتے تھے)

حافظ ابن قیمؒ نے سابقہ بشارت کے جملے "آپ کے بھائیوں میں سے" اس نکتہ کا استخراج کیا ہے ان سے مراد بنی اسرائیل کے بھائی اسماعیل کی اولاد میں نبی برپا کرنے اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح شریعت کا پاسدار ہونے کی درخواست ہے اس لیے کہ بنی اسرائیل میں جتنے بھی انبیاء آئے تھے وہ شریعت موسوی کے متبعین تھے اور کسی نبی کے پاس مستقل شریعت نہیں تھی جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب کریم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ:(میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور میں کچھ اس کو حکم کروں گا ان سے وہ وہی کہے گا)

اس صراحت کے بعد یہاں مزید کوئی ایسی گنجائش نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے علاوہ اس بشارت کا

---

[1] بائبل، (پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، 2007) استثناء:15:18

[2] بائبل، استثناء:15:18

[3] عجک، بسام داؤد، دکتور، الحوار الأسلامی المسیحی، دار قتیبہ، للطباعۃ والنشر والتوزیع، 1998، ص350

مصداق کوئی اور ہو۔ دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مستقل شریعت فقط آپ ﷺ کو ہی عطا کی گئی ہے۔[1] جو مکمل ضابطۂ حیات ہے اور جس کی تائید تورات کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے:

جاءالرب من سيناء، واشرق لهم من سعير، وتلألأمن جبل فاران، واتى من ربوات القدس وعن يمينه نار شريعة لهم ۔ [2]

(وہ قدوس سینا کی جانب سے آیا اور ان کے لیے سعیر کے مقام سے روشنی لے کر آیا اور فاران کی پہاڑی کی طرف آچکا اور قدس کی چوٹیوں کی جانب سے آیا اور آپ ﷺ کے دائیں ہاتھ میں ان کے لیے شریعت بیضاء تھی)

یہ بشارت جہاں شریعت محمدی کی تکمیل کی دلیل ہے وہاں فتح مکہ میں صحابہ کی تعداد کو بھی ظاہر کرتی ہے جس کے مدعا کو حذف کرنے کی پوری جسارت کی گئی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا عربی عبارت میں قدوسیوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اور ان کی تعداد کا ذکر نہیں جب کہ انٹرنیشنل بائبل سوسائٹی اردو ورژن کی عبارت میں لفظ "لاتعداد" مذکور ہے۔ جس کی عبارت یوں ہے:

(خداوند سینا سے آیا، اور سعیر سے ان پر ظاہر ہوا اور کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، وہ جنوب سے اپنے پہاڑی ڈھلوانوں میں سے لامحدود قدسیوں کے ہمراہ آیا)[3]

جب کہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور کے مطبوعہ نسخہ میں یہ تعداد لاکھوں میں مذکور ہے اصل عبارت یوں ہے۔

(خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا)[4]

ایک پادری نے اپنی کتاب میں انجیل کے قدیمی نسخے سے یوں نقل کیا ہے:

وجاء الرب من سيناء، واشرق لهم من ساعير، وتلألأ قدماً من جبل فاران، وجاء معه عشرة الاف قديس، ومن يده اليمنى برزت نار شريعة لهم

---

[1] ابن القیم، ہدیۃ الحیاری فی اجوبۃ الیہود والنصاریٰ، دارالعلم جدہ، السعودیہ، 1996ء، ص:120

[2] بائبل، دارالکتاب المقدس الشرق الاوسط، سفر التثنیہ: 33، 1 تا 2

[3] استثناء، 1:33 تا 2

[4] ایضاً، 1:33 تا 2

(کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر ظاہر ہوا اور جبلِ فاران کی جانب سے آچمکا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور آپ ﷺ کے دائیں ہاتھ میں ان کے لیے شریعت بیضاء تھی)

اس پیش گوئی کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ فتح مکہ کے موقع پر صحابہ کی تعداد بھی بیان کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاران کے ذکر کردہ تاریخی حقائق سے بھی موافقت رکھتی ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

(جب مکہ فتح کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ نکلے تو دس ہزار کا لشکر جرار آپ ﷺ کے ہمراہ تھا)[1]

مذکورہ تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ بائبل کی ذکر شدہ بشارات میں واضح طور پر تحریف پائی جاتی ہے اس لیے کہ غزل الغزلات جو سلیمان علیہ السلام کی جانب منسوب ہے، میں بھی قدوسیوں (صحابہ کرام) کی تعداد دس ہزار بیان کی گئی ہے جو کہ تاریخ سیرتِ نبوی کے بالکل عین مطابق ہے۔ جیسا کہ مذکورہ ذیل عبارت دیکھی جاسکتی ہے۔

(میرا محبوب سرخ و سفید ہے وہ دس ہزار میں ممتاز ہے)[2]

تورات کی اس عبارت میں جہاں فتح مکہ کی دس ہزار لشکر پر مبنی تعداد کا ذکر ہے وہاں آپ ﷺ کے شمائل کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ سرخ و سفید یعنی گندمی رنگ کے تھے جس کا تذکرہ واضح انداز میں کتب احادیث اور سیرت و شمائل کی کتب میں موجود ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا پیشن گوئیوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بائبل کی بیان کردہ بشارات صرف آنحضرت ﷺ پر بھی صادق آتی ہیں دوسرا یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل کا جبلِ فاران سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا ماسوا حضرت اسماعیل کی والدہ ماجدہ کے جو تاریخ عرب اور بائبل میں مذکور ہے اسی طرح کوہِ فاران سے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا تعلق رہا ہے جن کی اولاد سے پیغمبر آخر الزمان ﷺ پیدا ہوئے ہیں اور اس کا ذکر بائبل کتاب پیدائش میں موجود ہے کہ اولادِ اسماعیل میں ایک نام قیدار ہے جو عدنان ہے اور جس سے عرب کا شجرۂ نسب ملتا ہے اور پھر اس سے آنحضرت ﷺ کے خاندان کا تعلق بنتا ہے اور کوہِ فاران ان کا مسکن رہا ہے۔

یہیں سے بائبل کی وہ بشارت بھی صحیح نظر آتی ہے کہ وہ نبی دشتِ فاران میں ظہور پذیر ہوا اور دس ہزار

---

[1] الطبری، محمد ابن جریر، تاریخ، م الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، اردو بازار لاہور، 2004ء، 2/322

[2] بائبل، غزل الغزلات، باب:5، آیات 10 تا 16

قدوسیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوا اور شریعت بیضاء کے ساتھ وہ نبی فاران پہاڑ سے آیا جب کہ انجیل برناباس میں لکھا ہے کہ نبی آخر الزمان اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے نہ کہ بنی اسحاق میں سے جو کہ بائبل میں ربیوں کی صراحتاً تحریف ہے۔[1]

اسی طرح عربی میں "المعزی" اور اردو میں "مدد گار" فارقلیط کی تحریفی شکل ہے جس کو علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور رحمت اللہ کیرانوی الہندی نے اپنی تصنیفات میں ذکر کیا ہے۔[2] اسی طرح فارقلیط کا لفظ اس وقت کی اناجیل میں ذکر کیا گیا ہے مگر آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے لوگوں کو روکنے کے لیے اس مسئلہ کو مشتبہ ظاہر کیا گیا ہے جیسا کہ امام ابو نعیم اصفہانی رحمہ اللہ نے دلائل النبوۃ میں درج ذیل واقعہ نقل کیا ہے:

(عاصم بن عمرہ نے بنی قریظہ کے ایک ضعیف العمر شخص سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا جانتے ہو کہ ثعلبہ بن سعنہ، اسید بن سعنہ اور اسد بن عبید کے اسلام قبول کرنے کی وجوہات کیا تھیں؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نہیں کہنے لگا کہ ملک شام کا ایک یہودی جس کا نام ابن الہیبان تھا اسلام کے ظہور سے کچھ سال پہلے وہ ہمارے ہاں مدینہ طیبہ میں آیا اور یہاں سکونت اختیار کرلی ہم نے کسی کو اس سے بہتر پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی کا پابند نہیں پایا جب کبھی قحط سالی ہوئی تو ہم اس سے دعا کا کہتے مگر وہ جواب دیتا کہ پہلے ہر آدمی ایک صاع کھجور اورایک مد جو صدقہ کرے تب میں دعا کروں گا چنانچہ جب ہم صدقہ دے دیتےتو وہ میدان میں نکل کر دعا مانگ کر ابھی اٹھنے نہیں پایا تھا کہ بادلوں کا اندھیرا چھا جاتا اور ایسا کئی مرتبہ ہوا جب اس کا وقتِ وفات نزدیک آیا تو اس نے کہا کہ اے جماعت یہود! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں ملک شام جیسا متمول اور خوشحال علاقہ چھوڑ کر اس پسماندہ اور افلاس زدہ علاقے میں کیوں آیا تھا؟ ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو ہی بہتر علم ہےتو اس نے کہا کہ میری آمد کا مقصد یہ تھا کہ اس نبی کی انتظار کروں کہ جس کا

---

[1] انجیل برناباس، طبع پنجم، مترجم آسی ضیائی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1987ء، باب 44، ص:80

[2] کیرانوی، شیخ، اظہار الحق، تحقیق: عمر الدسوقی، طبعۂ دولۃ قطر، س ن، 2/421-432

ظہور قریب ہے اور وہ اس شہر کی جانب ہجرت کرے گا میری تمنا تھی کہ میں اس کی زیارت کرسکوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ میری زندگی مجھ سے مزید وفا کرے گی اور اب تم اس زمانے کو پانے والے ہو ۔اے یہود! دیکھنا کہ اس آخری رسول پر ایمان لانے میں کوئی قوم تم سے سبقت اختیار نہ کرے اس کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنے مخالفین کا خون بہا دے بچوں اور خواتین کو قید کرے اس لیے اس پر ایمان لانے میں تاخیر سے کام نہ لینا جب آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور بنی قریظہ کا محاصرہ ہوا تو ان نوجوانان (یعنی ثعلبہ بن سعنہ، اسید بن سعنہ اور اسد بن عبید) نے چلا کر کہا کہ اے بنی قریظہ! یہی وہی رسول اللہ ہیں جن کے متعلق ابن الہیبان نے پیش گوئی کی تھی، یہودیوں نے کہا یہ وہ نہیں ہیں تو نوجوانوں نے کہا کہ بخدا یہی وہ رسول ہیں چنانچہ یہ اپنے قلعے سے اتر کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا اور اس طرح اپنے خون، مال اور اولاد کو خون سے محفوظ کر لیا)[1]

اسی طرح کتب سماویہ میں تورات کے بعد انجیل (بائبل عہد نامہ جدید) بھی باوجود تحریفات و تغیرات کے جگہ جگہ آخری نبی ﷺ کے حوالے سے حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئیوں کا ذکر کرتی ہے جو آنحضرت ﷺ کے علاوہ کسی اور نبی پر صادق نہیں آتیں اور یہ بھی واضح تھا کہ لوگ صرف ایک آخری نبی کی آمد کے منتظر تھے جس کی اطلاع سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی کہ وہ دنیا کے سردار ہوں گے اور ابد تک رہیں گے۔ سچائی کے تمام راستے دکھائیں گے اور خود میری نبوت، میرے عبداللہ ہونے اور سچائی کی گواہی دیں گے اور میری لائی گئی کتاب میں تحریف کی نشاندہی بھی کریں گے۔

چنانچہ انجیل یوحنا کی عبارت ملاحظہ ہو:

(میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرے مددگار بخشے گا جو تاکہ تا ابد تمہارے ساتھ رہے اور میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں مگر مددگار جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھلائے گا اور جو

[1] الاصفہانی، ابونعیم، دلائل النبوۃ، ضیاء القران پبلی کیشنز، 2006ء، ص98،97

کچھ تم سے میں نے ذکر کیا ہے وہ ساری باتیں تمہیں یاد دلائے گا)[1]

چنانچہ قرآن کریم میں وہ تمام باتیں ان عیسائیوں کو ایک ایک کرکے یوں یاد دلائی گئی ہیں جیسے وہ سب بائبل میں باوجود تحریفات کے موجود ہیں اور اس طرح قرآن کریم نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت، رسالت اور بشارات کی تصدیق کی ہے جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿إِنَّ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ أَكْثَرَ ٱلَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُو ﴾[2]

(بے شک یہ قرآن کریم بنی اسرائیل کو بہت ساری ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن سے وہ اختلاف رکھتے ہیں)

یہ بات اظہر من الشمس ہے آنحضرت ﷺ جو معلمِ انسانیت، معلمِ اخلاق اور سردارِ دنیا ہیں ان کی آمد کی پیشن گوئیاں انجیل میں متعدد مقامات پر مذکور ہیں چنانچہ انجیل یوحنا کی عبارت ہے:

(اس کے بعد میں تم سے گفتگو نہیں کروں گا کیوں کہ دنیا کا سردار آتا ہے اور اس کا مجھ میں کوئی حصہ نہیں مگر جب وہ مددگار آئے گا تو وہ میری گواہی دے گا)[3]

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

(لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو پھر وہ مددگار تمہاری طرف نہیں آئے گا)[4]

اسی طرح ایک اور مقام پر ذکر ہے کہ:

(مجھے تم سے اور بھی کافی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کرسکتے لیکن جب وہ روح حق آئیں گے تو تمہیں سچائی کا راستہ دکھائیں گے کیوں کہ وہ اپنی جانب سے نہیں کہیں گے بلکہ جو کچھ انہوں نے سنا ہوگا وہی کہیں گے اور

---

[1] بائبل، (پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، 2007ء)، یوحنا:14:16-26:17، 14:25

[2] النمل:76

[3] انجیل یوحنا:14:30، 15:26، 7:16، 12:16 تا 14

[4] ایضا:14:30، 15:26، 7:16، 12:16 تا 14

تمہیں مستقبل کی خبریں دیں گے اور وہ میرا جلال ظاہر کریں گے)[1]

دراصل اس سے مراد قرآن کریم کی وہی آیت کریمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں فرمایاہے کہ جو آپ ﷺ فرماتے ہیں وہ وحی ہوتا ہے اور یہی حقیقت ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾[2]

(اور نہ وہ نبی اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے)

چنانچہ مذکورہ بالا انجیل مقدس کے ان حوالہ جات سے بھی یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ صاحبِ شریعت ہیں اور پیغامِ خداوندی کے ساتھ پوری انسانیت سے مخاطب ہیں

مدعیانِ نبوت کی تاریخ اور تحفظ ختمِ نبوت:

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اسود عنسی نامی ایک شخص نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تو آپ ﷺ کے حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ کو خود اس کے قتل کی مہم کے لیے روانہ فرمایا اور انہوں نے بڑی جدوجہد کے بعد اسود عنسی نامی اس جھوٹے دعویدارِ نبوت کو واصل جہنم کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کو بذریعۂ وحی اس کے قتل کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی۔

اسی طرح آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں مسیلمہ کذاب نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا تو بہت سے لوگ اس کے پیروکار بن گئے آپ ﷺ کی رحلت کے بعد خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف تلوار اٹھا کر باقاعدہ ان سے جہاد کا اعلان کیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں دس ہزار صحابہ کرام کا ایک لشکر روانہ کیا اور مسیلمہ کذاب اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ ختمِ نبوت کے تحفظ اور اس کے منکرین کے مرتد اور واجب القتل ہونے پر یہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کا اجماع تھا۔

اسی طرح سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سجاح بنت حارث نامی ایک عورت جس کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا نے بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا اور عراق سے ایک بڑا لشکر ساتھ لا کر مدینہ منورہ پر قبضے کا منصوبہ بنایا۔ بعد میں یہ مسیلمہ کذاب سے مل گئی اور اس سے نکاح کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کے

---

[1] انجیل یوحنا:14:30، 15:26، 7:16، 12:16 تا 14

[2] النجم:4، 3

خلاف جہاد کیا۔[1]

اسی طرح آنحضرت ﷺ کے زمانے میں طلحہ اسدی نامی ایک شخص نے بھی ارتداد اختیار کر کے دعویٰ نبوت کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے قتل کے لیے حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ کو بھیجا لیکن آپ ﷺ کی رحلت کے بعد اس شخص کا معاملہ سنگینی اختیار کر گیا چنانچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اس کے خلاف جہاد کیا گیا۔[2]

نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی تاریخ میں برصغیر پاک وہند میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا اور مجدد مہدی، مسیح موعود اور پھر آخر میں باقاعدہ نبی بننے کا اعلان کیا اس کا پہلا زمانہ وہ تھا جب وہ خود کو مسلمان کہلوانے والا اور اسلامی بنیادی عقائد کو تسلیم کرنے والا ایک عمومی آدمی تھا بعد میں پھر وہ خود کو مبلغِ اسلام کہنے لگا۔

دوسرے دور میں اس نے تدریجاً کچھ دعوے شروع کیے اور پھر مجدد، مسیح موعود اور مہدی بنا یہاں تک کہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا جب اس کو یہ باور ہوا کہ مسیح موعود تو اللہ کے اولوالعزم رسول و نبی اور صاحب وحی تھے اور عقیدہ ختمِ نبوت کی موجودگی میں کسی نئے شخص کا مسیح موعود ہونا ختمِ نبوت کے خلاف ہے تو اس نے ختمِ نبوت کے معانی میں تحریف شروع کر دی اور نبوت کی خود ساختہ اقسام تشریعی، غیر تشریعی، ظلی، بروزی، لغوی اور مجازی بتا کر ختمِ نبوت کے یقینی عموم و اطلاق کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اور اپنی مزعومہ اقسامِ نبوت سے بعد از وفاتِ نبوی بھی چند اقسام کا جاری رہنا قرار دیا اور یوں خود اس طرح جاری رہنے والی نبوت کا مدعی بن گیا۔

جب کہ تیسرے دور میں اس نے تاویل و تحریف سے بے نیاز ہو کر کھلے عام ہر قسم کی نبوت کے بلا تفریق تشریعی و غیر تشریعی معاملے کو جاری قرار دیتے ہوئے خود کو صاحبِ شریعت نبی بتلایا۔ اس کا دوسرا دور انیسویں صدی عیسوی کے آخر اور بیسویں صدی عیسوی کا آغاز تھا جب کہ پہلا دور اس سے قبل اور تیسرا دور اس کے بعد تھا مذکورہ بیان مرزا قادیانی کی اپنی تصانیف اور اس کے خلیفہ دوم کی تحریرات سے منقول ہے۔[3]

ماضی قریب میں مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ سب سے بڑا فتنہ بن کر سامنے آیا جس کا تسلسل شد و مد کے ساتھ تا حال جاری ہے برصغیر پاک و ہند کی دوسری بڑی اسلامی ریاست بہاولپور جس کی بنیاد 1727ء میں نواب

---

[1] خالد، محمد متین، تحفظِ ختمِ نبوت اہمیت و فضیلت، ناشر۔ ادارہ تالیفاتِ ختمِ نبوت، لاہور 2008ء، ص 50

[2] مشتاق احمد، تاریخ تحفظِ ختمِ نبوت کی صد سالہ، چینیوٹی پرنٹرز اردو بازار لاہور 2008ء، ص 27

[3] محمد شفیع، ختمِ نبوت، مکتبہ معارف القرآن کراچی 2012ء، ص 15

صادق محمد خان عباسی اول نے رکھی اور تحصیل لیاقت پور کے قصبے اللہ آباد کو ریاست کا باقاعدہ پہلا دارالحکومت قرار دیا۔ یہ ریاست برصغیر کی چھ سو ریاستوں میں سے مرتبے کے لحاظ سے بائیسویں نمبر پر تھی جس کے فرماں روا کو سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی ریاست چونکہ خود مختار تھی جس کے باعث اپنا ٹکسال اور سکہ بھی رکھتے تھے اور یہ ریاست دولتِ خداداد کہلاتی تھی۔

برطانوی حکومت کے ہاں ریاست بہاول پور کی اتنی زیادہ اہمیت تھی کہ 1937ء میں جارج ششم(1937ء۔1952ء) کی تاج پوشی کی تقریب میں شرکت کے لیے ہندوستان کے تقریباً چھ سو ریاست کے والیوں میں سے صرف چھ حکمران مدعو کیے گیے جن میں ریاست بہاول پور کے نواب بھی شامل تھے انہوں نے اسلامی تعلیم اور تہذیب و ثقافت کو ترویج دینے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا اور ریاست کا اسلامی تشخص ہمیشہ برقرار رکھا۔

اس ریاست کا انتہائی زرین کارنامہ یہ تھا کہ اسلامی ریاست بہاول پور کی طرف سے 1935ء میں ہی قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا چنانچہ اس تاریخی فیصلے کو مقدمہ بہاول پور کے نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ اس مقدمے میں جب 1931ء میں مقدمہ ڈسٹرکٹ سول جج بہاول پور کی عدالت میں چلتے چلتے جب کے فروری 1935ء کو فیصلہ صادر ہونے کے قریب پہنچا تو فاضل جج فیصلے کا اعلان کرنے میں اس وجہ سے متردد و متذبذب تھے کہ کہیں انگریزی و برطانوی حکومت ریاست بہاول پور کو نقصان نہ پہنچائے۔

جب اس بات کا علم والئ ریاست بہاولپور نواب صادق محمد خان عباسی کو ہوا تو انہوں نے جج محمد اکبر خان مرحوم سے بغیر کسی خوف وڈر کے اعلانیہ طور پر کہا کہ آپ قادیانیوں کو سرِ عام اعلانیہ طور غیر مسلم قرار دیں اگر میری ایک کیا، ہزار ہا ریاستیں بھی سرکار دوعالم ﷺ کی ختمِ نبوت کے تحفظ میں قربان ہو جائیں تو یہ میرے لیے نہایت ہی سعادت مندی ہو گی۔ یوں یہ برصغیر پاک وہند کی کسی عدالت سے پہلی مرتبہ باضابطہ ایسا فیصلہ تھا جس میں قادیانیت کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔

بعد ازاں پاکستان کی قومی اسمبلی نے 7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ مسیلمہ کذاب سے لے کر اسود عنسی اور مرزا غلام احمد قادیانی تک بہت سے لوگوں نے نبوت و مسیحیت اور مہدیت کے دعوے کیے لیکن مسیلمہ کذاب کے بعد اس دجل و کذب کی جو معراج مرزا غلام احمد قادیانی کو ملی اس کے مقابلے میں باقی مدعیانِ نبوت ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا قادیانی کا ولی، مجدد، مثیل، مسیح، مسیح موعود، مہدی معہود، ظلی نبی، امتی نبی اور رسول اللہ ہونے کے بہت سے دعوے کرنا اور اس کے ثبوت میں تقریباً دس ہزار سے زائد صفحات قلمبند کرنا کسی ایسے جھوٹے نبی کی مثال

خال خال ہی ماضی میں یا مستقبل میں مل سکے۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے معتقدین کو بائیں وجہ دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے اور ان کے کفر پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے وطن عزیز پاکستان کا ریاستی مذہب اسلام ہے چنانچہ تحریک راست اقدام اور تحریک ختمِ نبوت کے نتیجے میں سینکڑوں شہادتیں پیش کرنے کے بعد پاکستان میں 5 اگست 1974ء تا 7 ستمبر 1974ء قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی میں ان کیمرا اجلاس میں یہ مسئلہ قادیانیت مسلسل زیرِ بحث رہا اور اس کی (3017) صفحات پر مبنی رپورٹ میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں۔ چنانچہ آئین پاکستان میں تحریر ہے کہ:

ا۔ مسلمان سے مراد ایسا شخص ہے جو وحدت و توحید قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی ختمِ نبوت پر مکمل اور غیر مشروط ایمان رکھتا ہو اور پیغمبر یا دینی مصلح کی حیثیت میں کسی ایسے شخص پر ایمان نہ رکھتا ہو نہ ہی اس کو مانتا ہو کہ جس نے آنحضرت ﷺ کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہو یا دعویٰ کرنے والا ہو۔

ب۔ غیر مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو مسلمان نہ ہو اور اس میں عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ مت یا پارسی مذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا (جو خود کو احمدی یا کسی اور نام سے موسوم کرتے ہیں) کوئی شخص یا کوئی بہائی اور جدولی ذاتوں میں سے کسی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص شامل ہے۔[1] چنانچہ قادیانیت کا مسئلہ مکہ کانفرنس اور اس کے علاوہ 2015ء میں گیمبیا کی اسلامی کونسل نے بھی قادیانیوں کو ریاستی سطح پر غیر مسلم قرار دیا۔[2]

اسی طرح اس سے پہلے مجمع الفقہ الأسلامی الدولی (International Islamic Fiqh Academy) کی طرف سے 1985ء میں اجماعی طور پر عقیدہ ختمِ نبوت کے انکار کے باعث اس گروہ کو خارج از اسلام قرار دیا جاچکا ہے۔[3] چنانچہ مرزا قادیانی نے دیگر جھوٹے مدعیانِ نبوت کی مانند یہ دعویٰ کیا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس کی نبوت اور وحی کا انکار کرنا کفر ہے، وہ لکھتا ہے:

(جو شخص تیری پیروی نہیں کرتا اور نہ تیری بیعت میں داخل ہوتا ہے اور مخالفت کرتا رہتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا اور جہنمی ہو گا)[4]

---

[1] آئین پاکستان: دفعہ: 260

[2] https://allafrica.com/stories/20150126-2078.html.Retreivedon 31-May-2019

[3] http://www.iifa.aifi.org/1576.html Retreived on 31-May-2019

[4] قادیانی، مرزا غلام احمد، تذکرہ، ایڈیشن چہارم 2007ء، ضیاء الأسلام پریس، ص 280

مرزا قادیانی ایک اور مقام پر لکھتا ہے:(اللہ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ ہر وہ شخص جسے میری دعوت پہنچ چکی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے اور اللہ کے ہاں قابل مؤاخذہ ہے)[1] اسی طرح مرزا کے مریدین اس پر کیسا کفریہ اعتقاد رکھتے تھے اس کا اندازہ اس کے خلیفہ حکیم نور الدین کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے:

> یہ تو فقط نبوت کی بات ہے میرا ایمان ہے کہ اگر مسیح موعود صاحب شریعت نبی ہونے کا دعویٰ کریں اور شریعت قرآنیہ کو منسوخ کردیں تو میں پھر بھی انکار نہیں کروں گا کیوں کہ جب ہم نے آپ کو واقعی صادق اور من جانب اللہ پایا ہے تو اب آپ جو بھی کہیں گے وہی حق ہوگا اور ہم سمجھ لیں گے کہ آیت خاتم النبیین کے کوئی اور معنیٰ ہوں گے)[2]

اسی بات کا اظہار مرزا قادیانی کے بیٹے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی کتاب آئینۂ صداقت میں "میرا عقیدہ مسئلہ کفر غیر احمدیان کے متعلق" کے عنوان کے تحت امت مسلمہ کو کافر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ: چونکہ میرے نزدیک وہ وحی جس کا ماننا ساری نوع انسانیت پر فرض کیا گیا ہے حضرت مسیح موعود پر ہوئی ہے اس لیے میرے نزدیک بموجب تعلیم القرآن کے ان کے نہ ماننے والے کافر ہیں چاہے وہ باقی صداقتوں کو مانتے ہوں ۔ اس لیے کہ کفر کے موجبات میں سے کسی میں اگر کسی میں ایک موجب بھی موجود ہو تو وہ کافر ہوتا ہے)[3]

وطنِ عزیز پاکستان میں اگرچہ قوانین موجود ہیں مگر ان قوانین کے مؤثر عملی نفاذ کی اشد ضرورت ہے دستوری قوانین کے تحت 1984ء میں جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں قومی اسمبلی نے قانون منظور کیا جس کے نتیجے میں فرقہ احمدیہ کا خود کو مسلمان کہنا اور اسلامی مخصوص اصطلاحات کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔ اس قانون کے تحت تعزیراتِ پاکستان کی شق 298 میں دو ذیلی دفعات کا اضافہ کیا گیا جس کے مندرجات یہ ہیں:

> (B-298 تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے مطابق احمدی پاکستان میں مرزا غلام احمد کی بیوی کو ام المؤمنین، گھر والوں کو اہلِ بیت، پیروکاروں کو صحابی، اور جانشین کو خلیفۃ

---

[1] قادیانی، مرزا غلام احمد، تذکرہ، ایڈیشن چہارم 2007ء، ص519

[2] مرزا، بشیر الدین محمود، سیرت المہدی، نظارت اشاعت ربوہ پاکستان، ضیاء الأسلام پریس پاکستان، حصہ اول، 1/88

[3] أیضاً، 6/112

المسلمین کہنا جرم ہے"

"298-C مذکورہ دفعہ میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ احمدی یا لاہوری گروپ خود کو براہِ راست یا بالواسطہ مسلمان کہیں یا اپنے مذہب کو اسلام کہیں یا اپنے مذہب کی اشاعت یا تبلیغ کریں یا کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کریں تو ان تمام صورتوں میں تین سال تک قید اور جرمانہ کے مستحق ہوں گے)[1]

چنانچہ اس قانون کے خلاف بنیادی انسانی حقوق کی بنیاد پر سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل کی گئی کہ انہیں شعائرِ اسلام کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ قادیانی اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں جو کہ بنیادی حقوق میں شامل نہیں اور نہ ہی اس سے کسی کے حقوق سلب ہوتے ہیں چنانچہ سپریم کورٹ آف پاکستان سے فل بینچ کے تاریخی فیصلے ظہیر الدین بنام سرکار کی رو سے کوئی قادیانی خود کو مسلمان کہلوا سکتا ہے اور نہ ہی اپنے دین کی تبلیغ کر سکتا ہے۔[2]

خلاصہ بحث:

عقیدہ عصمت انبیاء دین کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس کو یہاں قرآن و حدیث کے دلائل سے ثابت کر کے اس کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح عصمت کے حوالے سے فقہاء کرام کی آراء کو بھی بیان کیا گیا ہے اور عصر حاضر میں اس کی کلامی تعبیر اور مستشرقین کے افکار و نظریات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے چنانچہ واقعہ غرانیق سے پیدا ہونے والے اشکالات اور ان روایات کی سند پر بھی یہاں تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ اور آزادی اظہار رائے کے لبادے میں انبیاء کرام کی عصمت و ناموس کے احترام و تقدس کے حوالے سے مغربی تصور جو کہ انتہائی توہین آمیز ہے اور جس کی وجہ سے انبیاء کی شان میں اکثر گستاخانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں، کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس حوالے سے بین الاقوامی سطح پر قانون سازی کی ضرورت کے حوالے سے تجویز پیش کی گئی ہے۔

اسی طرح عقیدہ ختم نبوت بھی بنیادی عقیدہ اسلام ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہاں اس عقیدے کو قرآن و احادیث، اجماع امت اور عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے اور اس حوالے سے علامہ سہیلی کی مہر نبوت سے

---

[1] Pakistan Penal Code XLV of 1860, Sec 298, Mansoor Book House Lhr, 1995, p: 294.

[2] مقدمہ ظہیر الدین بنام سرکار، SCMR 1993, Page 1718

متعلق تفصیل بھی ذکر کی گئی ہے جبکہ سابقہ کتب میں ختم نبوت سے متعلق بشارات کا تذکرہ کر کے جھوٹے مدعیان نبوت کی تاریخ اور تحفظ ختم نبوت کے حوالے سے تفصیلی دلائل ذکر کیئے گئے ہیں اور بالخصوص مرزا غلام احمد قادیانی اور قادیانیت کا تعارف ذکر کر کے 7 ستمبر 1974 میں قومی اسمبلی سے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تفصیلات اور مرزا قادیانی اور اس کے پیروکاروں کے عقائد و نظریات کا تفصیلی جائزہ لیکر ان کے دجل و فریب کو واضح کیا گیا ہے۔

باب چہارم:
معجزات النبی ﷺ سے متعلق عصری اشکالات کا تجزیہ

فصل اول: معجزات النبی ﷺ سے متعلق کلامی مباحث

فصل دوم: معجزات سے متعلق عقلی اشکالات کا تجزیہ

فصل اول:
معجزات النبی ﷺ سے متعلق کلامی مباحث

فصل اول: معجزات النبی ﷺ سے متعلق کلامی مباحث

انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے ہاتھوں پر صادر ہونے والے خوارق عادت واقعات کو قران کریم اور احادیث میں آیات وبینات اور براہین کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ محدثین کرام ان کو "دلائل اور علامات" کی تعبیرات سے یاد کرتے ہیں جبکہ متکلمین اور فلاسفہ کے ہاں ان کو "معجزہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔[1]

چنانچہ معجزہ کی اصطلاح اس قدر معروف اور رائج ہوگئی ہے کہ بغیر کسی غور وفکر اور تدبر کے جب یہ لفظ بولا جائے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات انبیاء کرام علیہم السلام کے دست ہائے مبارک پر بعض ایسے غیر معمولی خرق عادت واقعات رونما ہوئے کہ جن کے حوالے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کیسے اور کیوں رونما ہوئے؟ جب کہ ان پر ایمان لانا اور یقین کرنا ضروری ہے اس قسم کے اعتقادی مسائل پر آنحضرت ﷺ کے حوالے سے بعض مستشرقین اور جدید مفکرین و فلاسفہ نے متعدد قسم کے اعتراضات کر کے ان کا انکار کیا ہے۔ سطور ذیل میں معجزہ کے معنی ومفہوم معجزہ کی اقسام اور اس کے حوالے سے مغربی مفکرین وفلاسفہ کے موقف کی روشنی میں معجزات سے متعلق کلامی مباحث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

معجزہ لفظ عجز سے ماخوذ ہے جس کا مادہ ع-ج-ز ہے۔ اس کے لغوی معانی عاجز کرنے والا مافوق العادت کے ہیں عجز (عاجزہوا یعجز عجزا۔

(عجز کا لغوی مطلب کسی شے سے پیچھے رہ جانا یا اس کو اس وقت حاصل کرنا کہ جب اس کے حصول کا وقت جا چکا ہو۔ مگر عموماً اس کا استعمال کسی کام کے کرنے سے قاصر ہونے پر کیا جاتا ہے) [2]

لفظ "عجز" درحقیقت "القدرۃ" کا متضاد ہے یعنی کوئی آدمی کسی کام کے کرنے سے قاصر ہو اور اس کے لئے خود کو عاجز سمجھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هٰذَا ٱلْغُرَابِ فَأُوَٰرِيَ سَوْءَةَ أَخِيۖ فَأَصْبَحَ مِنَ ٱلنَّٰدِمِينَ﴾[3]

(میں اس بات سے بھی قاصر رہا کہ اس کوے کی مانند اپنے بھائی کے مردہ

---

[1] الزرقانی، محمد عبد الباقی، شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، مطبعۃ الازہریہ مصر، 5/80، 1362ھ

[2] الاصفہانی، راغب، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، ص338

[3] المائدۃ:31

جسم کو چھپا سکتا)

لفظ معجزہ عجز سے نکلا ہے جس کے معنی عاجز ہونا ہے یا بے بس ہونا ہے معجزہ سے مراد کسی پیغمبر یا نبی کا ایسا کام کر کے دکھانا جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ معجزہ دکھانے سے مراد کوئی انوکھی بات کر دکھانا یا کرشمہ دکھانا وغیرہ ہے۔ معجزہ ہونا سے مراد کوئی انوکھا کام جو قانون قدرت کے خلاف ظہور پذیر ہو یا انتہائی تعجب خیز ہو یعنی ایسے امور جن کے کرنے کی انسان طاقت نہ رکھتا ہو۔ اور ان خرق عادت امور کا صدور نبی سے ہو۔(اصطلاح شریعت میں معجزہ سے مراد ایسا عمل ہے کہ جو سلسلہ اسباب کے بغیر وجود پذیر ہو جائے اسی وجہ سے عمومی گفتگو میں اس کو'' خرق عادت'' بھی کہا جاتا ہے)[1]

اللہ تعالی نے اس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے جملہ امور کو اسباب و علل کے ساتھ منسلک کیا ہوا ہے۔ اس کائنات ارضی و سماوی میں کوئی بھی عمل بلا سبب روبہ عمل نہیں ہوتا۔ لہذا یہی قانون فطرت کہلاتا ہے۔ مگر بسا اوقات اللہ تعالی اپنے بندوں پر اپنی قدرت کاملہ کے ظہور کے لیے اپنے اسی قانون فطرت میں تبدیلی فرما کر اپنے مخصوص بندوں یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے ان خوارق عادت امور کو ظاہر فرماتے ہیں جو کہ معجزہ کہلاتا ہے۔

خدائی قوانین فطرت دو اقسام پر مشتمل ہیں عادت عام اور عادت خاص۔

عادت عام سے مراد وہ قوانین قدرت ہیں جو باہم اسباب و مسببات کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں جیسے آگ کا جلانا اور پانی کا خنکی پہنچانا وغیرہ۔ جبکہ عادت خاص کا مطلب یہ ہے کہ اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے واضعِ قدرت نے کسی خصوصی مقصد کے لیے سبب اور مسبب کے درمیان رشتے کو کسی چیز سے علیحدہ کر دیا۔ یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا۔ جیسا کہ جلنے کے اسباب کی موجودگی کے باوجود کوئی جسم آگ سے نہ جلے یا دو تین انسانوں کی خوراک کے بقدر کھانے سے ایک یا دو سو انسانوں کا شکم سیر ہو جانا اور اصلی مقدار کا پھر بھی بچ جانا وغیرہ۔

ان دونوں باتوں کی طرح جب کوئی چیز رونما ہوتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قانون قدرت یا عادت اللہ کے خلاف ہے جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ قوانین فطرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف تو ہے مگر عادت خاص کے خلاف نہیں ہوتی اور وہ بھی قدرتی قانون کی ایک کڑی ہوتی ہے جو عمومی حالات سے الگ کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لیے ظاہر کی جاتی ہے اور اس مقام پر وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح اللہ تعالی اپنے رسول برحق اور پیغمبر کی صداقت و حقانیت کی تصدیق کرتا اور تکذیب کرنے والوں کو یہ باور کراتا ہے کہ اگر یہ مدعی رسالت اپنے دعوے میں سچا نہ ہوتا تو تائید خداوندی کبھی بھی اس کے ساتھ نہ ہوتی۔

---

[1] سیوہاروی، حفیظ الرحمان، قصص القرآن، میر محمد کتب خانہ، کراچی، 1/138، 1360ھ

لہذا عام قانون قدرت سے جدا رسول و پیغمبر کا یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ در حقیقت یہ اس کا ذاتی فعل نہیں ہے بلکہ یہ فعلِ خداوندی ہے جو عادت خاص کے طور پر نبی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا تاکہ اس کی حقانیت کے لیے ثبوت بن سکے۔ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں معجزہ کے حوالے سے یوں رقمطراز ہے:

(إن الله يخلقها بغير سبب لتدل على أن السنن والتواميس لاتحكم على واضعها و مدبرها، و إنما هو الحاكم المتصرف بها) [1]

(اللہ رب العزت معجزہ کو اپنے عادی نظام کے خلاف صرف اپنی قدرت سے ظاہر کرتا ہے تاکہ یہ ثابت کردے کہ قوانین طبعیہ خود اس کے محکوم ہیں نہ کہ وہ ان کا محکوم ہے اور وہ جیسے چاہے ان میں تصرف کر سکتا ہے۔)

معجزہ دراصل نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالی کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور معجزہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ نبی اور رسول بھی ایک انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور کسی انسان کے اختیار میں یہ شامل نہیں کہ وہ خدائی قوانین عام و خاص میں دخل اندازی یا در اندازی کر سکے۔ یہ قدرت کی مرضی ہے کہ وہ اگر چاہے تو حال و اقتضا کی مناسبت سے نبی و رسول کے ہاتھ پر ایسے فعل کو ظاہر کردے جو اس کے قوانین فطرت کی عادت خاص کی قسم میں داخل ہوں۔ اور اگر نہ چاہے تو نبی و رسول کے لیے بھی اس کا اظہار ناممکن اور محال ہے۔[2]

معجزہ سے مراد وہ امر یا وہ چیز جو خلافِ عادت اور قانونِ قدرت کے مخالف ہو یعنی کوئی کام اپنے اسبابِ عادیہ کے بغیر کسی انسان سے دعوائے نبوت کے بعد صادر ہو تو اسے خارقِ عادت یا معجزہ کہا جاتا ہے۔

پھر یہ خارقِ عادت شے کا ظہور اگر مدعیٔ نبوت پر ظہور پذیر ہو تو اس کو معجزہ کہتے ہیں کہ مخالف کو اس کے مثل کام کرنے سے عاجز کردیتا ہے۔ اب چاہے مدعی نبوت سے یہ معجزہ ایک معمولی انداز سے صادر ہو یا اس وقت نبوت کا دعویٰ بھی ہو اگر یہ خارقِ عادت نبی کے متبع سے صادر ہو اور وہ ولی ہے تو اس کو کرامت کہا جاتا ہے اور اگر غیرِ ولی، مؤمن صالح سے اس کا صدور ہوا ہو تو اس کو معاونت کہتے ہیں اور جو نبی سے قبل نبوت سرزد ہو تو اس کو ارہاص کہا جاتا ہے جبکہ کسی بدعمل سے اس کا

---

[1] شیخ محمد عبدہ، تفسیر المنار، مکتبۃ المنار، مصر، ص315، 1954ء

[2] سیوہاروی، حفیظ الرحمان، قصص القرآن، میر محمد کتب خانہ، کراچی، 1/131

صدور ہو تو اس کو استدراج کہا جاتا ہے۔[1]

معجزہ اگرچہ نبوت کی دلیل اور نصرتِ خداوندی کا ثبوت ہے مگر انبیاء کرام علیہم السلام کی حقانیت کو تسلیم کرنے اور ان کی دعوت پر لبیک کر کے ایمان لانے کے لیے معجزہ کا ظہور لازمی نہیں ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

در دل ھر کس کہ از دانش مزہ است روے و آواز پیمبر معجزہ است[2]

(یعنی نبوت کی تصدیق کے لیے معجزہ لازم نہیں، جس کے دل میں ایمان کا لطف ہوتا ہے پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام کرتی ہیں)

علاماتِ نبوت اور معجزات:

علاماتِ نبوت (جن کے لیے قرآن کریم نے آیات کا لفظ استعمال کیا ہے) اور معجزات دونوں میں فرق ہے۔ چنانچہ معجزہ میں مخالف کو چیلنج کیا جاتا ہے جس کی بناء پر وہ اپنے مدمقابل کے چیلنج کے مقابلے سے بے بسی اور عاجزی کا مظاہرہ کرتا ہے جبکہ آیات وعلامات میں چیلنج شرط نہیں ہے۔ اس طرح ان دونوں (علامات و آیات اور معجزات) میں نسبت عموم و خصوص ہے۔

عمومی طور پر عام انسانوں کی زندگی میں بھی بسا اوقات غیر متوقع حالات و واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ جیسے کبھی کبھی انتہائی قسم کی کوششوں کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ملنا یا غیر متوقع لحاظ سے حالات میں تبدیلی واقع ہونا، خطرناک حوادث میں کسی کا زندہ بچ جانا، حالات و واقعات میں اچانک تبدیلی سے نئی صورت حال کا سامنا ہونا وغیرہ اس قسم کے واقعات کے لیے عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ تو معجزہ ہی ہوا ہے، ورنہ اس کا امکان نہیں تھا۔ مگر عام انسانوں کے ساتھ رونما ہونے والے حالات و واقعات اور انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ رب العزت کی طرف سے عطا کردہ معجزات میں بہت فرق ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے دعوائے نبوت کے بعد جو معجزات عطائے ربانی ہوتے ہیں وہ عمومی واقعات سے کہیں مختلف اور انتہائی سطح کی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔

در حقیقت معجزات قانونِ قدرت کے عین مطابق ہوتے ہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ الگ ہے کہ یہ قدرت کے اس اعلیٰ وارفع قانون پر مشتمل ہوتے ہیں کہ جن کے پس منظر اور پیش منظر کو جاننا ہماری استطاعت و طاقت میں نہیں

---

[1] حقانی، عبدالحق، تفسیرِ حقانی (مقدمہ)، دارالاشاعت دہلی، 1/5، 1357ھ

[2] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، مطبع مجید، کانپور، ص103، 1216ھ

ہوتا۔[1]

جن انبیاء کرام علیہم السلام سے معجزات کا صدور ہوتا ہے ان کو تائید ایزدی حاصل ہوتی ہے لہذا روحانی اور معنوی ہر دو اعتبار سے ان کی نوعیت خصوصی ہوتی ہے۔ ان معجزات کے رونما ہونے کے لیے حیران کن طور پر قوانین فطرت یا تو بدل دیئے جاتے ہیں یا ان کی حالت تبدیل کر دی جاتی ہے، جس کے باعث ان کی عند اللہ مقبولیت کو واضح کرنے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کے مبارک ہاتھوں پر غیر معمولی کارناموں کا ظہور ہوتا ہے۔

جہاں تک معجزہ کے تصور کی بات ہے تو اس کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے اور تقریباً تمام مذاہب معجزات کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں معجزہ کو اساس قرار دینا درست نہیں اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے واضح انداز میں فرمایا کہ کسی الہامی مذہب کی تائید کے لیے معجزات بنیادی و اساسی نہیں بلکہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ الہامی مذاہب کی اصل بنیاد عقل اور پیغمبر کی سیرت و تعلیمات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے معجزہ کو طلب کرنے پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے اور لوگوں کو عقل و دانش اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلْقُرْءَا ﴾[2]

(کیا پس وہ قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتے؟)

اسی طرح یہود نے حضور نبی کریم ﷺ سے آتشیں معجزے کی طلب جب کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ٱلَّذِينَ قَالُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَآ أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ ٱلنَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِي بِٱلْبَيِّنَٰتِ وَبِٱلَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴾[3]

(وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان لائیں جب تک ایسی قربانی کا حکم نہ لایا جائے جس کو آگ کھا جائے۔ آپ فرما دیجئیے کہ مجھ سے پہلے بہت سے رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں اور یہ حکم لے کر آئے جو تم کہتے ہو پھر تم نے ان کو کیونکر قتل کیا؟ اگر تم سچے ہو)

اسی طرح جب قریش مکہ نے اپنے مطالبات کی لمبی فہرست پیش کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، 19/454، 1973ء

[2] النساء:82

[3] آل عمران:183

﴿وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانِ مِن كُلِّ مَثَلٖ فَأَبَىٰٓ أَكۡثَرُ ٱلنَّاسِ إِلَّا كُفُورٗا ٨٩ وَقَالُواْ لَن نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ ٱلۡأَرۡضِ يَنۢبُوعٗا ٩٠ أَوۡ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٞ مِّن نَّخِيلٖ وَعِنَبٖ فَتُفَجِّرَ ٱلۡأَنۡهَٰرَ خِلَٰلَهَا تَفۡجِيرًا ، أَوۡ تُسۡقِطَ ٱلسَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا أَوۡ تَأۡتِيَ بِٱللَّهِ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ قَبِيلًا ، أَوۡ يَكُونَ لَكَ بَيۡتٞ مِّن زُخۡرُفٍ أَوۡ تَرۡقَىٰ فِي ٱلسَّمَآءِ وَلَن نُّؤۡمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيۡنَا كِتَٰبٗا نَّقۡرَؤُهُۥۗ قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّي هَلۡ كُنتُ إِلَّا بَشَرٗا رَّسُو ﴾[1]

(اور بے شک اس قرآن کریم میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثل بیان فرمائی تو اکثر لوگوں نے نہیں مانا اور ناشکری کی۔ اور کہا کہ ہم تم پر ہر گز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ بہادیں یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو پھر تم اس کے اندر بہتی نہریں رواں کرو، یا تم ہم پر آسمان گرادو جیسا تم نے کہا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا اللہ اور فرشتوں کو ضامن لے آؤ یا تمہارے لیے طلائی گھر ہو، یا تم آسمان میں چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھ جانے پر بھی ہر گز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم پر ایک کتاب نہ اتار دو جو ہم پڑھیں۔ آپ کہہ دیجئیے پاکی ہے میرے رب کے لیے میں نہیں ہوں مگر اللہ کا بھیجا ہوا انسان)

ایمان لانے کے لیے معجزہ کو دلیل یا ثبوت بنانے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسند نہیں کیا گیا مگر انبیاء کرام علیہم السلام کو حمایتِ ربانی کے حصول کے ثبوت کے لیے اللہ رب العزت نے اپنے ان برگزیدہ بندوں کو بے شمار معجزات عطا کئے جیسا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کے دور میں طوفان سے منکرینِ حق کی فنائیت، حضرت ہود علیہ السلام کی بد دعا سے قوم عاد کی تباہی، صالح علیہ السلام کی ناقہ کی کونچیں قطع کرنے پر قومِ ثمود کی بربادی، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں لشکرِ فرعون کا غرق ہونا اور دوسرے کئی عذابات، حضرت ابراہیم پر آتشِ نمرود کا گل و گلزار بن جانا، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا، بیماروں کو صحت مند اور مردوں کو باذن اللہ زندہ کرنا، اندھوں کو بینائی عطا کرنا وغیرہ یہ تمام معجزات جو حضور اکرم ﷺ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کو دئے گئے تھے، تائیدِ ایزدی کے ایسے عظیم مظاہر ہیں کہ جن کے انمٹ نشانات تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

---

[1] الاسراء:89تا93

انبیائے سابقین کے علاوہ حضور ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے لاتعداد معجزات عطا فرمائے تھے جن کو باری تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود ذکر فرمایا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ٱقۡتَرَبَتِ ٱلسَّاعَةُ وَٱنشَقَّ ٱلۡقَمَرُ ، وَإِن يَرَوۡاْ ءَايَةٗ يُعۡرِضُواْ وَيَقُولُواْ سِحۡرٞ مُّسۡتَمِرّٞ﴾[1]

(شق ہو گیا چاند اور دیکھیں کوئی نشانی تو منہ پھیرتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جو چلا آتا ہے)

اسی طرح ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَئِن جِئۡتَهُم بِأٓيَةٖ لَّيَقُولَنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ إِنۡ أَنتُمۡ إِلَّا مُبۡطِلُونَ﴾[2]

(اور اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی لے آئے تب بھی یہ لوگ جو کافر ہیں یہی کہیں گے کہ تم سب باطل ہو)

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِذَا رَأَوۡاْ ءَايَةٗ يَسۡتَسۡخِرُونَ وَقَالُوٓاْ إِنۡ هَٰذَآ إِلَّا سِحۡرٞ مُّبِينٌ﴾[3]

(اور جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس کا تمسخر اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے)

ایک اور مقام پر اسی طرح ان کفار کے بارے میں معجزے (قرآن) کے ردِ عمل میں اللہ تعالیٰ ان کے قول کو ذکر فرماتے ہیں:

﴿أَمۡ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُۥۚ بَل لَّا يُؤۡمِنُونَ - فَلۡيَأۡتُواْ بِحَدِيثٖ مِّثۡلِهِۦٓ إِن كَانُواْ صَٰدِقِينَ﴾[4]

(کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم کو خود گھڑ لیا ہے بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے تو یہ لوگ اس طرح کا کوئی کلام بنا کر لے آئیں اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں)

مذکورہ بالا تمام آیات کریمہ سے اللہ رب العزت یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ معجزات سے کسی قوم کو ہدایت نہیں حاصل ہوتی بلکہ معجزات کی کثرت اکثر باغیانہ روش کا باعث بن جاتی ہے۔ اور جو لوگ قلبی طور پر ایمان قبول کرتے ہیں ان کے لیے محض عقل و بصیرت کی نشانی ہی کافی ہوتی ہے، مگر جن کے دل ایمان کی نعمت قبول کرنے کے قابل

---

[1] القمر:2،1

[2] الروم:58

[3] الصافات:14،15

[4] الطور:33،34

نہیں ہوتے ان کے سامنے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا بھی باعثِ ہدایت نہیں بنتا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ معجزات ایمان کا جزو نہیں بلکہ ایمان کی نعمت اور ہدایت کے حصول کے لیے انسانی عقل و دانش اور ملکہ فہم و بصیرت بھی کافی ہے۔ وہ انبیاء کرام کی سیرت و کردار سے بھی ایمان لے آتے ہیں۔ جبکہ جن لوگوں کے قلوب ایمان کی روشنی سے خالی ہوتے ہیں وہ کھلے عام معجزات دیکھ کر بھی دولتِ ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہی ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمُ ٱلۡحَقُّ قَالُواْ هَٰذَا سِحۡرٞ وَإِنَّا بِهِۦ كَٰفِرُو ﴾[1]

(اور جب ان کے پاس حق آ گیا تو بولے کہ یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں)

قرآن کریم بار بار اس بات پر زور دے کر کہتا ہے کہ معجزہ پیش کرنا نبی کے اپنے بس میں نہیں ہوتا، یہاں تک کہ بعض اوقات نبی یا پیغمبر کی خواہش کے باوجود بھی معجزہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کا ظہور خالصتاً تائیدِ ربانی ہے اور تمام خوارقِ عادت یعنی معجزات کا ظہور محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہی ممکن ہوتا ہے جو وہ اپنے خصوصی بندوں یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے لوگوں کو دکھاتے ہیں۔

اسی وجہ سے قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی معجزاتِ انبیاء کا تذکرہ آیا ہے وہاں پر "باذن اللہ" اور "باذنی" کے الفاظ کو بار ہا دہرایا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء و رضا کے بناء انبیاء کرام علیہم السلام بھی معجزے کے اظہار سے قاصر ہوتے ہیں جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿أَنِّي قَدۡ جِئۡتُكُم بِأٓيَةٖ مِّن رَّبِّكُمۡ أَنِّيٓ أَخۡلُقُ لَكُم مِّنَ ٱلطِّينِ كَهَيۡـَٔةِ ٱلطَّيۡرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيۡرَۢا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۖ وَأُبۡرِئُ ٱلۡأَكۡمَهَ وَٱلۡأَبۡرَصَ وَأُحۡيِ ٱلۡمَوۡتَىٰ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۖ ﴾[2]

(یقیناً میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی سی مورت بناتا ہوں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو اور میں مردے زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی نبی یا پیغمبر کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی پیغمبر کی زندگی، کتابِ مبین

---

[1] الزخرف:30

[2] آل عمران:49

کی موجودگی اور عقلی دلائل و براہین کی روشنی میں اس کی صداقت پر ایمان لانا لازم اور ضروری ہوتا اور اس کا انکار مذہب کی اصطلاح میں کفر و جمود مانا جاتا مگر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ آفتابِ صبح سے زیادہ واضح عقلی و نقلی دلائل کے باوجود بھی عوام الناس کی فطرت اکثر و بیشتر قبول حق و صداقت کے لیے بھی دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہو جاتی ہے جو عقلِ انسانی کو حیران و مرعوب کر کے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ ہی نبی کا یہ عمل بلاشبہ خدا کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے کہ جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور اس کے مظاہرہ کے سامنے عاجز و درماندہ۔ اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بلاشبہ اس ہستی کو خداتی نصرت حاصل ہے اور اس کا ہر قول من جانب اللہ ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کو بے شمار معجزات عطا فرمائے ہیں جن کی تعداد تمام انبیاء سابقہ کی تعداد سے کافی زیادہ ہے۔ اس تعداد کے حوالے سے اہلِ علم کی مختلف آراء ہیں۔ علامہ الزاھدی رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کے معجزات کی تعداد ایک ہزار، امام نووی رحمہ اللہ نے بارہ سو جبکہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے بھی الخصائص الکبریٰ میں معجزات کو ایک ہزار شمار کیا ہے۔

نبوت کی حقانیت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے لوگ عموماً پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے کہ جو معجزہ کو نبوت کی دلیل ٹھہراتے ہیں اور ان کے ہاں نبوت کی تصدیق کے لیے معجزہ کا صدور لازم ہے۔ جبکہ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے خود غور و فکر کریں اپنی عقل و فہم سے کام لیں اور دعوائے نبوت کرنے والے کی وعظ و نصیحت اور لوگوں پر اس دعوتِ حق کے اثرات کہ آیا لوگوں کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے اور لوگوں کے دل اس حقانیت کی روشنی سے منور ہو رہے ہیں۔

لہٰذا دعویٰ نبوت وسچا اور برحق ہے اور اس دعوے کا مدعی اللہ کا پیغمبر اور نبی ہے جو کہ خود کامل ہے اور جس کے وجود سے پھوٹنے والی نبوت کی منور کرنیں نیک اور صالح افراد میں جذب ہو کر انہیں بھی مومن کامل بنا رہی ہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کا وجود مجسم سچائی کی دلیل ہوتا ہے مگر اتمامِ حجت کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام سے کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر ہوتے ہیں اور عقلِ انسانی اس سلسلے میں خود کو عاجز اور بے بس پاتی ہے ان واقعات میں غیبی طاقت دخیل ہوتی ہے اور عالمِ غیب کے ساتھ ان کا ربط اور تعلق ظاہر ہوتا ہے اور یہی واقعات معجزات ہیں۔

عام انسان جن کی عقل اور ذہن پیغمبر کی حقانیت کو ان کے وجود مجسم سے سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے اور ان

---

[1] سیوہاروی، حفیظ الرحمان، قصص القرآن، میر محمد کتب خانہ، کراچی، 1360ھ، 1/131

کی بصیرت حقانیت کے اس مقام تک پہنچنے کے قابل نہیں ہوتی ایسے لوگوں پر معجزات اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا نفس جو غفلت کے پردے میں سچائی کو قبول کرنے سے محروم ہے معجزہ کا ظہور اچانک ان کو جھنجھوڑ کر ان کے نفس کو غفلت کے پردے سے باہر لاتا ہے اور ایمان کی حقیقت ظاہر کرواتا ہے جس کے باعث ضلالت اور گمراہی سے نکل کر نورِ ایمان میں آجاتا ہے اور یوں عموماً ظہورِ معجزہ کے باعث شرک و ضلالت میں مبتلا لوگ جوق در جوق دولتِ ایمان سے مستفید ہونا شروع ہوتے ہیں۔

معجزہ کا اصل سبب فقط مشیتِ خداوندی اور ارادۂ ربانی ہے۔ اس مشیتِ ایزدی سے کبھی عاداتِ جاریہ میں ہی معجزہ کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی عاداتِ جاریہ اور اسبابِ وعلل کے علاوہ معجزہ رونما کروایا جاتا ہے جیسے طوفانِ نوح کا آنا، حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے آندھی کا چلنا، قوم ہود کے لیے آتش فشاں کا پھٹنا اور زلزلہ آنا، مکہ مکرمہ میں عظیم قحط کا رونما ہونا یہ سب عاداتِ جاریہ کے مطابق ہے مگر ان واقعات سے منکرین کا فنا ہونا اور اہلِ ایمان کا محفوظ رہنا معجزہ ہے جبکہ چاند کے دو ٹکڑے ہونا، انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا، لاٹھی کا اژدھا بن جانا، درختوں کا اپنے مقام سے حرکت کرنا، مردہ کا زندہ ہو جانا یہ سب عاداتِ جاریہ کے خلاف ہے جو کھلا معجزہ ہے۔

خرقِ عادت کے اعتبار سے معجزہ کی اقسام:

معجزہ کے خرقِ عادت کے اعتبار سے علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے چار اقسام بیان کی ہیں جس کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ معجزات اور نشانیاں کسی نہ کسی حیثیت سے خارقِ عادت ہوں۔ وہ چاروں اقسام حسبِ ذیل ہیں:

1۔ کبھی نفسِ واقعہ خارقِ عادت ہوتا ہے مثال کے طور پر عصا کا سانپ بن جانا، چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے چشمہ ابلنا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔

2۔ کبھی نفسِ واقعہ خلافِ عادت نہیں ہوتا لیکن اس کا وقتِ خاص پر رونما ہونا خرقِ عادت بن جاتا ہے۔ مثلاً طوفان آنا، آندھی آنا، زلزلہ آنا، کفار کا تعداد کی کثرت کے باوجود بے یار و مددگار اہلِ حق سے خوف کھا جانا وغیرہ تمام تائیداتِ ربانی اسی قسم میں شامل ہیں۔

3۔ ایک صورت یہ ہے کہ نفسِ واقعہ اور ظہور کا وقتِ خاص تو عاداتِ جاریہ کے خلاف نہیں ہوتا لیکن اس کا طریقۂ خلافِ عادت ہوتا ہے۔ جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعاؤں سے پانی کا برسنا، بیماروں کا اچھا ہونا، آفات کا ٹل جانا، کہ نہ تو پانی کا برسنا یا بیمار کا اچھا ہو جانا یا کسی آئی ہوئی آفت کا ٹل جانا خلافِ عادت ہے اور نہ ہی اس کے ظہور کا کوئی خاص وقت ہے مگر جس انداز اور اسباب سے یہ معجزات ظاہر ہوئے وہ خارقِ عادت ہیں۔ استجابتِ دعا اسی قسم میں سے ہے۔

4۔ کبھی نہ تو واقعہ خارقِ عادت ہوتا ہے اور نہ اس کا طریقۂ ظہور خارقِ عادت ہوتا ہے جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کی

پیش گوئیاں، یامثلاً ایک مرتبہ زوردار آندھی چلی تو آپ ﷺ مدینہ طیبہ سے باہر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ آندھی ایک منافق کی موت کے لیے چلی ہے، چنانچہ جیسے ہی لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدینہ میں ایک منافق اس آندھی سے مر گیا۔ اس معجزہ میں نہ تو آندھی کا چلنا خارقِ عادت ہے اور نہ ہی آدی کا آندھی سے مر جانا خلافِ اسباب ہے بلکہ صرف واقعہ کا قبل از وقت علم ہونا خرقِ عادت ہے۔[1]

معجزہ اور سحر کے مابین فرق:

معجزہ سے مراد ایسا خارقِ عادت امر ہے جو اسبابِ طبعیہ سے ہٹ کر خالصتاً مشیتِ ایزدی اور تائیدِ خداوندی سے ظہور میں آئے جبکہ سحر یا جادو سے مراد ایسا عمل ہے کہ جس میں اسبابِ طبعیہ کو مخفی کر دیا جاتا ہے اور لوگ اسبابِ طبعیہ کے مخفی ہونے کو نہ جاننے کے باعث اس کو امر کو معجزہ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ معجزات کا صدور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھوں پر ہوتا ہے جبکہ سحر یا جادو سے جو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں وہ ساحر یا جادوگروں کے اس عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں جو جادوگر شیاطین، جنات اور ارواحِ خبیثہ کو راضی کر کے ان کے اثر سے یہ عوامل منظر عام پر لاتے ہیں۔ عام لوگ اصل سبب سے بے خبر ہونے کے باعث ایسے امور کو معجزہ سمجھتے ہوئے ساحرین اور جادوگروں کی عزت و تکریم کرنے لگتے ہیں۔

سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسبابِ طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے برخلاف معجزہ کے کہ وہ بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور اس میں طبعی اسباب کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نمرود کی آگ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے آگ! ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جا لیکن اتنی ٹھنڈی بھی نہیں کہ جس سے ان کو ایذاء پہنچے بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو۔ چنانچہ اس حکمِ الٰہی کے باعث آگ ٹھنڈی ہو گئی۔[2]

سحر سے جو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں وہ سب اسبابِ طبعیہ کے دائرے کے اندر ہوتی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے بلکہ وہ مخفی ہوتے ہیں تبھی وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہو گیا جبکہ معجزہ میں اس کے برخلاف طبعی اسباب کو بالکل مطلقاً کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ براہ راست قدرت کا کام ہوتا ہے تبھی قرآن کریم میں اس کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔[3]

---

[1] شبلی نعمانی، علامہ، سیرت النبی ﷺ، قرآن محل، کراچی، 3/305-306،، 1947ء
[2] محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 1/220-221، 1990ء
[3] محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، 4/26

چنانچہ سائنسی ترقی کے اس زمانے میں بعض دوائیں ایسی ہیں کہ جن کو انسان جسم پر لگا کر آگ میں کود جائے تو جسم پر اثر نہیں ہو گا لہٰذا وہ داوئیں جب تک ظاہر نہ کی جائیں تو عام لوگوں کے ہاں اسے معجزہ ہی کہا جائے گا مگر چونکہ اس معاملہ میں سبب مخفی ہے، جو لوگوں کے لیے دھوکے کا باعث ہے اور اس کو امرِ خارق عادت سمجھا جاتا ہے جبک یہ معجزہ نہیں ہے۔ معجزہ کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے ہوتا ہے جس میں اس کی رضا و حکم شامل رہتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے معجزات کے لیے واضح اور صریح انداز سے فرمایا ہے کہ یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، جیسے کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ رَمَىٰ﴾[1]

(کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی دراصل وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے)

چنانچہ آپ ﷺ کا ایک مشتِ خاک پھینکنا اور اس مٹی سے کنکریوں کا سارے لشکر کی آنکھوں میں چلے جانا خالصتاً فعلِ خداوندی ہے، جس میں آپ ﷺ کا کوئی دخل نہیں ہے اور یہی معجزہ ہے۔ معجزہ اور سحر کی حقیقتوں میں باہمی واضح فرق ہے۔ معجزہ اللہ رب العزت کا فعل ہے جو اس کی رضا اور حکم سے نبی یا پیغمبر سے صادر ہوتا ہے اور طبعی اسباب اس میں مکمل بے اثر ہوتے ہیں جبکہ سحر وہ عمل ہے کہ جس میں لوگوں سے طبعی اسباب کو چھپالیا جاتا ہے یوں سحر اور معجزہ کے مابین انسان اپنی عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جو واضح فرق ظاہر کیا ہے اس کو جانچ پرکھ کر سکتا ہے۔

پہلی بات یہاں یہ ہے کہ معجزہ یا کرامت کا ظہور ایسے لوگوں سے ہوتا ہے کہ جن کا تقویٰ، طہارت و پاکیزگی اور اخلاق و اعمال سب کے مشاہدے میں ہوں جبکہ اس کے برخلاف جادو کا اثر ایسے لوگوں سے صرف ظاہر ہوتا ہے جو ناپاک و گندے ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا نام و عبادت سے بہت دور رہتے ہیں جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ عادتِ خداوندی بھی یہ جاری ہے کہ جو شخص معجزہ کا دعویٰ کر کے کوئی دعویٰ کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا ہاں معجزے کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات اسی انداز میں ظاہر فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ سحر کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں اور جس قدر گندگی و ناپاکی ہو اتنا ہی ان کا سحر کامیاب رہتا ہے جب کہ اس کے برخلاف انبیاء کرام علیہم السلام طہارت و نظافت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں اور ایک فرق یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ نبوت

---

[1] الانفال:17

کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں سحر سے مراد وہ کام یا فعل ہے کہ جس میں کفر و شرک اور فسق و فجور کے اعمال اختیار کر کے جنات اور شیاطین کو اعمالِ خبیثہ کے لیے راضی کیا گیا ہو اور ان کی مدد سے عجیب و غریب واقعات ظہور پذیر کیے گئے ہوں۔ شیاطین پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کرنے اور ان کی مخالفت کے احکامات صادر فرماتے ہیں قرآن و حدیث ان کے ثبوت پر مبنی ہیں۔

لہٰذا حکمِ خداوندی کے بر خلاف شیاطین کو راضی کرنا سراسر کفر و شرک ہے۔ جبکہ مزید ان سے ایسے کام لینا کہ جن سے مخلوقِ خدا کو نقصان پہنچے یا مخلوقِ خدا بھٹک جائے سراسر گناہِ کبیرہ ہے۔ قرآن کریم نے ایسے سحر کو تبھی کفر قرار دیا ہے۔ کیونکہ اولاً تو جادو خود ہی ایک حرام فعل ہے اور ثانیاً جب وہ کسی پیغمبر کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا جائے تو بلاشبہ کفر ہے۔[1]

مثال کے طور پر جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جادوگروں نے کہا:

﴿قَالُواْ يَٰمُوسَىٰٓ إِمَّآ أَن تُلۡقِيَ وَإِمَّآ أَن نَّكُونَ نَحۡنُ ٱلۡمُلۡقِينَ﴾[2]

(انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ! یا تو آپ ڈالیں اور یا ہم ڈالتے ہیں)

جادوگر اپنے فن پر بھروسہ رکھتے ہوئے نہایت مطمئن تھے مگر موسیٰ علیہ السلام کو اپنے معجزے پر ان سے کہیں زیادہ اطمینان تھا اس لیے آپ نے فرمایا: (أَلۡقُواْ) (یعنی پہلے آپ ڈالیں)

﴿فَلَمَّآ أَلۡقَوۡاْ سَحَرُوٓاْ أَعۡيُنَ ٱلنَّاسِ وَٱسۡتَرۡهَبُوهُمۡ وَجَآءُو بِسِحۡرٍ عَظِيمٍ﴾[3]

(یعنی جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان پر رعب طاری ہو گیا اور انہوں نے بڑا جادو دکھلایا)

معلوم ہوا کہ سحر یا جادو ایک لحاظ سے دھوکہ اور نظر بندی ہے۔ جس سے لوگ نگاہوں کے فریب سے مغلوب ہو جاتے ہیں مگر جادوگروں کا یہ فعل وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ سحر کی کئی قسمیں ہیں مثلاً مسمریزم کہ جس میں انسانی خیالات اور نگاہ مغلوب کر دی جاتی ہے یا ہاتھ کی چالاکی جس کے ذریعے لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

سحر کی مختلف اقسام میں کہیں تو صرف ہاتھوں کی چالاکی سے دیکھنے والوں کو مغالطہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، کہیں صرف تخیل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم وغیرہ اور کہیں قلبِ ماہیت بھی ہو جاتا ہے کہ انسان کا دل پتھر بن

---

[1] محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 4/25،26

[2] الاعراف:115

[3] ایضاً:116

جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ سحر، جادو یا شعبدہ سے جو اشیاء ظاہر ہوتی ہیں وہ صرف فریبِ نظر ہوتی ہیں جبکہ معجزہ سے جو بڑے بڑے عجائبات رونما ہوتے ہیں جیسے طوفانِ نوح کا آنا، چاند کا شق ہو کر دو ٹکڑے ہونا اور ہر مقام پر یہ معجزہ دکھائی دینا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن ساحروں کے سانپوں کو کھا جانا وغیرہ سحر یا جادو کے زور سے ایسا کچھ ہونا ناممکن ہے۔

معجزہ دراصل سحر سے ظاہر ہونے والے واقعات کا توڑ ہے جبکہ ساحروں کا سحر معجزہ کے آگے عاجز اور بے بس ہے۔ علماء کے ہاں معجزہ اور سحر میں واضح فرق یہ ہے کہ معجزہ سے عوام الناس خیر کی طرف راغب ہوتے ہیں اور یہ نیکیوں کے پھیلانے کا سبب بنتا ہے جبکہ سحر سے شر پھیلتا ہے۔

معجزہ اور دیگر عجائباتِ امور میں دو عظیم الشان فرق پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ معجزہ براہ راست فعلِ خداوندی ہوتا ہے اور دوسرا عجائبِ امور، اسبابِ طبعی اور نفسی کے نتائج ہوتے ہیں جبکہ دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعدائے دعوتِ الٰہی کی ہلاکت یا مبلغِ رسالت کی تائید اور مؤمنین صادقین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے اور اس سے کھیل تماشہ، شعبدہ بازی یا بازی گری مقصود نہیں ہوتی۔

سب سے آخری بات جو ان دونوں کے مابین حدِ فاصل بن جاتی ہے وہ یہ کہ ساحر و بازی گری فقط کرتب، تماشے اور عجائب دکھاتے ہیں اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی، ارادوں کی بے گناہی، دلوں کی طہارت وصفائی، شریعتِ الٰہی کی تبلیغ، تزکیۂ قلوب اور سیہ کاریوں کے رفع کرنے کے نہ تو مدعی ہوتے ہیں اور نہ یہ خواص اور کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں مگر انبیاء کرام علیہم السلام کی معصوم زندگی، پاکیزہ اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص وکیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں، قدم قدم پر اللہ ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے ان کی صدائے حق، جماعتوں، قوموں اور ممالک میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔

ان کی سچائی راست اور صداقت پر ان کی سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے۔ وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص وایثار اور صدق ووفا کی مہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مؤمن، بدکار کو عفیف، بے باک کو متقی، بخیل کو فیاض، سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا وہ لوہے کو زرِ خالص کی صورت میں بدل سکتا ہے مگر کسی زنگ آلود دل کو جِلا نہیں دے سکتا۔[2]

---

[1] محمد شفیع، معارف القرآن، 4/31

[2] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، 3/114، 113

معجزات سے متعلق مسلم حکماء کا کلامی استنباط:

معجزات کے حوالے سے حکماء اسلام اور علماء و محققین حضرات کے نظریات ذیل میں تفصیلا پیش کیے جاتے ہیں۔

امام غزالی اور معجزات نبوی:

امام غزالی ابو حامد محمد بن محمد الطوسی الشافعی رحمہ اللہ (450ھ / 1058ء) طوس میں پیدا ہوئے اور نیشاپور اور طوس میں تعلیم حاصل کی۔ امام الحرمین کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور ان کی وفات 478 ہجری تک ان کے پاس مقیم رہے۔ تصوف کی طرف ان کا رجحان بہت زیادہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دینی اور فقہی باریکیوں پر انتہائی دقیق نظر رکھتے تھے۔ آپ ایک بلند پایا عالم و مبلغ تھے اور طوس میں 14 جمادی الآخر 505 ھجری / 19 دسمبر سن 1111ء کو ان کی وفات ہوئی۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب المنقذ من الضلال میں نبوت کے استدلال پر مستقل عنوان قائم کر کے نبوت کی حقیقت کو واضح کر کے فرمایا ہے کہ نبی علیہ السلام کی نبوت پر ایمان کے لیے معجزہ کو دلیل نہ بناؤ بلکہ جو بھی دعوی نبوت کرتا ہے اس کی صداقت، حقانیت، دیانت کردار و عمل اور ارشادات و ہدایات کے حوالے سے دل سے یقین کرو۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں: (فمن هذا الطريق اطلب اليقين بالنبوة لا من قلب العصا ثعبانا، و شق القمر)[1](پس اس انداز سے نبوت پر یقین لاؤ نہ کہ اس سے کہ لاٹھی اژدھا بن گئی یا چاند پھٹ گیا)

گویا امام غزالی کے ہاں معجزہ نبوت کی دلیل نہیں چنانچہ وہ اپنی مذکورہ بالا کتاب میں نبوت کی حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: (بل الإيمان بالنبوة أن يقر بإثبات طور وراء العقل تنفتح فيه عين يدرك بها مدركات خاصة و العقل معزول عنها كعزل السمع عن إدراك اللون۔۔۔الخ)[2]

> (یعنی نبوت کے تسلیم کرنے کہ یہ معنی ہیں کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ایک درجہ ہے جو عقل سے بالاتر ہے اور جس میں وہ آنکھ کھل جاتی ہے جس سے وہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں کہ عقل جن سے محروم ہے جیسے سامع رنگ کے ادراک سے مکمل معذور ہے)

---

[1] الغزالی، ابو حامد، المنقذ من الضلال، اللجنۃ الردولیۃ، بیروت، 1/44، 1959ء

[2] ایضاً، 1/31

چنانچہ امام صاحب کے ہاں نبوت کامل اور حقیقی یقین جس کے لیے وہ اذعان کا لفظ استعمال کرتے ہیں صرف ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو نفوس قدسیہ رکھتے ہیں اور جنہوں نے ریاضات و مکاشفات اور مشاہدات سے یہ کامل درجہ پایا ہے۔ امام غزالی کے ہاں کسی شخص سے معجزات کا صدور اس کے نبی صادق ہونے کی دلیل و ثبوت نہیں ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ان کی کتاب احیاء العلوم سے ملاحظہ ہوں:

و كيف ينكر تفاوة العزيزة و لولاه لما اختلفت الناس في فهم العلوم و لما إنقسموا إلى بليد لايفهم بالتفهيم إلا بعد تعب طويل من المعلم و إلى ذكي يفهم بأدنى رمز و إشارة و إلى كامل ينبعث من نفسه حقائق الأمور دون التعلم كما قال تعالى: "يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌۚ نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍۚ " و ذلك مثل الأنبياء عليهم السلام اذ يتضح في بواطنهم امور غامضة من غير تعلم و سماع و يعبر ذلك بالإلهام و عن مثله عبر النبي ﷺ حيث قال ان روح القدس نفث في روعي----الخ[1]

(اور اگر اس میں تفاوت نہ ہوتا تو علوم کو سمجھنے میں لوگ متفاوت کیوں ہوتے اور ایسے کیوں ہوتے کہ کوئی توکم ذہین ہوکر بہت سا سمجھانے اور استاد کا مغز مارنے سے سمجھے اور کوئی ذہین ہو کر ادنی رمزواشارے میں سمجھ جائے اور کوئی ایسا کامل ہو کہ خود اس کے نفس سے امور کے حقائق جوش مارتے ہوں سیکھنے کی نوبت نہ پہنچے۔ جیسے باری تعالی نے فرمایا ہے کہ

{ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌۚ نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍۚ}

اور یہ لوگ کامل انبیاء ہیں کہ ان کو وہ باریک باتیں خود ان کے دلوں میں بغیر سیکھے اور سنے حاصل ہو جاتی ہیں اس کو الہام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس جیسی بات کو حضور ﷺ نے اپنے ارشاد میں فرمایا ہے کہ روح القدس نے میرے دل میں ڈال دیا)

امام غزالی رحمہ اللہ نبوت کے خواص اور آثار کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مدعی نبوت کے دعوے پر یقین کے لیے خوارق عادت امور اور معجزات ہی فقط دلیل نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں نبوت

---

[1] الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، احیاء العلوم الدین، مکتبہ مطبعۃ مصطفی، مصر، 1/94،93، 1356ھ

کے کچھ آثار وخواص ہیں چنانچہ اگر کسی شخص کی نسبت پر شبہ ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں؟ تو اس کا علم فقط اس کے احوال کی معرفت سے ہو سکتا ہے یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے جیسے صحابہ کرام کو حاصل تھی، یا خبر متواتر سے اور سن کر ہو جیسی اب عام لوگوں کو ہے۔

نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی جس کے اندر ہوتی ہے وہ تصدیق پر آمادہ ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی کو طب اور فقہ سے کچھ شناسائی ہو اور ان کا ذوق ہو تو جو شخص فقیہہ یا طبیب ہونے کا دعوی کرے اس کے حالات دیکھ اور سن کر فورا یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص طبیب یا فقیہہ ہے یا نہیں؟ اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ آج امام شافعی رحمہ اللہ اور جالینوس کا وجود نہیں ہے مگر ان کے حالات زندگی اور تصنیفات پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کامل فقیہہ اور جالینوس مستند طبیب تھے یا نہیں؟ ایسے ہی آنحضرت ﷺ گو کہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر آپ ﷺ کی شریعت و تعلیمات اور ارشادات کی موجودگی میں ہر شخص آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے۔

چنانچہ کسی بھی مدعی نبوت کے دعوے پر یقین کرنے کے لیے یہی معیار ہونا چاہیے نہ کہ لاٹھی کا سانپ اور قمر کا شق ہونا۔ اس لیے کہ اگر ان خوارق عادت امور پر نگاہ ڈالی جائے اور دوسرے کئی بے شمار قرائن اور شہادتوں سے ان کو نہ ملایا جائے تو عین ممکن ہے کہ یہ خطرہ پیدا ہو کہ یہ جادوگری اور نظر بندی ہے۔[1]

اسی طرح امام غزالی رحمہ اللہ پیغمبر کی تصدیق اور مدارج کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ معجزات کے مسئلے پر غور کیے بغیر اور معجزہ کی شرائط و حقیقت کو بغیر جانے یہ تصدیق ناممکن ہے چنانچہ ان کے ہاں معجزات اور مغیبات پر یقین جازم کے چھ مختلف درجات ہیں جو مختلف طریقوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا درجہ ایسے یقین کا ہے کہ جو ایسے دلائل سے انسان کو حاصل ہو کہ جن میں برہان کی تمام منطقیانہ شرائط ایک ایک کر کے پائی جائیں اور ان دلائل کے مقدمات کا ایک ایک حرف اچھی طرح جانچ لیا گیا ہو حتی کہ کسی میں شک وشبہ اور غلطی والتباس کا شائبہ نہ ہو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان مسلمات سے ایسا یقین کامل حاصل ہو جس کو عموما لوگ مانتے ہیں اور اہل عقل کے ہاں وہ مقبول و معروف ہوں اور ان میں شک کا اظہار معیوب سمجھا جائے اور نفوس انسانی ان کے انکار سے فرار نہ کر سکیں۔ ایسے مقدمات سے استدلال بعض لوگوں میں ایسا راسخ یقین پیدا کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا تزلزل نہیں ہو

---

[1] الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، المنقذ من الضلال، 1 / 43

سکتا۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ ان خطابیات کے ذریعے یقین پیدا کیا جائے جن کو لوگ عمومی بول چال اور عملی کاروبار میں استعمال کرتے ہیں اور عادتاً ان کو درست سمجھتے ہیں اگر انسانی طبیعت میں خصوصاً اس مسئلے کی جانب غیر معمولی انکار یا تعصب نہ ہو اور سننے والے میں تشکیک؛ مناظرہ اور خواہ مخواہ کریدنے اور حجت بازی کرنے کی عادت نہ ہو اور اس کی جانب فطرت صالحہ سادہ اور صاف ہو تو اس طریقے سے اکثر افراد کو یقین کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے تبھی قرآن کریم نے اسی طرز سے استدلال کیا ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ جس شخص کی دیانت و امانت پر یقین و اعتماد ہو اور لوگوں کی کثرت اس کی مداح ہو یا تجربے کی بنیاد پر اس کی ہر بات درست باور ہوتی ہو تو اس کا کہنا انسان میں یقین اور جزم پیدا کر دیتا ہے جیسے انسان اپنے بزرگوں؛ اساتذہ اور مرشدین کی بات پر حرف بہ حرف یقین کرتا ہے چنانچہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا دیگر صحابہ کرامؓ کا حضور ﷺ کے ساتھ جو حسن اعتقاد تھا وہ اسی نوعیت کا تھا اس لیے آپ ﷺ جو کچھ فرماتے تھے ان کو اس کے باور کرنے میں کسی دلیل و ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔

یقین کے حصول کا پانچواں درجہ یہ ہے کہ روایت کی صورتحال کی دوسرے کئی ایسے قرائن سے تصدیق ہو جن سے کسی مناظر یا بحث و حجت کرنے والے افراد کی تو نہیں مگر عمومی لوگوں کی تسلی ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کتنے اعرابی تھے جنہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک کی جانب دیکھا اور آپ ﷺ کی دلآویز باتوں کو سنا یا آپ ﷺ کے اخلاق کریمہ کا مشاہدہ کیا اور بغیر دلیل اور برہان آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے اس لیے کہ انہوں نے پہلے آپ ﷺ کی نبوت کا شہرہ تو سنا تھا مگر اس دعوی کی صداقت نے ان کے دل میں مکمل طور پر گھر نہیں کیا تھا لیکن جب اتفاق سے آپ ﷺ کے دیدار کا ان کو موقع ملا اور قرائن و شواہد اور آثار قیافہ کے ذریعے نیک و بد اور اچھے برے کی تمیز کا جو ایک خاص جوہر انسان کو ودیعت کیا گیا ہے بندہ یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ دعوی صحیح ہے یا غلط؟۔

جبکہ چھٹا درجہ یہ ہے کہ جو روایت بیان کی جا رہی ہے اگر وہ سامع کے مزاج و اخلاق اور خواہش کے مطابق ہو تو اس کو صحیح تسلیم کرنے میں اسے کبھی کوئی پس و پیش نہیں ہو گا اس یقین کے پانے میں نہ تو حسنِ اعتقاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی آثار و قرائن کی تائید کی بلکہ یہ فطری اور طبعی مناسبت خود یقین کے حصول کے لیے کافی ہے یہی وجہ ہے کہ سابقین اسلام میں وہی صحابہ کرام داخل ہیں جو طبعی و فطری طور پر نیک اور راست باز تھے۔

چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ کہ ہاں لوگوں میں انہی طریقوں سے یقین کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی طریقے معجزات

اور غیبیات پر یقین و اذعان پیدا کرتے ہیں۔[1] امام غزالی رحمہ اللہ معجزات کا ذکر کرتے ہوئے ان کو تین اقسام میں شمار کرتے ہیں جو یہ ہیں:

1۔ حسی معجزات 2۔ عقلی معجزات 3۔ خیالی معجزات

1۔ حسی معجزات کے معنی یہ ہیں کہ دراصل یہ واقعات اسی طرح وقوع پذیر ہوئے جس کے امکان پر چند دلائل ہیں۔

الف۔ جو رب نطفے سے انسان اور مادے سے جاندار کو پیدا کرتا ہے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ سنگریزے میں جان ڈال دے اور حیوان کو قوت گویائی دے۔

ب۔ اجسام سارے متماثل ہیں لہذا ایک جسم میں پائی جانے والی تمام باتیں سب اجسام میں پائی جاتی ہیں اگرچہ بالفعل نہ پائی جاتی ہوں۔

ج۔ سورج ایک مدت میں کسی چیز کو گرم کر سکتا ہے آگ جب کہ فوراً کر سکتی ہے لہذا ممکن ہے کہ جو امور تدریجا وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ پیغمبر کی تاثیر سے فوراً وقوع پذیر ہوں۔[2]

2۔ عقلی معجزات: اس کی تفسیر امام غزالی رحمہ اللہ یوں کرتے ہیں:

(القسم الثاني العقلي و هو قول الله :

"وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ"

و هو شهادة كل مخلوق و محدث على خالقه و موجده كشهادة البناء على الباني و الكناية على الكاتب و يقال لذلك لسان الحال و المتكلمون يقولون هذه دلالة الدليل على المدلول او الحمقى من الناس لايعرفون هذه الرتبة لايقرون بها) [3]

(دوسری قسم عقلی ہے جیسا کہ اللہ تعالی کے اس قول میں ہے کہ تمام چیزیں اللہ کی تسبیح پڑھتی ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر مخلوقات اور محدثات ہیں وہ سب اپنے خالق و موجد کے شاہد ہیں جیسے تعمیر کسی بنانے والی کے لیے اور تحریر کسی لکھنے والے کے لیے گواہی دیتی ہے اسی کا نام زبان حال ہے اور متکلمین اسے دلالۃ الدلیل علی المدلول کہتے ہیں مگر حمقاء اس حالت کا اعتراف نہیں کرتے)

---

[1] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، قرآن محل، کراچی، 3/123-124، 1342ھ

[2] الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، الغزالی، مدینہ پبلیشنگ کراچی، 1/152-153، 1901ء

[3] ایضا، 1/154-155

3۔خیالی معجزات: خیالی کا مطلب یہ ہے کہ زبان حال، تمثیلاً محسوس انداز میں نظر آئے امام غزالی کے ہاں اس کی تفصیل یہ ہے کہ زبان حال بطور تمثیل محسوس اور مشاہدہ ہو جاتی ہے اور یہ انبیاء اور پیغمبروں کا خاصہ ہے۔عام لوگوں کے لیے خواب میں جیسے یہ حالی کیفیت محسوس صورت پکڑ لیتی ہے اور آوازیں سنائی دیتی ہیں مثلا آدمی خواب میں دیکھے کہ ایک اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس سے خطاب کر رہا ہے یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے کچھ چھینتا ہے یا اسی کی انگلی چاند یا سورج بن گئی ہے وغیرہ۔

اسی طرح انبیاء کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور یہ چیزیں حالت بیداری میں ان سے مخاطب ہوتی ہیں۔جاگنے والے شخص کو اس حالت میں فرق معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ گویائی خیالی ہے یا حسی ہے سونے والے کو ان دونوں میں جو فرق معلوم ہو سکتا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ جاگ اٹھتا ہے سونے جاگنے کی حالت میں اس کو فرق معلوم ہوتا ہے جس کو ولایت تامہ حاصل ہو جاتی ہے اس کی ولایت کی شعائیں حاضرین پر بھی پڑتی ہیں یہاں تک کہ ان کو وہ اشیاء بھی نظر آتی ہیں اور وہ آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جو صاحب ولایت کو دکھائی دیتی ہیں اور سنائی دیتی ہیں۔

معجزات کی تینوں اقسام میں سے تمثیل خیالی (جو ابھی ذکر ہوئی ہے) زیادہ معروف ہے مگر تینوں اقسام پر ایمان لانا واجب ہے۔[1]

چنانچہ قرآن کریم کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتے ہوئے امام غزالی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ کلامِ منظوم آنحضرت ﷺ کا ایسا معجزہ ہے جو آپ ﷺ کی نبوت پر قوی دلالت کرتا ہے۔ قرآن کریم سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علمی لحاظ سے قوی اور کامل ہے اور قرآنی علم سے ایسا ہی پختہ یقین حاصل ہوتا ہے جیسا کہ خبرِ متواتر سے حاصل ہوتا ہے۔

قرآن ایسا منظوم کلام ہے کہ جس سے قوی اور کامل ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام سے صادر ہونے والے لاتعداد معجزات دیکھنے کے باوجود منکرین کی جانب سے ان کی نبوت پر ایمان نہ لانے کا سبب بیان کرتے ہوئے امام غزالی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لاتعداد خوارقِ عادت واقعات اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام سے صادر فرمائے ہیں جن کے کرنے پر اب تک مخلوق قاصر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اذن سے مردوں کا زندہ کرنا، برص کے مریضوں کا اچھا کر دینا، سمندر میں خشکی کا راستہ بنانا وغیرہ ان کثیر معجزات کو دیکھنے کے باوجود کفار اور منکرین کا انکار نبوت نفسانی وسائس کے سبب ہے جو انہیں اپنے آباو اجداد سے وراثت میں ملا ہے تبھی وہ کہتے ہیں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ اے نبی! یہ آپ کی تکذیب نہیں کر رہے بلکہ یہ اللہ کی نشانیوں کی

---

[1] الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، الغزالی، 1/154

تکذیب کر رہے ہیں اور ان کے نفس میں جو راسخ کفر ہے جو کہ ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملا ہے اس کے سبب یہ کھلی اور واضح نشانیوں کو دیکھ کر بھی ایمان لانے سے قاصر ہیں۔[1]

مولانا جلال الدین رومی اور معجزات:

مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ (1207ء تا 1273ء) جو عظیم صوفی اور مفکر ہیں اور نہایت ہی عرفان و بصیرت والی شخصیت ہیں۔ معجزات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ معجزات ایمان کا سبب نہیں ہوتے بلکہ معجزات دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ لہٰذا معجزہ دشمن کو عاجز تو ضرور کرتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ ایمان بھی لے کر آئے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

(موجب ایمان نباشد معجزات — بوی جنسیت کند جذبِ صفات
معجزات از بہر قہر دشمن است — بوی جنسیت بسنے دل بردن است
قہر گرد دشمن اقا دوست نے — دوست کے گرد د بہ بشہ گردنے)[2]

(ایمان لانے کے لیے معجزے مؤثرِ قریب نہیں ہیں بلکہ ایمان لانے والا اگر نبی کا ہم جنس ہے تو وہ نبی کی صفات کو جذب کرتا ہے تو ایمان کا قریبی سبب جنس کی بُو ہے۔ نبی کے معجزوں سے صرف دشمن عاجز ہو جاتا ہے مگر اس کا ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ جو مغلوب اور عاجز ہو اس کے قلب میں دوستی پیدا نہیں ہوا کرتی)

اسی طرح مولانا رومی رحمہ اللہ کے ہاں معجزات کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا اثر چھپا ہوتا ہے اور جیسے قیامت مردوں کو زندہ کر دیتی ہے ایسے ہی معجزات میں چھپی اثر انگیزی مردہ باطن کو زندگی بخشتی ہے اور مردہ قلوب معجزات کی اثر انگیزی سے سستی سے نکل کر راہِ ہدایت پر آجاتے ہیں۔

اسی طرح رسول اور اولیاء کی برکت سے معجزے اور کرامات کا اثر دل پر ہوتا ہے چونکہ ان کے باطن میں قیامت چھپی ہوئی ہے او قیامت مردوں کو زندہ کر دیتی ہے اس لیے ان کا باطن مردہ دلوں کو زندگی بخش دیتا ہے، جس کا اثر یہ ہے کہ ہمسایہ مست ہو جاتا ہے، چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں کہ معجزہ کا مقصد مخالفینِ حق کو عاجز اور ذلیل کرنا ہے، معجزہ جب بے جان اشیاء کو بھی اپنا اثر دکھاتا ہے تو مخالفین کے دل بھی اس کے اثر سے متاثر ہوتے ہیں مگر معجزہ براہِ راست دلوں پر اثر انداز

---

[1] الغزالی، ابو حامد، محمد بن محمد، الغزالی، 1/37
[2] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، مطبع مجید، کانپور، 1216ھ، 6/32

ہو تو اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔[1]

مولانا روم مزید کہتے ہیں کہ معجزہ کا مقصد اگر معاندین کو خاموش اور رسوا کرنے کے علاوہ ان کو متاثر کرنا ہوتا تو اس مقصد کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی کہ عصا کو سانپ بنا دیا جائے اور چاند کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے اور یوں اس کے ذریعے دلوں کو متاثر کیا جائے۔ ان جمادات و نباتات پر تصرف کر کے دلوں میں تصرف کرنے سے زیادہ صاف اور صحیح راستہ یہ تھا براہِ راست خود قلوب میں تصرف کیا جائے کہ وہ صدائے نبوت سنتے ہی ساتھ ہی لبیک کہنے پر مجبور ہو جائیں۔

معاندین و مخالفین کا معجزہ طلبِ فرقہ جو انبیاء کرام علیہم السلام سے جمادات و نباتات پر ان کے اثرات کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کے ذریعے سے ایمان قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے خود ان کی یہ طلب ان کے ضمیر کی پستی اور قلب کی سیاہی کی دلیل ہے جن کے آئینہ دل پاک و صاف ہوتے ہیں وہ بلاواسطہ جمادات و نباتات پیغمبر سے خود اس اثر کو قبول کرتے ہیں اور علاوہ ازیں ہر شخص معجزے سے ہدایت ہی پاتا بلکہ اس کے لیے بھی صلاحیت کی ضرورت ہے۔[2]

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام سے صادر ہونے والے امور اور معجزات کے اندر جو اسباب کار فرما ہوتے ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے علیہم السلام ہیں:

(و آں سببھا کا بنیارار ھبر ست　　آں سببھا زیں سببھا بر تر است
ایں سبب را محرم آمد عقلِ ما　　و اُں سببھا راست محرم انبیاء کرام)[3]

(جو اسباب کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے امور میں پیش پیش ہوتے ہیں وہ ان ظاہری و دنیاوی اسباب سے بلند تر اور برتر ہیں۔ ان اظاہری اسباب و علل کی محرم تو ہماری انسانی عقول ہیں مگر ان حقیقی اسباب کے محرم انبیاء کرام علیہم السلام ہیں)

اسی طرح وہ اسباب قدیمہ جو انبیاء کرام علیہم السلام کے پیشِ نظر ہیں وہ ان اسباب حادثہ سے اعلیٰ ہیں۔ اس سبب (یعنی حادث) سے تو ہم عمومی لوگوں کی عقل بھی واقف ہے اور ان اسبابِ قدیمہ سے صرف انبیاء کرام علیہم السلام واقفیت رکھتے ہیں۔ یعنی کہ عوام کی نگاہ چونکہ محسوسات اور مدرکات ظاہریہ تک محدود ہوتی ہے اس لیے ان کا علم

---

[1] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، 6/35
[2] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، 3/131
[3] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، 1/25

اسبابِ زیریں سے آگے تجاوز نہیں کر سکتا۔

جبکہ اس کے بر خلاف انبیاء کرام علیہم السلام کی بصیرت اسباب و علل کے سارے سلسلے تک پہنچتی ہے جس کی وجہ سے ان کا علم ان تمام اسباب عالیہ و قدیمہ پر بھی برتر ہوتا ہے کہ جن سے عوامی نگاہیں اوجھل ہوتی ہیں جیسے مثال کے طور پر عوام سمجھتے ہیں کہ ماہ و مہر کی گردش کا سبب فلک کی گردش ہے لیکن انبیاء کرام علیہم السلام جانتے ہیں کہ دراصل اس گردش کا باعث اصلا کون سی ذات ہے؟[1]

چنانچہ مولانا روم کے ہاں عام انسان چونکہ ظاہری طور پر اسباب و علل میں الجھ کر اصل مسبب الاسباب اور اصل حقیقی علت کو بھول جاتا ہے اور قادرِ مطلق جو ان تمام اسباب کے پیدا کرنے پر قادر ہے اس ذات کو بھول جاتے ہیں چنانچہ وہ ذاتِ حقیقی انبیاء کرام سے اس غفلت کو ختم کروا کر ان سے ایسے امور صادر کرواتی ہے کہ جن کو معجزات کہا جاتا ہے اور اسی طرح ظاہری اسباب و علل ان کے لیے بیکار کر دیئے جاتے ہیں۔

اسی طرح معجزہ اور سحر کے فرق کے حوالے سے مولانا روم فرماتے ہیں:

(سحر را با معجزہ کردہ قیاس　　ہر دو را ہر مکر پندارد اساس

زر قلب و زر نیکو ور عسار　　بے محک ہر گز نہ دانی اعتبار

ہر کرا در جان خدا بنھد محک　　ہر یقین را باز دا الدادز شک)[2]

(اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا　　اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے)

تم کھوٹے اور کھرے سونے کو　　کسوٹی کے بغیر فرق نہیں کر سکتے

(خدا نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہے　　وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے)

معجزہ اور سحر دونوں خوارق عادت ہیں مگر معجزہ منجانب اللہ ایک فعل ہے جو پیغمبر سے اس کی نبوت کے ثبوت کے لئے وقوع پاتا ہے جب کہ سحر شیطانی تصرفات میں سے ہے جو کسی کافر کے ہاتھوں سرزد ہوتا ہے دونوں میں وجہ تمیز یہ ہے کہ معجزہ کا اثر عالم سفلی و علوی اور اجسام عنصری و سماوی پر یکساں ہو سکتا ہے اس کا سحر ایک امر واقعی اور پائیدار ہوتا ہے جبکہ اس کے بر خلاف سحر کا اثر عالم سفلی پر محدود اور وہ بھی محض فریب نظر یا ایک کیفیت عارضی بہ تبدیل ہیت ظاہری ہوتی ہے۔ ظاہر پرست جیسے سحر کو فریب اور مکاری سمجھتا ہے تو معجزے کو بھی خارق عادت ہونے کے باعث اس سے مشابہ پا کر ایسی سمجھنے لگتا ہے چنانچہ ہر پیغمبر جو معجزہ ظاہر کرتا تھا تو کفار اسے جادوگر کا لقب

---

[1] نقشبندی، محمد نذیر، مفتاح العلوم شرح مثنوی، مولانا رومؒ، شیخ علی اینڈ سنز، لاہور 1954ء، 1/316

[2] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، 1/11

دیتے تھے جیسے حضرت موسیٰؑ کے لیے فرعون نے کہا تھا:

﴿إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ﴾[1]

(بے شک کی کوئی بڑا ماہر جادو گر ہے)

اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں منکرین کہتے تھے:

﴿هَٰذَا سَٰحِرٌ كَذَّابٌ﴾[2]

(یہ جادو گر بڑا جھوٹا ہے)

یعنی جیسے کھرے کوٹے کی پہچان کے لیے کسوٹی کی ضرورت ہوتی ہے ایسی ہی بھلے اور برے اخلاق کی تمیز کے لئے نور بصیرت چاہیے اور یہ نور بصیرت وہ قوت ممیزہ ہے جو شریعت کی کامل اتباع سے مومنین کے قلوب میں پیدا ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سے مومنین نیکی اور برائی میں تمیز کر سکتا ہے۔[3]

اسی طرح ساحر یا جادو گر محض ایک تماشا گر ہوتا ہے اور اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس قوت سے تزکیہ نفوس، تطہیر اخلاق اور اصلاح عالم کا کام لے سکے۔ تبھی آج تک کسی ساحر اور شعبدہ باز نے اصلاح عالم کا فرض ادا نہیں کیا مگر پیغمبر اپنے معجزانہ کارناموں کی بدولت دنیا کو الٹ دیتا ہے اور بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل و ریحان سے اس خاکدانِ عالم کو سجا دیتا ہے۔ اس طرح مولانا روم معجزہ اور سحر کے فرق کے حوالے سے مزید کہتے ہیں:

(بانگ طشت سحر جز لعنت نمائد　　بانگ طشت دین بجز رفعت نمائد)[4]

(یعنی جادو کے طشت کی آواز سوائے لعنت کے نہیں رہی جبکہ دین کے طشت کی آواز بجز رفعت کے نہیں رہی)

یعنی دونوں مشہور ہوئے اور جادو کی شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر اور زیادہ لعنت ہوئی جبکہ معجزہ موسوی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک دین کی رفعت ہو رہی ہے۔

چنانچہ سحر اور معجزہ دونوں اگرچہ شہرت کے لحاظ سے عمومی طور پر معروف ہوئے مگر سحر کی شہرت سے ساحروں کی رسوائی عام ہوتی ہے جبکہ معجزہ کی شہرت دوام سے اللہ کے دین کی رفعت اور سربلندی ہوتی ہے۔ اسی طرح معجزات کے حوالے سے عقلی دلائل بیان کرتے ہوئے مولانا موصوف کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اور موسی

---

[1] یونس:76

[2] ص:4

[3] نقشبندی، محمد نذیر، مفتاح العلوم شرح مثنوی، مولانا رومؒ، شیخ علی اینڈ سنز، لاہور 1954ء، 1/194، 193

[4] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، 4/43

علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھ کر عصا کیسے سانپ بن گیا اور ستون کیسے باشعور بن گیا۔

عصا کا سانپ بن جانا اور ستون کا ناز کرنا اہل دین کے لئے با آواز بلند و بتکرار حق کا اثبات کر رہے ہیں (جو اہل دین کے لئے قبول شدہ ہے) اگر یہ دین حق کا ذوق غیر مدرک بالعقل نہ ہوتا (بلکہ عقلی ادراک اس کے لئے کافی ہوتا) تو اس قدر معجزات جو کہ انبیاء کرام کو عطا ہوئے ہیں کی ضرورت ہی کب ہوتی کیونکہ جو امر مدرک بالعقل ہوتا ہے اسے تو عقل بلا بیان معجزہ و بلا تردد قبول ہی کر لیتی ہے پھر اثبات نبوت و وجوب اتباع انبیاء کیا ضروری تھا پس اس کثرت سے معجزات کا دیئے جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسرار دین لازماً غیر مدرک بالعقل ہیں۔[1]

امام فخر الدین رازی اور معجزات:

امام فخر الدین رازی (متوفی۔606ھ) مفسر قرآن، عالم دین، نامور طبیب اور مسلمان فلسفی کے طور پر معروف ہیں اور ان کی ایک بڑی کاوش شریعت اسلامیہ فلسفہ میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش تھی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ معجزہ اور نبوت کی اس دلائل کے حوالے سے امام رازی فرماتے ہیں:

إعلم أان القائلين بالنبوات فريقين: احدهما: الذين يقولون: إن ظهور المعجزات على يده يدل على صدقه لم أنا نستدل بقوله على تحقيق الحق و إبطال الباطل؟ و هذا القول هو الطريق الأول، وعليه عامة أرباب الملل و النحل والقول الثاني ان نقول إنا نعرف أولا أن القول في الإعتقادات ما هو؟ و أن الصواب في الأعمال ما هو؟ فإذا عرفنا ذلك، ثم رأينا انسانا يدعو الخلق إلى الدين الحق، و رأينا أن لقوله أثرا قويا في صرف الخلق من الباطل إلى الحق، عرفنا أنه نبي صادق، واجب الإتباع، و هذا الطريق أقرب إلى العقل، و الشبهات فيه أقل ۔ [2]

(نبوت کے دو فریق قائل ہیں جن میں سے ایک فریق کہتا ہے کہ معجزات کا ظاہر ہونا نبی کے سچے ہونے کی دلیل ہے اور یہ مذہب قدیم طریقے سے اور دنیا کے عموماً اہل مذاہب اس کے قائل ہیں جبکہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے یہ فیصلہ کیا جائے کہ صحیح طریقہ اور اعمال خیر کیا ہیں؟ اس امر کے ثابت ہو جانے کے بعد جب یہ دیکھا جائے کہ ایک شخص

---

[1] رومی، جلال الدین، مثنوی مولوی معنوی، 1/56

[2] الرازي، فخر الدين، المطالب العالیہ من علم الالٰہی، الدار الکتاب العربی، 8/103، 1987ء

لوگوں کو دین کی دعوت دیتا ہے اور یہ بھی نظر آئے کہ اس کی بات لوگوں کو باطل سے حق کی طرف لانے میں نہایت مضبوط اثر رکھتی ہے تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ سچا پیغمبر ہے لہذا وہ واجب الاتباع ہے۔ اور یہ طریقہ عقل کے زیادہ قریب ہے جس پر شبہات کم ہوتے ہیں)

امام رازی رحمہ اللہ کے نبوت کے استدلال میں اس دوسرے طریقے کو زیادہ پسند فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قران کریم میں بھی اسی طریقے کو افضل ثابت کیا گیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

(الفصل الثاني في بيان القرآن العظيم يدل على أن هذا الطريق هو الطريق الأكمل الأفضل في إثبات النبوة) [1]

(فصل ثانی اس بات کے ثبوت میں ہے کہ قران کریم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کے ثابت کرنے میں یہی طریقہ زیادہ اکمل اور افضل ہے)

چنانچہ مطالب عالیہ کی اس دوسری فصل میں امام رازی نے نبوت کے استدلال کے اس طریقے کو مفصل انداز میں بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں بھی یہی دوسرا طریقہ بطور افضل ثابت ہوتا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کے ہاں نبوت صرف قوت نظری اور عملی کے کمال کا نام ہے جس میں معجزہ کو کوئی بھی دخل نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں:

و من جملة الأيات الدالة على صحة ما ذكرناه: أنه تعالى حكى عن الكفار أنهم طلبوا منه المعجزات القاهرة في قوله تعالى: " وَقَالُواْ لَن نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ ٱلۡأَرۡضِ يَنۢبُوعًا" ثم أنه تعالى قال له: قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّي هَلۡ كُنتُ إِلَّا بَشَرٗا رَّسُولٗا" يعني كون الشخص انسانا موصوفا بالرسالة، معناه: كونه كاملا في قوته النظرية و العملية، و قادرا على معالجة الناقصين في هاتين القولين: و ليس من شرط حصول هذه الصفة، كونه قادرا على الأحوال التي طلبتموها مني ۔ [2]

(اور ان تمام آیات کے ساتھ کہ جن سے ہمارے مذکورہ دعوے کی صحت ثابت ہوتی

---

[1] الرازي، فخر الدين، المطالب العالیہ من علم الالٰہی، 8/109

[2] ایضاً، 8/31

ہے یہ ہے کہ خدا نے کافروں کا یہ قول نقل کیا کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ اپ زمین سے ہمارے لئے چشمہ نہ نکال دیں وغیرہ وغیرہ تو اس کے جواب میں اللہ تعالی نے کہا کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ سبحان اللہ میں بھی تو صرف ادمی اور پیغمبر ہوں "یعنی کسی آدمی کا پیغمبر ہونا صرف اس پر موقوف ہے کہ قوت نظری اور عملی میں کامل ہو اور ناقصین کو کامل کر سکتا ہو لہذا یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان باتوں پر بھی قادر ہوں جو تم مانگتے ہو)

امام رازی رحمہ اللہ دلیلِ معجزہ کے سلسلے میں مطالبِ عالیہ میں فلاسفہ کے مختلف فرقہ جات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالفرقة الأولى: الذين أنكروا وجود المعجزات، قالوا: خرق العادات ممتنع في المعقول و الفرقة الثانية: الذين سلموا امكان انخراق العادات، إلا أنهم قالوا: لم يوجد دليل يدل على أن الفاعل لتلك الأفعال الخارقة للعادات، هو الله سبحانه، و الفرقة الثالثة: الذين قالوا: هب أن الدليل دل على أن فاعل تلك الخوارق هو الله تعالى، إلا أنها مع تسليم هذا الأصل لا تدل على صدق المدعي للرسالة۔ و الفرقة الرابعة: الذين قالوا: هب أن العجزة تدل على ان الله تعالى صدق ذلك المدعي في دعواه، لكن تصديق الله اياه فيدعوا لايدل على كونه صادقا بدليل أن القول بالخبر حق و متى كان كذلك وجب القطع بأن فاعل القبائح باسرها هو الله، و متى كان كذلك امتنع أن يقال: إن الفعل الثاني قبيح فيمتنع من الله فعله، و إذا كان كذلك لم يقبح من الله تعالى تصديق الكاذب۔ و الفرقة الخامسة: من الطاعنين في المعجزات الذين قالوا: هب أن المعجزات تدل على صدق المدعي إلا أنا ما شاهدنا ظهور تلك المعجزات و إنما الغاية القصوى: أن الناس أخبروا أنها وقعت في الأزمنة الماضية إلا أن الخبر لا يفيد العلم اليقيني و إنما القدر الممكن فيه حصول الظن لأن هذه المسألة يقينية فبناء إثباتها على الطريق الذي لا يفيد إلا الظن

يكون باطلا فاسدا فهذه الفرق الخمس هم الذين يطعنون في النبوات بواسطة الطعن في المعجزات الفرقة الخامسة من الطاعنين في النبوات الذين قالوا: إنه نقل عنهم أحوال لا يليق بالمحققين الأشتغال بها و ذلك يوجب الطعن في كونهم رسلا من عند الله تعالى۔ و الفرقة السادسة: الذين قالوا: لو أراد الله تعالى إرسال الرسل، لكان يجب أن يكون رسولا من الملائكة و أن يظهر عليه معجزات قاهرة متوالية و هذا القول حكاه الله تعالى في القرآن مرارا متوالية كثيرة) [1]

(فلاسفہ کے وہ فرقے جو معجزہ کے منکرین ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے کہ ہمارے لیے ثبوت پہنچانے کا صرف واحد ذریعہ معجزات ہی ہیں مگر معجزات دلیل نبوت نہیں ہیں۔ دوسرا فرقہ معجزات کا انکار تب کرتا ہے کہ ان کے ہاں ایسا عقلی طور پر ممکن نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ کائنات میں اگرچہ خارقِ عادات واقعات ہوتے ہیں مگر یہ ہمارے لیے معلوم کرنا کہ ان کا کرنے والا کون ہے ناممکن ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ خرقِ عادت کا فاعل تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر مدعی رسالت کے لیے معجزہ کیسے دلیل بن سکتا ہے؟ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ معجزہ سے اللہ تعالیٰ نبی کی نبوت کی تصدیق کر رہا ہے اور اسی طرح نبی کی نبوت کی دلیل تو ہو رہی ہے لیکن یہ دعویٰ کی سچائی کی دلیل نہیں ہے۔ پانچویں فرقے کے نزدیک اگرچہ معجزات نبوت کی دلالت کرتے ہیں اور مدعی کی سچائی بیان کرتے ہیں مگر چونکہ یہ ماضی کے زمانوں میں وقوع پذیر ہوئے لہٰذا اب ان پر یقین کرنا اور معجزہ کو دلیل بنانا بے فائدہ ہے تبھی ان کا کہنا ہے کہ نبوت پر یقین معجزات کے حوالے سے ایک طرح طعن ہے۔ چھٹے فرقے کا کہنا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی تو وہ فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتا جیسا کہ قرآن کریم میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ قول بیان کیا ہے، لہذا یہ فرقہ سرے سے معجزات کا انکار کرتا ہے)

اسی لیے امام رازی رحمہ اللہ عجائباتِ قدرت اور خوارقِ عادت کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ عالم میں جو کچھ ہوتا

[1] الرازي، فخر الدين، المطالب العاليه من علم الالٰہی، الدار الكتاب العربی، 8/9، 8

ہے یا تو وہ کسی مؤثر سبب کے ذریعے ہوتا ہے اور یا بلا سبب مؤثر ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں خرقِ عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسے حوادث بغیر کسی سبب مؤثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں تو گویا آپ نے خرقِ عادت کو تسلیم کر لیا۔ پھر دنیا میں کوئی عجیب سے عجیب اور بعید سے بعید بات بھی ناممکن نہیں رہتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ سبب مؤثر کے نتائج ہیں تو وہ دو حال پر مشتمل ہوں گے یا تو یہ سبب مؤثر صاحب اختیار و ارادہ ہے اور یہ تمام حوادث و تاثیرات اس کے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث و تاثیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطرارانہ سرزد ہوتے ہیں جیسے سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک، پہلی صورت میں معجزات اور خوارق کے صدور میں کوئی استحالہ نہیں کیونکہ اس مدبر اور مؤثر کا جب جیسا ارادہ ہو وہ چیز اسی طرح واقع ہو گی اور کوئی اس کا مانع نہیں ہے جبکہ دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مؤثر عالم سے زمانہ قدیم سے ایک ہی طور پر سرزد ہوتی چلی آتی ہیں۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ اسباب و علل کے سلسلے میں اپنی تفسیر کے اندر "انزل من السماء ماء" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن کریم سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نظامِ کائنات میں تبدیلی سنت اللہ نہیں ہے چنانچہ جتنی حقیقت کی طلب اور غور و فکر بڑھتی جاتی ہے اسباب و علل کا سلسلہ وسعت اختیار کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ علت و معلول، سبب و مسبب، شرط و مشروط، مؤثر اور مؤثر کے سلسلے کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور اسی سلسلہ اور نظام کا نام فطرت، سنۃ اللہ اور خلق اللہ ہے؛[2] جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿لَا تَبۡدِيلَ لِخَلۡقِ ٱللَّهِ﴾[3]

(خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں)

اس طرح دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ ٱللَّهِ تَبۡدِيلاۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ ٱللَّهِ تَحۡوِيلا﴾[4]

(اللہ کی عادت میں تغیر نہیں اور تم اللہ کی عادت میں تبدیلی نہ پاؤ گے)

معلوم یہ ہوا کہ خرقِ عادت واقعات کا صدور اسباب کی وجہ سے ہی ہوتا ہے اگرچہ اسباب غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مزید سورۃ الاعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا

---

[1] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، 3/64

[2] الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، دار الطباعۃ العاجزہ مصر، سن، 4/396

[3] الروم:30

[4] فاطر:43

کے معجزے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معجزہ کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو معجزے عطا فرمائے۔

ایک یہ کہ آپ کے عصا کا اژدھا بن جانا اور دوسرے جب آپ اپنا ہاتھ باہر نکالتے تو وہ چمکنے لگ جاتا۔ ان معجزات کے سلسلے میں امام رازی ماہرین طبیعات کے قول کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ماہرین طبیعات یہ نہیں مانتے کہ لاٹھی اژدھا بن گئی تو ہمارا علومِ ضروریہ سے اعتبار اٹھ جائے گا اور تمام سائنسی حقائق، تجربات اور سائنسی علوم بے کار ہو جائیں گے اور جملہ علومِ ضروریہ بھی کارآمد نہیں رہیں گے۔

امام رازی اس حوالے سے جمہور علماء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں یہ تمام چیزیں شعبدہ بازی ہیں اور دلائل کے خلاف ہیں۔ چنانچہ وہ ماہرین طبیعات اور علماء کو یوں جواب دیتے ہیں کہ اگر کسی واقعہ کو ہم قوانینِ فطرت اور دلائل کی گہرائیوں تک نہیں جانتے تو اس بنیاد پر اس واقعہ کو باطل نہیں قرار دیا جاسکتا مگر چونکہ عقلاء اور فلاسفہ اس سے واقف نہیں ہیں اس لیے وہ اس کو نہیں مانتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن ہے کہ عصا کا سانپ بنا دے یا ایک انسان کو فنا کر دے اور اس جیسا دوسرا انسان پیدا کر دے۔ اس کے علاوہ امام رازی کہتے ہیں کہ قلبِ ماہیت کے لیے اہلِ علم کے تین اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہ سب ہو سکتا ہے کیونکہ دنیا کی تمام چیزیں عدم سے وجود میں آسکتی ہیں تو جو چیز موجود ہے اس کی شکل تبدیل کیوں نہیں ہو سکتی؟ یہ اہلِ سنت کا قول ہے۔ دوسرا قول ماہرینِ طبیعات کا ہے کہ یہ بالکل ممکن نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اسے مان لیں تو ہم جہالت کے اندھیروں میں چلے جائیں گے اور ہمیں کسی چیز پر یقین نہیں ہو گا۔

جبکہ تیسرا قول جو فلاسفہ کا ہے جو کہ روشن خیال معتزلہ ہیں اور وہ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں ان کا قول یہ ہے کہ خوارقِ عادت کام ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے ہیں یہ طبقہ جوہر اور عرض کی بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عرض یا صفت کسی شے کی محتاج ہے۔

معتزلہ کے قول کے لیے امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ معجزوں کو معجزانہ انداز میں نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا دونوں ممکن ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ ان کے اس قول کو بے دلیل کہتے ہیں۔ معتزلہ جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں لکھا ہے کہ کہیں خرقِ عادت کا اقرار کرتے ہیں اور کہیں انکار۔ جبکہ اشاعرہ کے ہاں چونکہ مذہب کو خرقِ عادات کے اقرار سے چارہ نہ تھا اور اس کا کوئی قاعدہ معین قرار پا سکتا تھا کہ فلاں قسم کا خرقِ عادت ممکن ہے اور فلاں قسم کا ممکن نہیں۔ اس لیے انہوں نے علت و معلول کے سلسلہ سے ہی انکار کیا اور ان کے

ہاں نہ کسی شے میں کوئی تاثیر ہے اور نہ کوئی چیز کسی شے کی علت ہے۔[1]

اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انقلابِ عادات کا قائل ہونا بہت مشکل ہے اور اربابِ عقل اس میں پریشان ہیں چنانچہ امام صاحب نے اس مسئلے کے حوالے سے تین اقوال بیان کیے ہیں:

1- اشاعرہ کے ہاں ہر قسم کے خرقِ عادت عموماً ممکن ہیں حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جزء لایتجزیٰ دفعۃ عالم اور عاقل بن جائے یا کہ ایک اندھا جو اندلس میں بیٹھا ہوا ہے وہ چین کے کسی گاؤں کو دیکھ لے۔

2- حکمائے طبیعین کے ہاں ایسا بالکل ناممکن ہے۔

3- معتزلہ کے ہاں بعض مخصوص صورتوں کے سوا ناممکن ہے۔[2]

اپنی تفسیر میں سورۃ اعراف کی تفسیر میں امام رازی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے عصا اور یدِ بیضاء کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مخالفین کا یہ قول ہے کہ یدِ بیضاء صرف قوتِ کاملہ ہے۔ یہ بے دلیل قول ہے اور معجزے کی نوعیت کا وہ ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:

(أنه تعالیٰ یجعل معجزة کل نبي من جنس ما کان غالبا علی اهل ذلك الزمان) [3]

(کہ بے شک نبی کو ایسا معجزہ عطا کیا جاتا ہے کہ جس کا معاشرے میں غلبہ ہوتا ہے)

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی تفسیر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان دونوں انبیاء کرام ہی کو اتنے زیادہ معجزات کیوں عطا کیے گئے کیا یہ افضل ہیں؟ پھر جواباً کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات کا تذکرہ کثرت سے اس لیے ملتا ہے کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کو جو معجزات عطا کیے گیے وہ زیادہ قوی اور واضح تھے۔ قرآن کریم میں ان کے تذکرے کا مقصد یہ بھی ہے کہ نزولِ قرآنی کے وقت مذکورہ دونوں انبیاء کرام کی امتیں موجود تھیں، جبکہ دوسرا مقصد ان کی امتوں کو تنبیہ اور یہ باور کروانا کہ ان کے انبیاء کرام پر ایسے قوی معجزات کا ظہور ہوا مگر اس کے باوجود یہ نافرمان قومیں ہدایت نہ پا سکیں۔

معجزہ اور سحر کی بحث کے حوالے سے امام رازی تفسیرِ کبیر میں قصہ ہاروت وماروت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہاروت وماروت کو جادو کے ذریعہ جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے معارِضے اور معجزہ اور جادو کا فرق

---

[1] الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، 4/394، 393

[2] شبلی نعمانی، الکلام علم الکلام، مطبع معارف اعظم گڑھ، 1/79، 78، 1341ھ

[3] الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، 4/395

ظاہر کرنے کے لیے بھیجا تھا لہذا امام رازی کہتے ہیں کہ اگر غیر اللہ کو معجزہ پر قادر مان لیا جائے تو معجزات کو سحر سمجھنے کا جواز ظاہر ہو گا حالانکہ معجزہ خالصتاً فعلِ خداوندی ہے۔ لہذا وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم آنحضرت ﷺ کا ایک مکمل معجزہ ہے جس کے بارے میں رب کائنات نے خود فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام میں شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ باری تعالیٰ کا یہ قول ہی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔[1]

علامہ ابن تیمیہ اور معجزات:

امام تقی الدین ابو العباس احمد بن شہاب الدین عبد الحلیم بن مجد الدین عبد السلام بن عبد اللہ بن محمد بن الخضر ابن علی بن عبد اللہ بن تیمیہ الحرانی الحنبلی رحمہ اللہ (1263ء تا 1328ء) ایک عرب عالمِ دین اور فقیہہ تھے، جو دمشق کے شہر حران میں پیدا ہوئے۔ علمی لحاظ سے ان کا خاندان آٹھ پشتوں سے درس و تدریس سے منسلک ہونے کی وجہ سے علم و فن میں امتیازی مقام کا حامل تھا۔

امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ معجزاتِ انبیاء کے لیے خصوصی طور پر زور دیتے ہیں کہ معجزہ کی بجائے "آیت" کا لفظ اصلی قرآنی اصطلاح ہے اور یہی تعبیر معجزات کے لیے زیادہ درست ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> (وإن كان اسم المعجزة يعم كل خارق للعادة في اللغة و عرف الأئمة المتقدمين كالإمام احمد بن حنبل وغيره و يسمونها الأيات۔ لكن كثير من المتأخرين يفرق في اللفظ بينهما فيجعل المعجزة للنبي، والكرامة للولي و جماعهما الأمر الخارق للعادة) [2]
>
> (تمام خرقِ عادات کو لغت میں معجزہ کہا جاتا ہے۔ ائمہ متقدمین جیسے امام احمد بن حنبل وغیرہ نے معجزہ و کرامت کی یہی تعریف کی ہے اور ان کو آیات کا نام دیا ہے۔ مگر بہت سے متاخرین نے ان دونوں الفاظ یعنی معجزہ اور کرامت میں فرق بیان کیا ہے لہٰذا انہوں نے معجزے کو نبی کے لیے اور کرامت کو ولی کے لیے بتلایا ہے۔ اور یہ دونوں امور خارقِ عادت قرار دیے ہیں)

معجزات کے حوالے سے بحث میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علم، قدرت اور غنیٰ ان تینوں چیزوں کے درجہ کمال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان تینوں چیزوں پر درجہ کمال تک سوائے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات کے کوئی نہیں

---

[1] الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، 6/680

[2] ابن تیمیہ، مجموعہ رسائل ابن تیمیہ، مطبعہ المنار، بصرہ، 1/2، 1930ء

پہنچ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنے علم سے احاطہ کیا ہوا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے اور وہی مستغنی ہے تمام عالموں پر۔ چنانچہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی ان تینوں چیزوں کی کاملیت کے دعویٰ سے فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

(و قد امر الرسول ﷺ أن يبرأ من دعوى هذه الثلاثة بقوله: " قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمۡ عِندِي خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعۡلَمُ ٱلۡغَيۡبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمۡ إِنِّي مَلَكٌۖ إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّۚ) [1]

(اور حکم دیا رسول اللہ کو کہ وہ بری ہیں ان تینوں چیزوں کے دعویٰ سے فرمایا اس اللہ نے کہ کہہ دیجیے کہ میں نہیں کہتا اللہ کے خزانوں کے بارے میں اور نہیں ہے مجھے غیب کا علم اور میں نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ بے شک میں اتباع کرتا ہوں اللہ کی طرف سے کی جانے والی وحی کی)

اسی طرح امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ خرقِ عادت کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

(فما كان من الخوارق من باب العلم، فتارة بأن يسمع العبد مالا يسمعه غيره، و تارة بأن يرى ما لا يراه غيره يقظة و مناما، و تارة بأن يعلم ما لا يعلم غيره وحيا و الهاما، أو انزال علم ضروري، أو فراسة صادقة) [2]

(کشف، خوارق کا دروازہ ہے یعنی کوئی شخص ایسی بات سن لے یا معلوم کرلے جو دوسروں کے دسترس سے باہر ہو یا سوتے جاگتے میں یعنی یہ حالتِ بیداری یا بہ عالمِ خواب ایسی باتیں دیکھ لے جو دوسرے لوگوں کو نہیں دکھائی دیتیں یا ایسی باتیں وحی، الہام، علمِ ضروری یا فراستِ صادقہ سے حاصل کرلے جن کا دوسروں کو علم نہیں)

خرقِ عادت کے سلسلے میں تین چیزیں اہم ہیں، جن کو کشف، مشاہدات اور مکاشفات و مخاطبات کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جو چیزیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں ان کو مخاطبات کہا جاتا ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں وہ مشاہدات کہلائیں گی اور جن کا تعلق علم سے ہے وہ مکاشفہ کہلائیں گی۔ مجموعی لحاظ سے ان تمام چیزوں کو کشف و مکاشفہ کہتے ہیں۔ یعنی جس شخص سے خوارق عادت صادر ہوتے ہیں گویا اس کے لیے ان تمام اشیاء کو کھول دیا گیا ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموعہ رسائل ابن تیمیہ، 1/3

[2] أیضاً، 1/3

شیخ الاسلام مزید کہتے ہیں کہ قدرت کا تعلق تاثیر پیدا کرنے سے ہوتا ہے اس کی صورت قابلِ ہمت کام، بات کا سچ ہونا اور مقبول دعا سے ہے یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کے کرنے سے ہوتے ہیں کسی دوسرے کا اس میں کوئی کردار نہیں ہوتا جیسا کہ دشمن کو ہلاک کرنے میں اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ابنِ تیمیہ اس بات کو مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو کرامات عطا کی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان سے خارقِ عادت امور ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ خوارق عادت انبیاء کرام علیہم السلام اور دوسرے لوگوں میں عام ہیں مگر خوارق کی جو قسم معجزات پر مشتمل ہے وہ فقط انبیاء کے ہاتھوں پر ہی ظاہر ہوتی ہے وہ کھلی ہوئی علامات اور کامل تحدی کے ساتھ اور یہ خوارقِ عادت معجزات صرف مخلوق کی نفع رسانی اور خیر کے لیے ہوتے ہیں کیونکہ انہی سے رسول کی رسالت ثابت ہوتی ہے۔[1]

انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ دیگر لوگوں سے جن خوارقِ عادت امور کا ظہور ہوتا ہے ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے ان کو تین اقسام میں شمار کیا ہے:

(إن الخارق ثلاثة أقسام: محمود في الدين، و مذموم في الدين، و مباح لا محمود و لا مذموم في الدين فإن كان المباح فيه منفعة كان نعمة و إن لم يكن فيه منفعة كان كسائر المباحات التي لا منفعة فيها كاللعب و العبث) [2]

(یعنی خوارق کی تین اقسام ہیں: دینی لحاظ سے محمود، دینی لحاظ سے مذموم اور نہ محمود نہ مذموم بلکہ مباح۔ پس اگر مباح میں منفعت پائی جائے تو وہ نعمت ہوگی اور اگر اس میں منفعت نہ ہو تو وہ تمام ان مباحات کی طرح ہوں گے کہ جن میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا جیسا کہ کھیل اور عبث وغیرہ)

چنانچہ اس عبارت سے ثابت ہوا کہ خوارق دینی حیثیت سے محمود بھی ہوتے ہیں اور مذموم بھی اور ایسے بھی کہ جو نہ محمود ہوتے ہیں نہ مذموم، بلکہ مباح ہوتے ہیں اور اگر یہ خلقِ خدا کی منفعت کا باعث وحامل ہوں تو انہیں کرامت کا نام دیا گیا ہے۔

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ جن دوسرے لوگوں سے خوارق کا صدور ہوتا ہے اس حوالے سے ابن تیمیہ کہتے ہیں:

---

[1] ابوزھرہ، محمد، حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، 1/492

[2] ابن تیمیہؒ، مجموعہ رسائل، 1/3

(اگر خوارقِ عادت سے کوئی دینی فائدہ ہو تو ان کا شمار اعمالِ صالحہ میں ہوگا اور اگر خوارق عادت سے کوئی امرِ مبارح وجود میں آئے تو ان کا شمار دنیاوی نعمتوں میں ہوگا جن کا شکر واجب ہے اور اگر خوارقِ عادت سے کوئی ایسی بات وجود میں آئے تو نہی تحریمی یا غیر نہی کی مورد ہو تو وہ عذابِ خداوندی اور ناراضگی کا سبب ہوگا)[1]

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ہاں صاحبِ کرامت کے مقابلے میں وہ شخص افضل ہے جو راہ راست پر استقامت سے قائم رہے چنانچہ اس حوالے سے وہ علامہ ابن الجوزی کا قول اپنی تحریر میں نقل فرماتے ہیں: (كن طالبا للإستقامة لا طالبا للكرامة، فإن نفسك منجبلة على طلب الكرامة، و ربك يطلب منك الإستقامة) [2] (استقامت کا طالب بن کرامت کا طلب گار مت بن، تمہارا نفس تم سے کرامت طلب کرتا ہے اور تیرا رب تم سے استقامت کا خواہاں ہے)

اسی طرح ولایت اور امور خرق عادت لازم و ملزوم نہیں ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ کوئی بندہ ولی اللہ ہو مگر صاحب خوارق نہ ہو؛ کیونکہ امور خارقہ ایسے شخص کے ہاتھوں بھی سرزد ہو سکتے ہیں جو خدا کا مطیع نہ ہو اور مرتبۂ ولایت پر فائز نہ ہو۔

اس حوالے سے بنیادی اور خاص بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت کے ہاں ولایت الٰہی کی صفت تقوی اور ایمان ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿أَلَآ إِنَّ أَوۡلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُو ﴾[3]

(خبردار !بے شک اولیاء اللہ پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ ہراساں ہوں گے)

اسی طرح معجزات و آیات کے سلسلے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ صرف ان معجزات پر ہی اکتفا نہیں کرتے جو سیرت انبیاء کی کتب میں مذکور ہیں بلکہ آیات و دلائل نبوت کے دائرے کو انہوں نے اس قدر وسیع کیا ہے کہ اس میں سیرت طیبہ کے ہر پہلو کو شامل کیا ہے۔ جو اہل بصیرت اور انصاف پسند لوگوں کی نگاہ میں آپ ﷺ کی نبوت

---

[1] ابوزھرہ، محمد، حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، 1/493

[2] ابن تیمیہؒ، مجموعہ رسائل، 1/13

[3] یونس:62

کے لیے سب سے بڑی دلیل اور برہان و حجت ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

(وسيرة الرسولﷺ من اياته و أخلاقه و أقواله و أفعاله و شريعته، من أياته، و أمته من آياته، و علم أمته و دينهم، من آياته، و كرامات صالح أمته من آياته) [1]

(رسول اللہ ﷺ کی سیرت آپ ﷺ کے اخلاق اور افعال و اقوال بھی آپ ﷺ کا معجزہ ہے۔ آپ ﷺ کی شریعت بھی آپ ﷺ کا مستقل معجزہ ہے اور آپ ﷺ کی امت اور امت کا علم اور ان کی دینداری اور ان کی زندگی اور آپ ﷺ کی امت کے صلحاء کی کرامات بھی آپ ﷺ کا ایک معجزہ ہے)

آنحضرت ﷺ کی نبوت کو دلائلِ معجزات سے ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جس انداز سے ثابت کیا ہے وہ ان کی اس عبارت سے واضح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص جو نبوت کے مفہوم سے واقف ہے اور نبوت پر اس کا اعتقاد ہے اور کسی بھی نبی کا کلمہ گو ہے اس کے لیے آنحضرت ﷺ سے انکار و انحراف ممکن نہیں ہے اس لیے کہ دیگر انبیاء کی نبوت کے اثبات کے لیے جو دلائل اور ثبوت پیش کیے جاسکتے ہیں وہی تمام براھین و دلائل آنحضرت ﷺ کی نبوت کو بدرجہ اولی وبطریق احسن ثابت کرتے ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہیں کہ انبیاء کرام کی نبوت معجزات سے ثابت ہوتی ہے تو آنحضرت ﷺ کے معجزات کہیں زیادہ عظیم ہیں اور ان کا ثبوت ایسے تواتر سے ملتا ہے کہ کسی اور نبیؑ کے معجزات اس تواتر سے ثابت نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب دوسرے صحیفوں سے زیادہ مکمل ؛ آپ ﷺ کی امت دوسرے پیغمبروں کی امتوں سے زیادہ بہتر اور برتر ہے۔ آنحضرت ﷺ احکام دینیہ اور قوانین تمام شرائع سے فائق اور بلند و اعلی ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت کی تکذیب سے تمام نبوتوں کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اور کسی ایک نبوت کا ثبوت بھی مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ اپنے اس دعوے کے اثبات کے حوالے سے ابن تیمیہ نے قرآن وحدیث کے حوالے سے متعدد دلائل ذکر کیے ہیں۔ [2]

---

[1] ابن تیمیہ، الجواب الصحیح، المکتبہ العربیہ السعودیہ، الریاض، 1376ھ، 4/80

[2] ایضاً، 4/82

حکمائے اسلام اور معجزات:

ابن مسکویہ: ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ الرازی (330ھ تا 431ھ۔ /946ء تا 1030ء) ایک عظیم ادیب مورخ اور فلسفی ہیں۔ مستشرقین میں بطور خاص وہ "ابن مسکویہ" کے نام سے معروف ہیں۔ نبوت کے سلسلے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ "ابن مسکویہ نے نبی اور فلسفی میں فرق کیا ہے۔ وہ نبی کو فلسفی سے افضل سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے نبوت اور کہانت میں بھی فرق کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کاہن کو غیب دانی کے باوجود نبی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ نبوت شخصیت کا کمال ہے اور وحی الٰہی دوسروں سے اس کا مابہ الامتیاز ہے۔[1]

انبیاء کرام کے معجزات کے حوالے سے استدلال کرتے ہوئے سلسلہ اسباب و علل کے متعلق ابن مسکویہ کہتے ہیں:

> (یہ حقیقت ہے کہ اس نظام فطرت و اسباب و علل کے سلسلے میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور نہ دنیا میں کوئی شے بغیر علت عادیہ اور سبب طبعی کے پیدا ہو سکتی ہیں مگر یہ درست نہیں ہے کہ معجزات اس سلسلے اور نظام سے الگ ہیں اور وہ فطرت کی قانون شکنی کرتے ہیں بلکہ وہ بھی علل و اسباب طبعی کے نتائج ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہم ان علل و اسباب کے احاطے سے اب تک قاصر ہیں ؛اور وہ اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں ،ممکن ہے کہ انسانی تحقیقات کا دائرہ کسی وقت اتنا وسیع ہو جائے کہ ان کے اسباب و علل ہماری سمجھ میں آجائیں)[2]

الفارابی: ابو النصر محمد بن محمد بن ترخان ابن اوزلغ (870 عیسوی تا 950 عیسوی) جو محمد نامی ترک سپہ سالار کے بیٹے تھے اور ترکی الاصل تھے۔ وہ یونانی فلسفے کو صحیح معنوں میں سمجھنے والے پہلے مسلم فلسفی تھے جن کو اسلامی فلسفے پر بھی عبور تھا اور وہ اسلامی فلسفے کی اساس رکھنے والے تھے۔ فارابی علم فلسفہ کا منطق کے ذریعے مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے بعد مابعد الطبعیات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے دین اسلام اور فلسفہ کی باہمی مناسبت اور دونوں کے مابین افتراقات و اختلافات سے فارابی ہی نے بحث کی ہے۔[3]

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1973ء، 1/690

[2] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، 3/61

[3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1973ء، 15/12، 11، 7

فارابی کے اپنے رسالات میں نبوت اور اس کے اجزاء اور نبوت کے لوازمات پر کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ معجزات کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔

(النبوة تختص في روحها بقوة قدسية تذعن لها غريزة عالم الخلق الأكبر كما تذعن لروحك غريزة عالم الخلق الأصغر فتأتي بمعجزات خارجة عن الجبلة و العادات و لا تصدأ مرآتها عن انتقاش بما في اللوح المحفوظ من الكتاب الذي لا يبطل و ذوات الملائكة التي هي الرسل فتبلغ مما عند الله) [1]

(روح نبوت قوت قدسیہ سے ممتاز ہوتی ہے جیسے عالم خلق اصغر تمہاری روح کا فرمانبردار و مطیع ہوتا ہے ایسے ہی عالم خلق اکبر پیغمبر کی روح کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے اس لیے اس سے ایسے معجزات صادر ہوتے ہیں جو عادت اور جبلت کے مخالف ہوتے ہیں اس کا آئینہ زنگ آلود نہیں ہوتا اور لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس میں اس کے نقش ہو جانے سے کوئی چیز رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس طرح خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کو عامہ خلق تک پہنچا دیتا ہے)

فارابی سبب و مسبب اور علت و معلول کے حوالے سے کہتا ہے کہ:

(دنیا میں کوئی ایسی بات تم لوگ نہیں پاؤ گے جس کا کوئی سبب نہ ہو اور اسباب کا یہ سلسلہ بالاخر مسبب الاسباب تک پہنچا کر چھوڑتا ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان سے کوئی فعل سرزد ہو اور اس کا کوئی خارجی سبب موجود نہ ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ محرکات و اسباب ایک خاص ترتیب کے محتاج ہوتے ہیں اور یہ ترتیب ایک خاص تقدیر کی پابند ہوتی ہے جبکہ تقدیر "رضائے الٰہی کی تابع اور قضاء مشیت خداوندی کا نام ہے)[2]

فارابی کے نظریات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں معجزہ کا ظہور اسباب خفیہ کے باعث ہوتا ہے اور اس کے اندرونی اسباب و علل پائے جاتے ہیں جبکہ نظام عالم میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوتی۔

---

[1] الفارابی، ابو النصر، مسائل متفرقہ، دائرہ المعارف النظامیہ، الکائنۃ الہند، 1343ھ، 1/9

[2] الندوی، عبد السلام، حکمائے اسلام، دار المطبع معارف، اعظم گڑھ 1953ء، 1/132

ابن سینا: ابو علی الحسین ابن عبد اللہ (980 عیسوی تا 1037 عیسوی) بخارا میں چھ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ پہنچے اور ہمدان میں ان کا مدفن بنا۔ لاطینی زبان میں ان کو Avicenna عبرانی زبان میں Aven sina, اور یورپ میں اب ان کو ابن سیناہی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ نبوت کے حوالے سے کہتے ہیں:

(پیغمبروں کا درجہ فلسفیوں سے افضل ہے اور وحی کی حیثیت ایک بلند و بالا ادراک یعنی ایک قوت قدسیہ کی ہے۔ جب کہ وحی، الہام اور رویاء حکمیت الہیہ کے اجزاء ہیں)[1]

معجزات کے حوالے سے ابن سینا اس نظریے کے قائل ہیں کہ معجزات کا صدور اسباب خفیہ کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ان کے باعث نظام دنیا میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی خرق عادت پر اشارات میں ایک باب میں بحث کرتے ہوئے ابنِ سینا کہتے ہیں:

(اگر تم سے کوئی شخص یہ کہے کہ کسی درویش نے ایک عرصے تک کھانا نہیں کھایا یا کوئی ایسا کام کیا جو اس کی قوت سے زیادہ تھا یا کوئی پیشگوئی کی یا اس کی بد دعا کے باعث کوئی آدمی زمین میں دھنس گیا، یا زلزلہ بپا ہوا، یا درندہ تابع فرمان ہو گیا وغیرہ وغیرہ تو تم اس کا انکار مت کرو۔ کیونکہ ان تمام کے اسباب طبعی ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے سے ان کا ظہور ہوتا ہے اور اسی طرح جو چیز عام عادات کے خلاف ہو اس کو خرق عادت سے تعبیر کیا جاتا ہے گو کے واقع میں وہ اصول قدرت کے خلاف نہیں ہوتی)[2]

ابن سینا ایک طویل عرصے تک خرق عادت امور کا انکار کرتے رہے مگر ان کے زمانے میں جو صوفیائے کرام سے بعض خوارق عادت امور صادر ہوئے جن کا انہوں نے مشاہدہ کیا تو بالاخر ابن سینا خوارق عادت کو تسلیم کرنے اور ان کے اسباب و علل پر غور کرنے کی جانب متوجہ ہوئے جس کی انہوں نے خود اپنے الفاظ میں تصدیق فرمائی: (و لكنها تجارب لما ثبت طلب أسبابها ثم إني لو اقتصصت جزئيات هذا الباب فيما شاهدناه و فيما حكى عمن و ثاقنا لطال الكلام) [3]

(اور لیکن یہ تجربات ہیں اور جب یہ ثابت ہوئے تو ان کے اسباب کی جستجو ہوئی اور اگر میں اس قسم کی جزیات کو شمار کروں جو میں نے خود دیکھیں یا ان لوگوں نے دیکھیں جن کو میں ثقہ سمجھتا ہوں تو بہت طول ہو جائے گا)

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1/560-562

[2] شبلی نعمانی، الکلام علم الکلام، 1/80-81

[3] ایضاً، 1/127

ابن سینا نے خوارق عادات وواقعات کے لیے بیان کردہ بہت سے اسباب میں جس سبب کو خاص اہمیت دی ہے وہ قوت نفسانی ہے۔ چنانچہ اس قوت نفسانی کے سبب خیر وشر کے حوالے سے ابن سینا کہتے ہیں:

(یہ قوت فطری اور جبلی طور پر جس شخص میں موجود ہوتی ہے اور اس کے ساتھ وہ فطرتا مقدس اور پاکیزہ خوہوتا ہےاور اس قوت کو اغراض حسنہ میں استعمال کرتا ہے وہ نبی یا ولی ہوتا ہے اور اگر اس قوت کے ساتھ فطرتا بدطنیت وشریر ہو جائے یہاں تک کہ اس کو برے کاموں میں صرف کرے تو وہ جادوگر اور شعبدہ گر ہوگا)[1]

ابن رشد: محمد بن احمد بن رشد (1126ء تا1198ء) قرطبہ میں پیدا ہوئے اور مراکش میں وفات پائی۔

ابن رشد معجزہ اور نبوت کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ معجزہ نبوت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعوی اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جیسے کوئی شخص اگر دعوائے نبوت کرے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے قوم کے عقائد واعمال اور اخلاق کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا ہے مگر جب اس سے دعوی کی تصدیق کے لیے دلیل مانگی جائے تو وہ خشک چشمہ کو پانی سے لبریز کر دیتا ہے چاند کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، یہ تمام واقعات اگرچہ نہایت عجیب وغریب ہیں مگر ان تمام دلائل کو دعوی کے ساتھ کیا مناسبت ہے ؟[2] ابن رشد کے ہاں جب نبوت پر معجزہ سے استدلال کیا جائے تو چند مقدمات قائم ہوتے ہیں۔

اول۔ نبی سے معجزہ صادر ہوتا ہے۔

دوم۔ جس سے معجزہ صادر ہوتا ہے وہ نبی ہوتا ہے۔ ان مقدمات کا ثبوت امور ذیل کے ثبوت پر موقوف ہے۔

1۔ معجزہ ممکن الوقوع ہے اور واقع ہوتا ہے۔

2۔ مدعی نبوت سے معجزہ صادر ہوا۔

3۔ نبوت اور پیغمبری کا وجود ہے۔

4۔ جس سے صدور معجزہ ہوتا ہے وہ نبی ہے۔

ابن رشد کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت کی ماہیت میں معجزہ داخل نہیں ہے اور جو لوگ معجزے کے قائل

---

[1] شبلی نعمانی، الکلام علم الکلام، 1/128

[2] ایضاً، سیرۃ النبی ﷺ، قرآن محل، کراچی، 1342ھ 3/118

ہیں وہ بھی معجزے کو پیغمبری کی علامت قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ابن رشد کہتے ہیں کہ علامت عین حقیقت نہیں ہوتی۔ تبھی ابن رشد نے معجزہ کو خطابیات میں داخل کیا ہے۔

معجزہ نبوت پر اگرچہ ذاتی طور پر یقینی دلالت نہیں کرتا تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلہ کائنات میں عجیب و غریب تصرف کرتا ہے تو اسے دیکھ کر ہر آدمی اس کے روحانی کمالات کا اعتراف کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور اپنے دعوے میں صادق ہو گا۔ ان دونوں میں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاح روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں تاہم عوام کی دلفریبی کے لیے یہ کافی ہے مگر اس سے بھی زیادہ درست بات یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلمات خصم سے استدلال کیا جاتا ہے اور یہ تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاس جدل کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

قدیم زمانے سے یہ تصور چلا آتا ہے کہ کسی بھی پیغمبر میں کوئی نہ کوئی محفوظ الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے جو عام لوگوں سے اس پیغمبر کو ممتاز کرتی ہے۔ اسی وجہ سے کسی قوم میں جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو اس موروثی اور مسلمہ عقیدہ کی بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں۔ اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے۔ یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتا تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اور انہی کے طلب و اصرار سے اس معجزے کا ظہور ہوا ہے۔ ان کو اس کے ذریعے سے ساکت کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے دلیل ہو سکتا ہے۔[1]

خلاصہ بحث:

خوارق عادت واقعات کے انبیاء کے ہاتھوں پر صدور کو معجزہ کہا جاتا ہے۔

معجزہ دراصل نبی کا ذاتی عمل نہیں بلکہ فعل خداوندی ہوتا ہے۔

معجزہ اگرچہ دلیل نبوت اور نصرت خداوندی کا ثبوت ہے لیکن انبیاء کی سچائی کو تسلیم اور ان کی دعوت پر لبیک کر کے ایمان لانے کے لیے معجزہ کا ظہور لازمی نہیں۔

یہاں معجزہ کی اقسام، معجزہ اور سحر میں فرق، اور معجزات سے متعلق مسلم حکماء کے کلامی استنباط کو تفصیلاً دلائل کی روشنی میں ذکر کر کے ان کی آراء کا جائزہ لیا گیا ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے اقوال کی تشریح کی گئی ہے۔

---

[1] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ﷺ، 3/ 121، 120

فصل دوم

معجزات سے متعلق عقلی اشکالات کا تجزیہ

فصل دوم: معجزات سے متعلق عقلی اشکالات کا تجزیہ

انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات سے انکار کا دستور ابتدائی اور اس کا تسلسل آج بھی موجود ہے مگر ابتدائی منکرینِ معجزات اور عصر حاضر اور اس سے متصل زمانے کے منکرین کی وجوہ انکار مختلف اور الگ الگ ہیں۔ ادوار سابقہ انبیاء کے معجزات سے انکار کرنے والے لوگ زیادہ تر کفار تھے اور وہ اس وجہ سے انکار نہیں کرتے تھے کہ معجزہ کا وقوع قدرتی قانون کے مخالف ہے بلکہ وہ خوارق عادت امور کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ انبیاء سے بذات خود معجزات طلب کیا کرتے تھے۔ اور جیسے ہی کسی نبی کو معجزہ عطا کر دیا جاتا تو اسے جادو کہہ کر نبی کی رسالت و نبوت کی نفی کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ رویہ دو باتوں کا مظہر ہے کہ اولاً تو وہ خرق عادت امور کو مانتے تھے اور نہ صرف معجزہ بلکہ جادو کو بھی تسلیم کرتے تھے جبکہ ثانیاً معجزے کے انکار کی اصل وجہ انبیاء کرام کی رسالت سے انکار اور مخالفت تھی اور ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ خوارق عادتا امور کو ناممکن الوقوع سمجھتے ہوں۔

معجزات سے متعلق مستشرقین کے نظریات کا مطالعہ:

معجزات کے حوالے سے جدید مغربی مفکرین بالخصوص مستشرقین کے نظریات وافکار درج ذیل ہیں:

1۔ڈیوڈ ہیوم

اسکاٹ لینڈ کا معروف فلسفی ڈیوڈ ہیوم (David Hume:1711-1776) ایک نامور فلسفی، تاریخ دان اور ماہر معیشت تھا۔ معجزات کے حوالے سے اس کی فلسفیانہ آرا علمی حلقوں میں اکثر و بیشتر زیر بحث رہی ہیں۔ چنانچہ ڈیوڈ ہیوم David Hume معجزہ کے حوالے سے اپنا استدلال ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

> A miracle is a violation of the laws of nature and as a firm and unalterable experience has established these laws, the proof against a miracle, from the very nature of the fact, is as entire as any argument from experience can possibly be imagined. Why is it more than probable, that all men must die: that lead cannot, of itself, remain suspended in the air, that fire consumes wood, and is extinguished by water: unless it be, that these events are found agreeable to the laws of nature, and there is required a violation of these laws, or in other words, a miracle to prevent them? Nothing

is esteemed a miracle, If it ever hapeen in the common course of nature. It is no miracle that a man, seemingly in good health, should die on a sudden: because such a kind of death, though more unusual than any other, has yet been frequently obserbved to happen. But it is a miracle, that a dead man should come to life: because that has never been observed in ay age or country.[1]

(معجزہ خرقِ قوانین فطرت کا نام ہے اور چونکہ یہ قوانین مستحکم اور اٹل تجربے پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا معجزہ خود اپنے خلاف اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے زیادہ کسی بھی تجربے پر مبنی ثبوت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ کیا وجہ ہے کہ ان امور میں ہمارے یقین کا درجہ ظنِ غالب سے زیادہ ہوتا ہے کہ تمام آدمی فانی ہیں سیسہ خود ہی ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا، آگ لکڑی کو جلا ڈالتی ہے اور پانی سے بجھ جاتی ہے۔ صرف یہی کہ یہ امور قوانینِ فطرت کے مطابق ثابت ہو چکے ہیں اور اب ان کا توڑنا بغیر قوانین فطرت کے توڑنے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ بغیر معجزہ کے ناممکن ہے۔ جو چیز عام قاعدۂ فطرت کے اندر واقع ہوتی ہے وہ کبھی معجزہ نہیں تصور کی جا سکتی۔ مثلاً یہ کوئی معجزہ نہیں کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں صحت مند اور ٹھیک تھا اچانک مر جائے کیونکہ اس طرح کی موت گو کہ قلیل واقع ہوتی ہے مگر پھر بھی کئی بار مشاہدہ کیا جا چکا ہے البتہ اس کے مقابلے میں یہ معجزہ ہو گا کہ کوئی مردہ زندہ ہو جائے اس لیے کہ ایسا کبھی اور کسی ملک میں نہیں دیکھا گیا۔)

اسی طرح معجزہ کی شہادت و تصدیق کے متعلق ہیوم کی رائے کچھ یوں ہے:

That the testimony, upon which a mircle is founded, may possibly amount to an entire proof, and that the faisehood of that testimony would be a real prodigy.[2]

---

[1] Hume, *Enquires Concerning the Human Understanding and Concerning the Principles of Miracales,* Oxford University Press, London, 1951, 1/114-115,

[2] *Ibid*, 1/116

(جس شہادت و تصدیق پر معجزہ کا دارومدار ہوتا ہے وہ ممکن ہے کہ بذات خود مکمل ثبوت ہو اور اس کی تردید و تکذیب بذاتِ خود خرقِ عادت کے مساوی ہو)

ڈیوڈ ہیوم کے ہاں کوئی بھی انسانی شہادت معجزہ کو ثابت کرنے اور اس کی بنیاد پر کسی نظامِ مذہب کو قائم کرنے کے لیے کافی نہیں ہے چنانچہ وہ مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ معجزہ کے لیے کوئی شہادت بھی ثبوت تو کیا، ظن کا کام بھی نہیں دے سکتی اور اگر فرض کر کے ہم یہ مان لیں کہ وہ ثبوت کا کام دیتی بھی ہو تو ایک اور مخالف ثبوت اس کے ساتھ موجود رہتا ہے جو بذاتِ خود اس واقعہ کی نوعیت سے ماخوذ ہوتا ہے جس کو یہ شہادت ثابت کرنا چاہتی ہے۔

انسانی شہادت کا اعتبار صرف تجربہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور اس تجربہ سے ہمیں قوانینِ فطرت کا علم و یقین بھی حاصل ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں میں جب تعارض واقع ہو تو فقط یہی صورت رہ جاتی ہے کہ ایک کا وزن دوسرے سے منفی کر کے جو کچھ باقی بچ جائے اسی طرف اپنا یقین باقی وزن کے بقدر قائم کر لیا جائے مگر عام مذہب کے متعلق جب ہم نفی یا تفریق کے اصول سے کام لیتے ہیں تو بقیہ مقدار صفر رہ جاتی ہے اس لیے ہم یہ ایک کلیہ ترتیب دے سکتے ہیں کہ کوئی انسانی شہادت بھی اتنی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ کسی معجزے کو ثابت کر کے اس کی بنیاد پر کسی مذہبی نظام کو ثابت کر سکے۔

چنانچہ اس بنیاد پر وہ مذہبی بنیاد پر معجزہ کے انکار اور دوسری صورت میں معجزات کے قائل ہونے کا اقرار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> When I said that a miracle can never be proved, so as to be the foundation of a system of religion. For I own, that otherwise, there may possibly be miracles, or violations of the usual course of nature, of such a kind as to admit of proof from human testimony though perhaps.[1]
>
> (میں صرف اس انداز سے معجزے کا انکار کرتا ہوں کہ وہ کسی نظامِ مذہب کی بنیاد قرار پا سکتا ہے وگرنہ دوسری حیثیت سے میں معجزات کا اس صورت میں قائل ہوں کہ انسانی شہادت کی بنیاد پر فطری قوانین کا خرق تسلیم کیا جا سکتا ہے)

[1] Hume, David, *The Human Understanding*, 1/127

ہیوم کے ہاں معجزہ قادرِ مطلق ذات کا فعل ہے مگر اس ذات کے افعال کو سمجھنا اس کے نزدیک روزمرہ زندگی کے تجربات ہی کی جانب لوٹنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں معجزہ اگرچہ قادرِ مطلق کا فعل ہے مگر اس سے ذرہ برابر بھی یقین میں اضافہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس قادرِ مطلق ذات کے افعال وصفات کا جاننا بھی صرف روزانہ کے تجربات کے باعث ہی ممکن ہے کہ کائناتِ فطرت میں اس نے اپنے عمل و تخلیق کی کیا سنت اختیار کر رکھی ہے۔

اس سنت کے معلوم کرنے کے لیے پھر ہمیں گزشتہ مشاہدات کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے جو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ انسان کا جھوٹ بولنا زیادہ ممکن و قرینِ قیاس ہے یا خرقِ قوانینِ فطرت؟ اور چونکہ مذہبی معجزات کی شہادت و روایت میں دوسرے واقعات کے مقابلے میں کذب و اختراع کا خدشہ زیادہ ہے تبھی اس کا وزن مزید کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے ہاں پیشن گوئیاں بھی اصلاً معجزات ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> All prophecies are real miracles, and a such only, can be admitted as proofs of any revelation. If it did not excced the capacity of human nature to fortell future events, it would be absurd to employ any as prophecy as an argument for a divine mission or authority from heaven.[1]
>
> (دراصل پیشن گوئیاں حقیقت میں معجزات ہی ہوتی ہیں اور صرف اسی حیثیت سے وہ وحی و الہام کا ثبوت بن سکتی ہیں ورنہ اگر واقعاتِ مستقبل کی پیش گوئی انسانی طاقت سے باہر نہ ہو تو پھر کسی پیش گوئی کو نبوت و رسالت کی دلیل شمار کرنا قطعی طور پر مہمل ہو گا)

جبکہ معجزہ پر یقین رکھنے والے شخص کے بارے میں ہیوم کہتے ہیں کہ جو شخص ایمان کی بنیاد پر اسے تسلیم کرتا ہے وہ درحقیقت خود اپنی ذات میں مستقل معجزہ رکھتا ہے جس نے اس کی فہم و عقل کے تمام اصولوں کو زیر و زبر کر کے ایسی چیز کے یقین پر آمادہ کر لیا ہے جو انسانی تجربہ و عادت کے یکسر منافی ہے۔[2]

2۔ تھامس ایچ ہکسلے (*Thomas Henry Huxley*) اور معجزات

پروفیسر ہکسلے (Thomas Henry Huxley:1825-1895) ایک معروف انگریز فلسفی اور وہ صفِ اول کے سائنس دان ہیں۔ قوانینِ فطرت کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے معجزہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] Hume, David, *The Human Understanding*, 1/130-131
[2] Hume, David, *Ibid*, 1/156

The word "Miracle"- miraculum- in its primitive and legitimate sease, simply means something wonderful.[1]

(معجزات کے معنیٰ زیادہ "انتہائی حیرت انگیز واقعات" کے کیے جاسکتے ہیں)

ممکنات اور ناممکنات کی بحث کرتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں کہ صحیح لحاظ سے سوائے تناقض کے مزید کسی بھی ایسی شے سے میں باخبر نہیں ہوں کہ جسے ناممکن کہنا حق بجانب ہو، منطقی ناممکنات کا وجود ہے مگر طبعی ناممکنات کا قطعی طور پر کوئی وجود نہیں ہے۔ مربع مدور، ماضی موجود، دو متوازی خطوط کا تقاطع، یہ چیزیں ناممکنات میں سے ہیں۔ کیونکہ مدور موجود ہوں یا حاضر اور تقاطع کا تصور ہی مربع، ماضی اور متوازی کے تصور کے برخلاف ہے، لیکن پانی پر چلنا، پانی کو شراب بنادینا، بچہ کا بغیر باپ پیدا ہونا، مردے کو زندہ کرنا یہ چیزیں مذکورہ بالا مفہوم کی روشنی میں ناممکنات میں سے نہیں ہیں۔

ہاں اگر ہم یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ فطرت اشیاء سے متعلق ہمارے علم نے تمام ناممکنات کا مکمل احاطہ کرلیا ہے تو شاید یہ کہنا درست ہوتا کہ آدمی کی صفات چونکہ پانی پر چلنے یا ہوا میں اڑنے کے متناقض ہیں، اس لیے یہ افعال اس کے لیے ناممکن ہیں، لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ علمِ فطرت کی انتہا تک پہنچنا کیسا ابھی تک تو ہم اس کی ابتداء و بنیاد سے ہی آگے نہیں بڑھے، بلکہ ہماری قوتیں اس حد تک محدود ہیں کہ کبھی بھی ہم ممکناتِ فطرت کی حد بندی نہیں کرسکتے، جو کچھ واقع ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے اس کا علم تو ہمیں ہے مگر مزید جو کچھ واقع ہونے والا ہے اس کی نسبت ہم صرف ایک توقع قائم کرسکتے ہیں جس کی بنیاد کم و بیش گذشتہ تجربے کے درست سمجھنے پر ہے، جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ مستقبل ماضی کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔[2]

3۔ ولیم جیمس (*William james*) اور معجزات:

ولیم جیمس (William James: 1842-1920) ایک امریکی فلاسفر اور ماہر نفسیات ہیں وہ اپنی کتاب میں معجزات اور عملِ تنویم کے ذریعے رونما ہونے والے معجزاتی عوامل کو اس طرح واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The patient believes everything, which his hypnotizer tells him, and does everything, which the latter commands. Even results over which the will has normally no control, such as sneezing

---

[1] Huxly, H. Hume, Macmillan, New York, p: 153
[2] Huxly, Thomas. *H, Hume*, p: 152-155

secretion, reddening and grow pale, alterations of temperature and heartbeat, menstruation, action of the bowels, ect, may place in consequence of the operators firm assertions during the hypnotic trance, and the resulting convietion on the part of the subject that the effects will occur. Since almost all the phenomena yet to be described are effects of this heightened suggestibility, I will say no more under the general head, but proceed to illustrate the peculierity in detail)[1]

(تنویم کا عامل اپنے معمول سے جو کچھ بھی کہتا ہے اس کو وہ یقین کر لیتا ہے اور جس شے کا حکم کرتا ہے اسے بجالاتا ہے یہاں تک کہ جو چیزیں معمولی حالت میں آدمی کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی عامل کے حکم سے وقوع پذیر ہو سکتی ہیں، جیسے چھینک کا آنا، چہرے کا سرخ یا زرد پڑنا، خون کی حرارت کا زیادہ یا کم ہو جانا، حرکتِ قلب میں تیزی یا سستی کا پیدا ہونا وغیرہ)

4۔ سینٹ آگسٹن *Saint Augustine* اور معجزات:

سینٹ آگسٹن (Saint Augustine: 354-430) جو کہ رومن افریقہ میں عیسائی بشپ رہا اور تھیالوجی و فلسفہ کے میدان کا آدمی تھا اور اس حوالے سے اس کی دو کتب بہت مشہور ہوئیں جن میں اس کی معروف کتاب The City of God بھی شامل ہے۔

معجزات کے حوالے سے موصوف اپنی مذکورہ کتاب میں اپنے نظریات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے کہ یہ عجیب و غریب باتیں یا واقعات ہیں جو انسانی طاقت و قوت کے اختیار و دائرے سے باہر ہیں۔ انسان کے لیے ان اشیاء کے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ اشیاء جو معجزانہ اور ملکوتی انداز میں نظر آتی ہیں ان کا عبادت و ریاضت سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہم اس امر پر ایمان لانے پر مجبور ہیں کہ تمام معجزات جو چاہے فرشتوں سے ظاہر ہوں یا کسی اور وسیلہ سے وہ ہمیں خدائی اطاعت کا درس دیتے ہیں۔ یہ معجزات دراصل ان سے ظاہر ہوتے ہیں جو ہم سے حقیقی طور پر خدائی پیار

[1] James, William, *The Principles of Psychology*, New York 1890,2,/602-603

کرتے ہیں۔ ان مادی معجزات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ آگسٹن مزید کہتا ہے کہ دنیا میں جو عجیب و غریب باتیں آئے روز سامنے آتی ہیں وہ عرضِ خاکی یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں خدا نے تخلیق کیا ہے اس کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر عجیب نہیں ہیں۔ سینٹ آگسٹن Saint Augustine کے ہاں انسانی وجود بذاتِ خود ایک عظیم ترین معجزہ ہے چنانچہ اس حوالے سے وہ کہتا ہے:

> For man himself is a greater miracle than any miracle done through his instrumentality. Therefore,God, who made the visible heaven and earth, does not disdain to work visiblemiracle in heaven or earth, that he may thereby awaken the soul, which is immersed in things visible to worship himself, the invisible. But the place and time of these miracles are dependent on his unchangeable will, in which thinghs future are ordered as if already they were accomplished, for he moves things temporal without himself moving in time.[1]
>
> (انسانی وجود بذاتِ خود ایک عظیم معجزہ کا حامل ہے۔ ان معجزات کے مقابلے میں جو کسی وسیلے سے رونما ہوتے ہیں۔ سینٹ آگسٹین معجزات کی یہ توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ایسے مادی معجزات پسند کرتا ہے کہ جن ذریعہ ان ارواح کو بیدار کرے جو مادہ پرست ہیں اور عبادتِ خداوندی سے غافل ہیں یہ معجزات اس کی لاتبدیل مشیتِ الٰہی کے ذریعہ رونما ہوتے ہیں۔ ان کے بقول کہتا ہے کہ وہ (خداوند کریم) خود متحرک ہوئے بغیر چیزوں کو حرکت میں لاتا ہے)

برصغیر کے جدت پسند مسلم مفکرین کی آراء کا تجزیہ:

عصر حاضر میں بہت سے لوگ جو مسلمان ہیں ان کا ایک طبقہ معجزات کا اس لحاظ سے منکر ہے کہ چونکہ یہ معجزہ عمومی قدرتی قانون کے مخالف ہے لہذا یہ ناممکن الوقوع ہے۔ چنانچہ اس طبقے کے ہاں معجزے کا اقرار عجوبہ پرستی

[1] St. Augustine, *The City of God*, The Modern Liberary, New York, 10/317-318

اور عجوبہ پسندی کے سوا کچھ نہیں۔ حالانکہ معجزے کا انکار در اصل قدرت خداوندی کا انکار ہے جو کہ سراسر ضلالت اور گمراہی ہے۔ چنانچہ معجزات سے انکار خواہ نبی کی مخالفت کی بناء پر ہو یا قانون قدرت کے خلاف ہونے کے باعث ہو یا عصمت انبیاء کے عنوان سے نبی سے معجزہ کے "اتہام" کو دور کرنے کی بناء پر ہو بہر صورت غلط اور ناجائز ہے۔

چنانچہ عقل پرستی یا وحی کے مقابلے میں عقلی تفوق و برتری کی ابتدا دوسری تعلیمات پر صدی بھری میں ہوئی جب ہندوستانی اور یونانی فلسفہ اسلام کی سادہ تعلیمات پر اثر انداز ہو رہا تھا جس نے ایک جانب رہبانیت کی راہ ہموار کی جبکہ دوسری جانب جہمیہ و معتزلہ جیسے عقلیت پسند فرق کو جنم دیا۔ یونانی فلسفے کا سرخیل کو افلاطون اور اس کا ہونہار شاگرد ارسطو کو تصور کیا جاتا ہے۔

جبکہ عقل پرستی کا دوسرا دور تیرھویں صدر یہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہو مگر دوسری صدی ہجری کے مقابلے میں حالات بالکل مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے اور سیاسی لحاظ سے غالب تھے اور جن فلسفوں سے ان کا واسطہ پڑا تھا وہ مفتوح و مغلوب فرقوں کا فلسفہ تھا بایں وجہ ان کا حملہ مسلمانوں پر اجتماعی لحاظ سے بہت ہلکا ثابت ہوا اس کے بر خلاف تیرھویں صدی ہجری میں جب یہ فکری و عقلی یلغار ہوئی تو اس وقت مسلمان ہر لحاظ سے تنزلی کا شکار تھے ان کے ملک پر غیروں کا قبضہ ہو چکا تھا، معاشی لحاظ سے وہ کمزور ہو چکے تھے اور ان کا نظام تعلیم درہم برہم کر کے فاتح قوم نے اپنی تعلیم و تہذیب، اپنی زبان، امنے قوانین اور اپنے اجتماعی سیاسی اور معاشی اداروں کو مکمل طور پر مسلط کر رکھا تھا ایسے حالات میں فاتح اقوام کے فلسفوں اور سائنس نے ان کو معتزلہ کی نسبت ہزار درجہ مرعوب کر دیا اور انھوں نے مغربی افکار و نظریات کو معقول اور متاثر کن سمجھ لیا۔ ان شخصیات میں سے سر سید احمد خان، غلام احمد پرویز، عبد اللہ چکڑالوی، اسلم جے راج پوری، عنایت اللہ اثری اور جاوید احمد غاوری کے معجزات سے متعلق افکار و نظریات اور عقلیت پسندی پر مبنی اشکالات کا ذیل میں جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

1۔ سر سید احمد خان اور معجزات نبویؐ:

برصغیر میں مسلمانوں کی سیاست اور تہذیب کے احیا کے حوالے سے مشہور اور دو قومی نظریے کے بانی سر سید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ کو دہلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ایسے اہم سیاسی خاندان سے تھا۔ انیس برس کی عمر میں محکمہ عدالت کی آسامی پر کام شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ علمی مشاغل اختیار کرنے شروع کئے۔ جس کے نتیجے میں ابتداء "تاریخ فیروز شاہی" اور "آئین اکبری" کی تنقیح کر کے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ ۱۸۴۶ میں "آثار الصنادید" نامی کتاب شائع کی جسمیں دہلی کی تاریخی عمارات، کتبوں، کھنڈرات اور باقیات سے متعلق معلومات جمع کیں اور یوں دہلی کی مختصر تاریخ مرتب کیا۔ اور ۱۸۵۷ کی قریبی زمانہ کی تہذیبی اور علمی صورت حال کو

تحریر کیا۔ ان کی دیگر تصانیف میں خطبات احمدیہ، تہذیب الاخلاق، تفسیر القرآناور مقالات شامل ہیں۔

سر سید احمد خان کا نظریہ مسلمانوں کے حوالے سے یہ تھا کہ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ مغربی و یورپی علوم سے آراستہ ہو کر مغربی تہذیب کو من و عن اپنالیں، چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لیے تحریک علیگڑھ چلائی اور ثانیاً قرآن کریم کی تفسیر کر کے اپنے نظریات کو کھل کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ مذکورہ دونوں اقدامات سے اس وقت کی جدید نسل کے اذہان میں مغربی افکار و نظریات نے جگہ پائی۔

سر سید احمد خان ان تمام مغربی افکار سے شدید متاثر تھے۔ جسکی وجہ سے آپ نے اپنے نظریات کا اعلانیہ پر چار شروع کیا اوراولاً انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے انکار کیایا ان معجزات کی ایسی تاویلات پیش کیں کہ وہ معجزہ معجزہ ہی باقی ہی باقی نہ رہے جبکہ ثانیاً معجزات کے علاوہ دیگر خوارق عادت امور جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان میں بھی اسی قسم کی تاویلات پیش کیں جیسے قبولیت دعا اور جنت و جہنم کی بعض کیفیات وغیرہ کے حوالے سے آپ نے دوراز کار تاویلات پیش کیں۔

اسی طرح انھوں نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے متاثر ہو کر سیدنا آدم علیہ السلام کے فرد واحد ہونے اور انکی نبوت پر اپنے تحفظات پیش کیے۔ اسی طرح فرشتوں اور ابلیس کے خارجی تشخص سے بھی انکار کیاجو کہ بہت سے اجزاءایمان کے بر خلاف ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مسائل حاضرہ کے عنوان پر قلم اٹھاکر جدید تہذیب وثقافت سے ہم آہنگی میں اسلامی عقائد و نظریات کو مد نظر نہیں رکھا اور انکی کوشش رہی کہ اسلام کو نہ صرف جدید بلکہ مغربی انداز میں پیش کیاجائے۔

چنانچہ عقائد دینیہ کے تناظر میں آکر دیکھا جائے تو مسئلہ رویت باری تعالٰی، جبر وقدر، نبوت، ولادتِ عیسی، رفع عیسی اور انبیاء کرام کے معجزات کے حوالے سے سر سید احمد خان کا اپنا جداگانہ موقف ہے جو ان کے تفردات کہلاتے ہیں۔ ذیل میں سر سید احمد خان کے معجزات کے حوالے سے نظربات وافکار کا جائزہ پیش کیاجاتاہے۔

معجزات وکرامات کے حوالے سے سر سید احمد خان نے اپنی تفسیر کہ میں ان الفاظ سے اپنے خیالات کا اظہار کیاہے:

> حکماء وفلاسفہ نے معجزات یاکرامات کا انکار کسی وجہ سے کیاہو مگر ہمارا انکار اس وجہ سے نہیں کہ وہ عقل کے مخالف ہیں جس کی وجہ سے ان کا نکار ضروری ہے بلکہ ہمارا انکار اس بناء پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات وکرامات یعنی ظہور امور کا بطور فرق عادت یعنی فطرت کے خلاف یا خلاف جبلت یاخلاف خلقت یاخلاف قدر الٰہی قدرھااللہ کے امتناع پایاجاتا۔ جسے ہم مختصر الفاظ میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر قانون قدرت کے خلاف واقع نہیں ہوتا اور اس لیے معجزات و

کرامات سے جبکہ ان کے معنوں میں غیر مفید ہونا قانون قدرت کا مراد لیا جائے تو انکار کرتے ہیں اور اگر ان کے معنوں میں یہ بھی داخل کیا جائے کہ وہ قانون قدرت کے مطابق واقع ہوتے ہیں تو صرف نزاع لفظی باقی رہ جاتا ہے کیونکہ جو امر کہ واقع ہوا اور جس شخص کے ہاتھ سے واقع ہوا اسی کو ہم دونوں تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اس کا نام معجزہ یا کرامات رکھتے ہیں ہم اسکا یہ نام نہیں رکھتے۔[1]

مذکورہ بالا الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سر سید احمد خان قرآن کریم سے معجزات و کرامات کے ثبوت کو غلط قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ معجزات نبوی ﷺ کے بارے میں سر سید احمد خان ان الفاظ میں اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

آنحضرتؐ کے پاس جو افضل الانبیاء والرسل ہیں معجزہ نہ ہونے کے بیان سے ضمناً یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین علیہم السلام کے پاس بھی بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے در حقیقت وہ معجزات نہ تھے بلکہ وہ واقعات تھے جو مطابق قانون قدرت کے واقع تھے۔ خاتم النبیین علیہ الصلاۃ والسلام نے جو اس بات کو کھول دیا اور چھپا لُکا نہیں رکھا جسکا اصلی سبب یہ ہے کہ بڑا جزو اسلام کا جسکے سبب اسکو خطاب "الیوم اکملت لکم دینکم" اور جس کی وجہ سے محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیل تلقین توحید ذات باری تعالٰی کی ہے جو توحید ثلاثہ میں منحصر ہے یعنی توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی العبادت۔[2]

اسی طرح اپنی تفسیر میں ایک دوسرے مقام پر معجزات کے حوالے سے سر سید احمد خان یوں رقمطراز ہیں:

انبیاء علیہم السلام میں معجزات کا (علی المعنی المدحارفہ) یا اولیاء اللہ میں کرامات کا یقین کرنا (گو کہ اعتقاد کیا جاوے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت انہیں دی ہے) توحید فی الصفات کو نامکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت اور کوئی بزرگی اور کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام کی اور بانی اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو اس نے بغیر کسی لاؤلپیٹ کے اور بغیر کسی دھوکا دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ و کرتوت کا دعویٰ کرنے سے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ معجزے و عجزے تو خدا کے پاس ہیں میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں اور خدا نے میرے دل میں جو وحی ڈالی ہے اسکی

---

[1] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، مطبوعہ دوست ایسوسی ایشن، لاہور 1994، 3\33

[2] ایضاً، 3/34

میں تم کو تلقین کرتا ہوں۔[1]

مندرجہ بالا اقتباسات سے سر سید احمد خان کے معجزات کے بابت افکار و نظریات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کس انداز سے معجزات کا انکار کیا۔ انھوں نے قرآن میں حب لاتعداد معجزات دیکھے تو حیران رہ گئے اور پھر انھوں نے یا تو سرے سے سی ان معجزات کا انکار کر کے حق تعالیٰ کو اختیار و قدرت کی کرسی سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اور ان معانی کا کھلم کھلا انکار کیا جو منشاء خداوندی خداوندی کے مطابق ہیں جبکہ بعض مقامات پر آیات و الفاظ قرآنی کی ایسی مضحکہ خیز تاویلات پیش جسکی بنیاد بناء پر قرآن کریم کر میں کوئی معجزہ ان کو دکھائی نہ دیا اور یا سرے سے ہی انکار کر ڈالا۔

ذیل میں انبیا کرام علیہم السلام کے معجزات کے حوالے سے آیات قرآنی کے ذیل میں موصوف کی بیان کردہ تفسیر و توضح ملاحظہ ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے آگ میں ڈالے جانے کے حوالے ہے۔ سر سید احمد خان کا موقف یہ ہے کہ انکو آگ میں نہیں ڈالا گیا تھا بلکہ یہ فقط کفار کی تدابیر اور کوششوں تک محدود رہا۔ جبکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ o وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ﴾[2]

(ھم نے کہا اسے آگ ٹھنڈی ہو جا ٹھنڈی ہو جا ابراہیم کے اوپر اور سلامتی والی ہو جا، ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے تدبیر کی سو ہم نے انہیں ناکام بنا دیا)

چنانچہ قرآن کریم کے مفہوم اور مفسرین کرام کی صراحت کے مطابق کفار نے یہ تدبیر کی کہ حضرت ابراھیم کو آگ میں جھونک دیں مگر سر سید احمد خان اس سے انکاری ہیں۔ جب ایسا نہیں ہوا تو پھر یہاں آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور جب قرآن کریم یہ صراحتا کہتا ہے کہ حرفوں تو اس کا مطلب ہے کہ ضرور انھوں نے اسے جلانے کی کوشش کی تھی۔ سلف صالحین کی تفاسیر پہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ طور پر ان کے جلانے کے لیے بڑی آگ کا آلاؤ روشن کیا اور اس مقصد کے لیے پورا ایک مہینہ وہ لکڑیاں اکٹھی کرتے رہے جسکے نتیجے میں ایک ہفتے تک بڑی آگ روشن کی۔ جسکے شراروں کی بلندی آسمان کو چھونے لگی یہاں تک کہ اس آگ کے اوپر سے

---

[1] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 3/34

[2] الانبیاء:69-70

کوئی پرندہ اڑ نہیں سکتا تھا پھر انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق پر بٹھا کر دور سے اسمیں پھینک دیا ہے۔[1] چنانچہ حضرت ابراھیم سات یوم تک اس آگ میں رہے اور آپ فرماتے تھے مجھے زندگی بھر اتنی راحت و سکون کبھی نہیں نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں ملی ہے۔[2]

اسی طرح قرآن کریم میں اصحاب فیل کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَٰبِ ٱلْفِيلِo أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِى تَضْلِيلٍo وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَo تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍo فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴾[3]

(کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کے مکر کو بے کار نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا)

مذکورہ سورۃ کی تفسیر میں جملہ مفسرین نے وہی کچھ بیان کیا ہے جو عموما معروف ہے۔ جیسا کہ روح المعانی میں ہے کہ جیسا کہ روح المعانی میں ہے کہ جب ابرہہ نے ہاتھیوں کی مرد سے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیجے۔ یہ پرندے دراصل درندوں کی مانند تھے نہ اس سے پہلے کبھی ایسے پرندے دیکھے گئے اور نہ ہی اس کے بعد۔ ان پرندوں کی چونچوں اور پنجوں میں پتھر (کنکریاں) تھے، یعنی چونچ اور پنجے دونوں میں ایک ایک کنکری تھی اور ہر کنکری پر اس شخص کا نام لکھا تھا کہ جسکو یہ کنکری لگنے والی تھی۔

یہ پرندے جو مثل "سباع" درندوں کے تھے ان پر کنکری گراتے تھے جو اُن کے سر میں داخل ہوئی اور نیچے نکل جاتی جسکی وجہ سے یہ کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہو جاتے تھے۔[4] سر سید احمد خان اس تفسیر کی تاویل ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وباء پھیل گئی تھی جسکی وجہ سے وہ فوج ہلاک ہو گئی۔[5]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب چیچک کی وباء پھیل چکی تھی تو کیا اسکے باعث صرف ابرہہ کے شکر نے ہی ہلاک ہونا تھا اور اس مرض نے اہل مکہ میں سے کسی کو کچھ نہیں کہا؟ اور پھر یہ کہ ہاتھیوں کے بارے میں تو کبھی تاریخ

---

[1] آلوسی، شہاب الدین، روح المعانی، دار احیاء التراث الاسلامی بیروت، 1986ء، 4/252

[2] محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، دار الاشاعت کراچی، 2010، 6/202

[3] الفیل: 1-5

[4] آلوسی، روح المعانی، 8/536

[5] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 4/138

میں چیچک کی بیماری کا تذکرہ نہیں آیا ہے۔ تو ہاتھیوں میں یہ مرض کیسے پھیل گیا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں پر لفظ حجارۃ کو چیچک کے معنی میں استعمال کیا ہے جبکہ سورۃ بقرہ سمیت قرآن میں مختلف مقامات پر جمارہ کا معنی پتھر ہی بیان کرتے ہیں۔

اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے معجزے عصا اور یہ بیضاء کے حوالے سے سر سید احمد خان لکھتے ہیں۔ ان آیتوں پر جو عصائے موسیٰ کے سانپ بننے اور یہ بیضاء پر پر دلالت کرتی ہیں غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسی پر طاری ہوئی اسی قوت نفس انسانی کا ظہور تھا جسکا اثر خود ان پر ہوا تھا۔ یہ کوئی معجزہ یا مافوق الفطرت کام نہ تھا یعنی موسی نے عصا کو سانپ تصور کیا کہ شاید اس نے سانپ دیکھا ہے اور اسی طرح ہاتھ بھی اسکے خیال کے مطابق اسکو سفید نظر آیا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزے کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کروائی جاتی ہو۔ حضرت موسی باعتبار جبلت و فطرت وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینک دی اور وہ ان کو سانپ یا اژدھا دکھائی دی۔ یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا۔ وہ لکڑی لکڑی ہی تھی اس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خدا نے اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ "فانقلبت العصا ثعباناً (یعنی وہ لاٹھی بدل کر سانپ ہو گئی)، بلکہ سورۂ نمل میں فرمایا:

{ كَأَنَّهَا جَآنٌّ } (یعنی وہ گویا اژدھا تھا)

اس سے ظاہر ہے کہ وہ در حقیقت اژدھا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ لاٹھی کی لاٹھی ہی تھی۔[1]

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو سر سید احمد خان کے اس معجزے کی تاویل پر یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ قوت باطنی اور قوت نفسانی یا قوت مقناطیسی کے وجود سے انکار نہیں ہے۔ اور اس قوت کو حاصل کرنے والے عامل دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکتے ہیں مگر ان کا خود اا پنے ہی عمل سے متاثر ہونا یہ ناممکن الوقوع چیز ہے اور یہ چیز بھی قابل تسلیم ہے۔ کیا ایسا بھی کوئی عامل ہو سکتا ہے کہ جو دوسروں پر اپنا اثر یا توجہ ڈالے مگر اس چیز پر تو کچھ بھی اثر نہ ہو اور الٹا عامل پر ہی وہ اثر پڑنا شروع ہو جائے اور کیا عامل اسلیئے عمل کرتے ہیں کہ ان کے اپنے ہی اوسان خطا ہو جائیں؟ گویا حضرت موسیٰؑ کی اس قوت مقناطیسی سے عصاء کی لکڑی پر تو کچھ اثر نہ ہوا الٹی انکو ہی وہ اژدھا نظر آنے لگی۔ پھر وہ اس سے اس قدر خوفزدہ بھی ہوئے کہ پیچھے ہٹنے لگے۔ کیا کوئی ایسا عمل بھی کرتا ہے جس کا فائدہ تو کچھ نہ ہو الٹا عامل کو ہی

---

[1] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 3/152

نقصان پہنچ پائے۔ اسی طرح نوع انسانی میں سر سید احمد خان ارتقاء کے اصول کو کو تسلیم کرتے ہیں مگر کسب کمال یا فن کے سلسلے میں یہ اصول قطعی طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں۔

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ موسیٰؑ کی قوت یا مقناطیسی اثر جو کچھ بھی تھا خواہ وہ حقیقی طور پر اژدھا بن گیا تھا یا بقول آپ کے وہ لکڑی ہی رہا، مگر آپ نے اسکو اژدھا ہی سمجھ لیا اور پھر وہ ڈر بھی گئے۔ یہ زندگی بھر کا پہلا مقناطیسی اثر یک لخت کیسے ظاہر ہوا۔ یہ مقناطیسی قوت ابتدائے پیدائش سے ہی موسیٰؑ میں موجود تھی یا وحی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ اگر پہلے سے موجود بھی تو پہلے بھی کوئی چھوٹا موٹا واقعہ ضرور دریافت ہونا چاہیئے۔ یہ تو عقلی اعتراضات تھے جہاں ایک نقلی اعتراضات کا تعلق ہے۔ تو اس کے بارے میں یہ صراحت ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے ان کے عصا کے متعلق یوں فرمایا تھا:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَٰمُوسَىٰ ۔ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُاْ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَأَرِبُ أُخْرَىٰ۔ قَالَ أَلْقِهَا يَٰمُوسَىٰ۔ فَأَلْقَىٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ۔ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا ٱلْأُولَىٰ۔ وَٱضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ ءَايَةً أُخْرَىٰ ﴾[1]

(اے موسی تیرے اس دائیں ہاتھ میں کیا ہے ؟ جواب دیا۔ کہ یہ میری لاٹھی ہے جس پر ٹیک لگاتا ہوں اور جس سے میں اپنی بکریوں کے لیے جھاڑ لیا کرتا ہوں اور بھی اس میں میرے لیے بہت سارے فوائد ہیں۔ فرمایا اسے موسی ! اسے ہاتھ سے نیچے ڈال دے۔ ڈالتے ہی وہ سانپ بن کر دوڑنے لگی۔ فرمایا بے خوف ہو کر اسے پکڑ لے۔ ہم اسے اسی پہلی صورت میں دوبارہ لادیں گے۔ اور ہاتھ اپنی بغل میں ڈال لے تو وہ سفید چمکتا ہوا ہو کر نکلے گا لیکن بغیر کسی عیب کے، یہ دوسرا معجزہ ہے)

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر لکڑی لکڑی ہی رہی تھی تو اس کو پہلی حالت پر لانے سے کیا مراد ہے؟ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرمادیتے کہ آپ کی مقناطیسی قوت میں کمی کر دیں گے یا چھین لیں گے تاکہ تمہیں یہ لکڑی ہی نظر آئے۔ سیرت تو سر سید احمد خان کے بقول عصا کی نہیں بلکہ موسیٰؑ کی بدلنی چاہیئے تھی ۔اسی طرح سر سید احمد خان موسیٰؑ کے معجزہ ید بیضاء کے حوالے سے کبھی یہ موقف رکھتے ہیں کہ وہ صرف دیکھنے والوں کو ہی سفید نظر آتا تھا ورنہ انہیں کوئی مافوق الفطرت بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] طٰہٰ:17-22

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عصائے موسی کا اژدھا بننا اور ہاتھ کا چٹا ہو جانا بھی اسی طرح قوت نفسانی کا اثر تھا جس طرح کہ فرعون کے جادوگروں کی رسیاں بھی سانپ دکھائی دیتی تھیں تو خدا نے عصائے موسیٰ اور ید بیضاء کو فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَّبِّكَ[1] (پس یہ دونوں معجزے تیرے لیے تیرے رب کی طرف سے ہیں)۔

یعنی ان کو خدا کی جانب سے برھان کیوں فرمایا ہے؟ پھر اسکی وجہ یہ بتلائی کہ برھان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عصائے موسی کا اژدھا مرئی ہونا یا ہاتھ کا چٹا دکھائی دینا فرعون اور اسکے سرداروں پر بطور حجت الزامی کے تھا۔ وہ اس قسم کے امور کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ جس شخص سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے اور اسی سبب سے انہوں نے کہا کہ اگر کرشمہ دکھایا جائے گا تو وہ دعوی کو نیچا جائیں گے۔[2]

مندرجہ بالا عبارت یہ بتا رہی ہے کہ سر سید صاحب کی نظر میں عصائے موسی اور ید بیضا معجزے نہیں بلکہ کرشمے تھے، جو فرعونی جادوگروں کے کرشموں سے بڑے تھے۔ اسی لیے خدا نے ان کو برہان کہا ہے، تو اسکا دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) اللہ ساحرین فرعون سے بڑھ کر ساحر تھے اور صرف درجہ کا فرق تھا۔ اقدیہی فرعون کا گمان تھا۔ اس نے بھی یہی کچھ کہا تھا کہ:

﴿اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾[3]

(بے شک یہی تمہارا وہ بڑا بزرگ ہے جس نے تم سب کو جادو سکھلایا ہے)

گویا کہ سر سید احمد خان بالفاظ دیگر اسی کی تصدیق فرما رہے ہیں۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے (وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى)[4] (اور جادوگر جہاں کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا) فرما کر مردود قرار دیدیا۔ چنانچہ اسطرح کی تاویلات سے قرآن کریم کا اصل مفہوم تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر موسی علیہ السلام کا ایک اور معجزہ ذکر فرمایا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾[5]

(اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور تمہیں اس سے پار کر دیا اور فرعونیوں

---

[1] القصص:32

[2] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 3/365

[3] طہ:71

[4] طہ:69

[5] البقرۃ:50

کو تمہاری نظروں کے سامنے اسمیں ڈبو دیا)

اسی طرح اس سے ایک اللہ مقام پر ارشاد ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى﴾[1]

(اور ہم نے موسی کی طرف وحی نازل فرمائی کہ تو راتوں رات میرے بندوں کو لے چل اور ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنالے پھر نہ مجھے کسی کے آپکڑنے کا خطرہ ہو گا نہ ڈر)

چنانچہ ان دونوں مقامات پر مفسرین فرماتے ہیں کہ جب موسی علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر راتوں رات نکلے اور فرعون ان کے تعاقب میں نکلا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحکم الہی اپنے عصا کو سمندر پر مارا تو وہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ درمیان میں خشک راستہ پیدا ہو گیا۔ سمندر کے دونوں حصے بڑے پہاڑ کی مانند کھڑے ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے تو دریا پار کر لیا اور جب فرعون اور اسکے شکری داخل ہوئے تو دریا جاری ہو گیا جس کے باباعث فرعون اور اسکا شکر غرق ہو گیا۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب فرعون اور اسکے لشکر سمندر پر پہنچ گئے اور اور موسی کے بنائے ہوئے راستے میں داخل ہو گئے، انہوں نے جب سمندر کو پھٹا ہوا دیکھا تو حیرت و استعجاب کا مظاہرہ کیا، فرعون نے کہا کہ یہ تو میری ہیبت اور دبدبہ کے باعث منفلق ہوا ہے جبکہ دل میں خود خوفزدہ تھا کہ کہیں واقعی غرق نہ ہو جاؤں کیونکہ سمندر نے تو موسیٰ کو بحکم خداوندی راستہ دیا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا، جبرئیل گھوڑی پر سوار ہو کر پہلے ہی سمندر میں کود پڑے جن کی دیکھا دیکھی پورا لشکر اتر آیا۔ موسی علیہ السلام صحیح سالم دریا کے پار پہنچ گئے جبکہ فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں ہی غرق ہو گئے۔[2] یہاں سر سید احمد خان اس مقام کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ:

(نہ کوئی دریا پھٹا اور نہ کوئی خلاف عادت معجزہ ظہور میں آیا تھا بلکہ اس دریا کی سمندر کی طرح عادت تھی کہ مد و جزر چڑھنا اترنا طغیانی آناً فاناً اسمیں ہوا کرتا تھا۔ پس جب رات کو موسی بنی اسرائیل سمیت گزرے تھے تو تب خشک تھا۔ اور جب فرعون گزرنے لگا تو اتفاقاً چڑھ گیا)[3]

موصوف کی اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ گویا ایسے اندازے بھی لگائے جاسکتے ہیں کہ جن کے کوئی دلائل و

---

[1] طٰہٰ:77

[2] آلوسی، شہاب الدین، روح المعانی، 5/33

[3] سر سید، احمد خان، تفسیر القران، 1/162

قرائن تک نہ پائے جائیں۔ کیونکہ اس بات کو تو ہر کوئی جانتا ہے کہ مد و جزر کے تو اوقات مقرر ہیں، ان کے عوامل ہوتے ہیں جو عوام میں مشہور ہیں۔ اور مورو جزر میں تو صرف پانی کا اتار چڑھاؤ ہی ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے "یبساً" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب پر ہے کہ خشک ہونا۔ فرعون اور اسکا لشکر بخوبی جانتا تھا کہ اس سمندر میں کیا کچھ ہوتا ہے کیونکہ وہ وہاں کے باشندے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا پھاڑ دیا اسکو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک نعمت و احسان قرار دیا ہے جبکہ فرعونیوں سے بنی اسرائیل کو نجات دلوانے کو بھی ایک عظیم احسان قرار دیا ہے اور اگر ایسا محض اتفاقات پر مبنی ہوتا تو رب کریم اس احسان کا ذکر نہ فرماتے۔ اسی طرح حضرت عیسی علیہ اسلام جو کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے انکی پیدائش بذات خود ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْ ﴾[1]

(بیشک اللہ رب العزت کے ہاں عیسی علیہ السلام کی مثال آدم علیہ اسلام کی مانند ہے جسکو مٹی سے پیدا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا پس وہ ہو گیا)

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جو مٹی سے پیدا کیا تو یہ ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بغیر باپ کے بھی تخلیق پر قادر ہے جس کی مثال پیدائش عیسیٰؑ ہے۔ اور قرآن کریم اس پر دلالت کرتا ہے۔

﴿ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْہًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ۔ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَہْدِ وَکَہْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْ ﴾[2]

(جب کہا فرشتوں نے کہ اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو دنیا و آخرت میں عزت والا ہے۔ اور میرے خصوصی بندوں میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے اپنے بچپن اور بڑی عمر میں باتیں کرے گا اور وہ نیکو کار لوگوں میں سے ہو گا۔ مریم نے کہا اے اللہ میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟ حالانکہ مجھے تو

---

[1] ال عمران:59

[2] ایضاً:45-47

کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا، فرشتے نے کہا کہ ایسے ہی اللہ رب العزت جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں، وہ جب بھی کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ہو جا بس وہ کام ہو جاتا ہے)

مذکورہ آیات واضع طور پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالی نے حضرت عیسی کو بغیر والد کے بطنِ مریمؑ سے پیدا کیا کیونکہ جب فرشتوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ اللہ تعالی مجھے ایک بچے سے نوازنے والا ہے تو وہ ورطہ حیرت میں مبتلا ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ یارب نہ تو میں نے تزوج اختیار کیا ہے اور نہ ہی مجھے کبھی کسی بشر نے چھوا ہے پھر کیسے میرے ہاں بچے کی پیدائش ہو گئی؟ تو اللہ تعالٰی نے جواباً فرمایا کہ یہ بچے کی تخلیق حرف قدرت خداوندی سے ہی ہو گئی اور اللہ کی قدرت کاملہ بعد شوہر سے بچے کی تخلیق سے قاصر نہیں ہے۔

یہ آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ پیدائش عیسوی ایک معجزہ تھا اور نہ صرف پیدائش بلکہ عیسیٰ کا اس دنیا سے آسمان کی جانب اٹھایا جانا بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ اللہ نے بغیر باپ کے ایک کامل انسان کی تخلیق صرف ماں سے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ تاکہ ہر گوشہ بھی خالی نہ رہے اور یوں عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر زندہ اٹھائے جانے کے حوالے سے اللہ رب العزت قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾[1]

(جب اللہ تعالٰی نے یہ کہا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں پورا لینے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور تیرے متبعین کو کفار پر غالب کرنے والا ہوں تا یوم قیامت، پھر تم سب کا لوٹنا میری ہی جانب ہے پس میں ہی تمہارے مابین جملہ اختلافات کا فیصلہ کروں گا)

یہاں آیت مذکورہ میں لفظ متوفی کا مصدر "توفی" اور مادہ "وفی" ہے جسکے معانی اصلاً با اعتبار عربی لغت "پورا پورا لینے" کے ہیں۔ وفاء، ایفاء اور استیفاء کے الفاظ اسی معنی کے لیے بولے جاتے ہیں۔ اور توفی کا بھی اصل معنی پورا پورا لینے کے ہیں جسپر تمام عربی کتب لغات شاہد ہیں۔ اور چونکہ بوقت موت انسان اپنی اصل مقدر پوری کر لیتا ہے۔ اور اللہ تعالی کی

---

[1] آل عمران:55

جانب سے عطا کردہ روح پوری واپس لے لی جاتی ہے۔ اسی کی مناسبت سے ہر لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اور اسی موت کا ہلکہ سانمونہ روزانہ انسانی نیند ہے جسکے لیے قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ ﴾[1]

(اللہ تعالیٰ ہی روحوں کو انکی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی انکو انکی نیند کے وقت قبض کرتا ہے)

یہاں لفظ توفی "عربی لغت میں " قبض کرنے اور استیفاء" کے معنی میں ہیں جسکے اس لحاظ سے چار اقسام کے معانی بنتے ہیں۔

1. نیند میں موت کی کیفیت کا عارضی طور پر طاری ہونا۔
2. موت کا آجانا
3. روح اور جسم دونوں کا وفات پانا
4. "توفی" مر جانے اور روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے اور یہی اسکا عمومی استعمال ہے۔ یا اسی طرح یہ استیفاء اور جاں بحق ہونے کے معنی میں ہے۔[2]

اسی وجہ سے آیت مذکورہ میں لفظ "متوفیائے "کا ترجمہ بعض مفسرین نے "پورا لینے " سے کیا ہے جب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہم آپؑ کو یہودیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے بلکہ خود آپ کو لے لیں گے جسکی صورت یہ ہو گی کہ اپنی طرف اوپر آسمان پر اٹھالیں گے۔

بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "موت دینے" سے کیا ہے اور یہی ترجمہ عبد اللہ بن عباس سے اسانید صحیحہ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے مگر وہاں اسکے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت جب کہ یہودی آپؑ کے قتل کے ارادے سے تھے آپ کی تسلی کے لیے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ اول یہ کہ آپ کی موت ان کے ہاتھوں سے قتل کرنے کی صورت میں نہیں بلکہ طبعی موت کے طور پر ہو گی۔ دوم یہ کہ اس وقت ان لوگوں کے نرغہ سے نجات کی صورت یہ ہے کہ ہم آپ کو اوپر اپنی جانب اٹھالیں گے، یہی تفسیر ابن عباس سے منقول ہے۔ چنانچہ اسحاق بن بشیر اور ابن عساکر نے جوہر جوم عن الضحاک سے ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ آیت

---

[1] الزمر:52

[2] الطلبات، ابو البقاء، الکفوی، دار العلم بیروت 1981، ص 221

"انی متوفیک ورافعک الي" کی تفسیر میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اٹھالوں گا اور پھر آخری زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دی جائے گی۔[1]

چنانچہ " توفی" کے معانی موت کے ہیں لیکن یہاں الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے "رافعک" کا پہلے اور "متوفیک" کا بعد میں وقوع ہو گا اور یہاں "متوفیک" کو مقدم کرنے کی حکمت و مصلحت اس پورے معاملے کی جانب اشارہ کرنا ہے جو آگے ہونے والا ہے۔ یعنی یہ اپنی جانب بلا لینا ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ کچھ عرصے تک ہو گا اور پھر آپؑ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور دشمنوں پر غلبہ پائیں گے۔ اور بعد میں آپؑ کی طبعی موت واقع ہو گی، یوں دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ بھی ایک معجزہ ہوا بھی ہو گا اور سیدنا عیسیٰ کے اعزاز و اکرام کی تکمیل بھی کی اسکے علاوہ یہاں عیسائیوں کے الوہیت کے عقیدے کا بھی ابطال تھا وگرنہ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعہ سے ان کا یہ عقدہ باطل و مزید پختہ ہو جاتا کہ وہ بھی حق تعالیٰ کی مانند حیّ و قیوم ہیں۔ بائیں وجہ پہلے " متوفیات" کا لفظ ارشاد دورہ کر ان تمام خیالات کو باطل ثابت کر کے پھر اپنی جانب بلائے جانے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ یہاں "ورافعک و الي" سے کچھ لوگوں نے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ رفع صرف روحانی ہوا نہ کہ جسمانی، یہ بھی غلط ہے اسلئے کہ عیسیٰؑ صرف روح کا نہیں بلکہ روح مع الجسد دونوں کا نام ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر بھی ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْ ﴾[2]

(اور ان یہودیوں نے یقیناً حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ انکو اللہ نے اپنی جانب اٹھالیا)

چنانچہ اپنی طرف اٹھالینا روح مع الجسد کے زندہ اٹھانے کے لیے ہی بولا جاتا ہے۔ دنیا میں فقط یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مقتول و مضطرب ہو کر مدفون کر دیئے گئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے۔[3]

اور ان کے اس غلط نظریئے کی تردید قرآن کریم نے کر دی جو سورہ نساء کی مذکورہ آیات میں دینا ہے۔ اور اس کے ساتھ و مکرد، و مکر اللہ فرما کر بھی اس جانب اشارہ کر دیا گیا کہ اللہ نے عیسیٰؑ کے دشمنوں کے داؤ و تدبیر کو خود انہی کی جانب لوٹا دیا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے لیے مکان کے اندر گئے تھے اللہ نے انہی میں سے ایک آدمی کو شکل و صورت بدل کر صورت عیسوی میں ڈھال دیا اور حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر زندہ اٹھالیا۔[4]

---

[1] السیوطي، جلال الدین، الدر المنثور في التفسیر المأثور، دار الأحیاء التراث الأسلامي، بیروت، 2/172

[2] النساء:157-158

[3] استثناء باب 21 آیت 21، 23

[4] محلی، جلال الدین، تفسیر جلالین، دار الأحیاء التراث الأسلامي بیروت، 1/157

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾[1]

(اور نہ انھوں نے عیسیٰؑ کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا)

اسی طرح یہاں عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰؑ مقتول و مصلوب تو ہو گئے لیکن پھر دوبارہ زندہ کر کے ان کو آسمان پر اٹھالیا گیا۔ لیکن مذکورہ آیت نے انکے بھی اس وہ غلط خیال کی تردید کر کے یہ بتلا دیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے عیسائیوں کو بھی یہ دھوکہ لگا کہ مقتول حضرت عیسیٰؑ ہیں لہذا یہاں "شُبِّہَ لھم" کا مصداق یہود کے ساتھ ساتھ نصاری بھی ہو گئے۔ جبکہ مسلمانوں کا اس بابت کہی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لیے آسمان پر زندہ اٹھالیا گیا نہ ہی انھیں قتل کیا گیا نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، بلکہ وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کہ یہودیوں پر فتح پائیں گے اور پھر آخر میں طبعی موت اس جہاں سے رخصت ہوں گے۔

اس عقیدہ پر تمام امت مسلمہ کا اجتماع و اتفاق ہے اور قرآن کریم کے متعدد مقامات پر آیات سے یہ عقیدہ اور اس پر امت کا اجماع ثابت ہے اور کسی کو اس سے انکار نہیں۔[2]

مذکورہ بالا پیدائش و رفع عیسیٰؑ اور نزول عیسیٰؑ کے حوالے سے قرآن کریم کے تفصیلی دلائل ذکر کرنے کے بعد اب سر سید احمد خان کا حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں ان کی تفسیر میں ذکر کردہ موقف ملاحظہ ہو۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> قرآن کریم نے اس بات میں کہ عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے تھے کوئی بحث نہیں کی۔ جب قرآن نازل ہوا اس وقت دو فرقے مخالف موجود تھے ایک فرقہ نہایت نالائقی اور بدی سے یہ کہتا تھا کہ حضرت مسیح بطور ناجائز مولود کے پیدا ہوئے جبکہ دوسرا فرقہ یہ کہتا تھا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے اور ثالث اور ثلاثہ ہیں۔ قرآن کریم نے ان دونوں فرقوں کے اعتقاد کو رد کر دیا اور حضرت مسیح کے مقدس اور روح پاک ہونے پر اور حضرت مریم کی عصمت و طہارت پر گواہی دی اور اس بات کو کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے اور ثالث ثالاثہ ہیں جھٹلا دیا اور بتلا دیا کہ وہ مثل اور انسانوں کے خدا کے بندے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں بیان ہوا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔[3]

---

[1] النساء:157

[2] العسقلانی، ابن حجر، تلخیص التحبیر، دار العلم بیروت، ص319

[3] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 2/24

اسی طرح دوسرے مقام پر سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

"لفظ کن فیکون" جو کہ سورۃ آل عمران میں ہے وہ کسی امر کے ہونے پر بلاسباب قدرتی و فطری کے دلالت نہیں کرتا کیونکہ ہر شے سے ہونے کو خدا اسی طرح فرماتا ہے کہ:

﴿اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْ ﴾[1]

(پس ہر شے "کن" کے حکم سے ہمیشہ قانون قدرت اور قاعدہ فطرت کے مطابق ہوتی ہے)

پس یہ الفاظ کسی طرح اس بات پر کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت فی الفور بلا قاعدہ فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی دلالت نہیں کرتے۔ "ایتہ للناس" کے لفظ سے یہ سمجھنا کہ حضرت مسیح کو باپ کے بغیر بطور ایک نشانی معجزہ کے پیدا کیا تھا محض بے جا ہے۔[2] اسی طرح وہ عیسیٰؑ کے بغیر باپ اور مریم کے بغیر شوہر کے قرآنی الفاظ کی نفی یوں ان الفاظ میں کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> اس کے بعد ہے "محملہ" پس اس حرف "ف" سے جو "حملہ" پر ہے یہ لازم نہیں آتا کہ بمجرد اس گفتگو کے حضرت مریم حاملہ ہوگئی تھیں۔ بلکہ پایا جاتا ہے کہ اس گفتگو کے کسی زمانہ مابعد میں وہ حاملہ ہوئیں۔ جس وقت کی یہ گفتگو ہے بلاشبہ حضرت مریمؑ کو کسی بشر نے نہیں چھوا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کا خطبہ یوسف سے ہوا اور وہ حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں)[3]

اسی طرح سورۃ آل عمران کی آیت{ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ}کے حوالے سے بھی سر سید راقمطراز ہیں کہ:

(اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰؑ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں)[4]

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے نظریہ وفات کو اپنی تفسیر کے اقتباسات سے سر سید ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

> پہلی تین آیتوں سے (اٰل عمران: ۴۸، المائدہ: ۱۱۷، مریم: ۳۲، ۳۳، ۳۴) سے حضرت عیسیٰؑ کا اپنی موت سے وفات پاجانا اعلامیہ ظاہر ہے مگر جو علمائے اسلام نے یہ تقلید بعض فرق نصاریٰ کے قبل اس کے کہ مطلب قرآن مجید پر غور کریں۔ یہ تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر

---

[1] یٰسین:82

[2] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 2/28،27

[3] ایضاً، 2/30

[4] أیضا: 2/32

چلے گئے ہیں اسلے انھوں نے ان آیتوں کے بعض الفاظ کو اپنی غیر محقق تسلیم کے مطابق کرنے کی بے جا کوشش کی ہے۔ پہلی آیت میں صاف لفظ "متوفیک" کا واقع ہے جس کے معنی عموماً ایسے مقام پر موت کے لیے جاتے ہیں جو قرآن میں اسکی تفسیر پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾[1]

ابن عباس اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بھی جیسا کہ تغیر کبیر میں لکھا ہے "متوفیک کے معنی ممیتک" کے ہیں۔ یہی حال لفظ "توفیتنی" کا ہے جو دوسری آیت میں ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تو نے مجھ کو موت دی یعنی جب میں مر گیا اور انہیں نہیں رہا تو تو ان کا نگہبان تھا۔ پہلی آیت ہیں اور چوتھی آیت میں، لفظ "رفع" کا بھی آیا ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کی قدر و منزلت مقصود ہے نہ یہ کہ ان کے جسم کو اٹھا لینے کا۔[2] اسی طرح فرید لکھتے ہیں کہ:

حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں نے نہ سنگسار کیا نہ صلیب پر قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا۔[3]

اسی طرح اس حوالے سے اپنی تفسیر میں سر سید احمد خان مزید لکھتے ہیں:

ان آیتوں میں ایک اور لفظ بھی غور کے قابل ہے یعنی "مادمت فیم" (المائدہ:۱۱۷) اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تک میں زندہ تھا اور اسکی سند خود قرآن مجید کی دوسری آیت میں موجود ہے۔ جہاں فرمایا ہے "مادمت حیا" (مریم:۳۱) پس صاف ظاہر ہے کہ جو مطلب "حیا" کے ہیں وہی معنی "فیھم" کے ہیں۔ اس کے بعد "فلما توفیشنی" تو اس سے اور بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ سے حیا ہی مراد تھی اور مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ جب تک میں ان میں تھا یعنی زندہ تھا تو میں اس پر شاہد تھا اور جب تو نے مجھے موت دی تو تُو ان کا نگہبان رہا۔ پس ان دونوں آیات میں اس دنیا میں ہی حضرت عیسیٰؑ کا زندہ رہنا اور اس دنیا ہی میں اپنی موت سے مرنا بخوبی ظاہر ہوتا ہے[4]

چنانچہ مذکورہ تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ سر سید احمد خان حضرت عیسی علیہ السلام کے بغیر باپ کی پیدائش

---

[1] الزمر:75

[2] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 2/32

[3] ایضاً، 2/42

[4] أیضا، 2/45

کے قرآنی عقیدے کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی وہ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر رفع اور نزول کے قائل ہیں۔ بلکہ اسکے علاوہ بھی ان کی تفسیر میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں وہ معجزات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔

چنانچہ قرآن کریم میں کئی ایسے مقامات میں دیگر معجزات حضرت عیسیٰؑ کا ذکر آتا ہے کہ وہ مردوں کو باذن اللہ زندہ کیا کرتے تھے اور مادرزاد اندھوں کو باذن اللہ بینا کر دیتے تھے، کوڑھیوں کے مرض کو دور کر دیتے تھے، پرندوں کی مٹی سے شکلیں بنا کر اسمیں پھونک مارے تو وہ اللہ کے حکم سے زندہ پرندے بن جاتے تھے۔ وہ لوگوں کو یہ بھی بتلاتے تھے کہ تم نے کیا کھایا اور کیا کچھ گھر میں رکھا، وغیرہ وغیرہ، لیکن سرسید احمد خان اس حوالے سے کہتے ہیں کہ علمائے اسلام اپنی عادت کے موافق قرآن کریم کے معانی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ لہذا انھوں نے ان آیات کے معانی بھی ویسے ہی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے اور مردوں کو جلا دیتے تھے۔

اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے سے متعلق ان کا موقف یہ ہے کہ انسان کی روحانی قوت اس کا کافر ہونا ہے حضرت عیسیٰؑ خدا کی وحدانیت کی تعلیم کرنے اور خدائی احکامات کے بتلانے سے لوگوں کو اس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت کے نیچے سے نکالتے تھے چنانچہ وہ اس قسم کے تمام معجزات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ تمام لوگ خواہ وہ کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے، چوڑی یا پتلی ناک والے ہوں، کبڑے ہوں یا سیدھے، ٹھگنے ہوں یا لمبے یا جانے والے سب کو خدا کی بادشاہت میں تمام حدود و قیود توڑ کر کسی کو بھی خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا، کسی کو عبادت کے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا۔ بس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کا اچھا کرتا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا تھا۔

سرسید کے ہاں جہاں جہاں بھی بیماروں کا انجیلوں میں اچھا کرنے کا ذکر ہے اس سے یہی مراد ہے اور قرآنی آیات بھی اسی معنی میں ہیں۔[1] چنانچہ یوں سرسید احمد خان معجزات کو ایک نیا رُخ ایسا دیتے ہیں کہ جو انھیں مافوق الفطرت اور خرق عادت ہونے سے نکال دیں۔ یا ان کی ایسی تاویلات پیش کی جائیں جو معجزات کی اصل روح کی ہی بر خلاف ہوں۔

آنحضرتؐ کے معجزات کے حوالے سے سرسید احمد خان کا موقف بیان کیا جارہا ہے چنانچہ سرسید کی معراج نبویؐ کے حوالے سے بھی مختلف رائے ہے۔ جبکہ جمہور اہل علم کی رائے یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو معراج جسمانی ہوئی تھی نہ کہ روحانی،

---

[1] سرسید، احمد خان، تفسیر القرآن، 2/46

چنانچہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

{ وذهب معظم السلف و المسلمين إلى أنه بالجسد وفي اليقظة، وهذا هو الحق ، وهذا قول ابن عباس رضى الله عنه ، وجابر ،وانس وحذيفة، وعمر ، وأبي هريرة ، ومالك بن صعصعة، وأبي حبة البدري، وابن مسعود، والضحاك ، وسعيد بن جبير ، وقتادة، وابن المسيب ، وابن شهاب ، وابن زيد ، والحسن ، وإبراهيم ، وسروق ، و مجاهد ، و عكرمة ، وابن جريج، وهو دليل قول عائشة رضى الله عنه ، وهو قول الطبري، وابن حنبل ، وجماعة عظيمة من المسلمين ، وهو قول أكثر المتأخرين من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين والمفسرين.}[1]

(اور اسلاف واہل اسلام کی اکثریت اس بات کی طرف گئی ہے کہ معراج جسمانی تھی اور حالت بیداری میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اور یہی حق ہے اور یہی ابن عباس، جابر، انس، حذیفہ، عمر، ابو ہریرہ، مالک بن صعصعۃ، والی حبۃ البدری، ابن مسعود، والضحاک، سعید بن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابنِ زید، حسن، اِبراھیم، مسروق، مجاہد، عکرمۃ، ابن جریج، کی رائے ہے اور یہی دلیل ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے قول کی اور یہی قول طبری کا ہے اور احمد بن حنبل اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کا ہے اور متاخرین میں سے بھی اکثر فقہاء، محدثین، متکلمین اور مفسرین کا یہی قول ہے).

مگر سر سید اس رائے کو رد کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں کہ:

> پہلا مذہب حضرت عائشہ صدیقہ اور بعض صحابہ کا جو اس بات کے قائل ہیں کہ معراج روحانی تھا نہ کہ جسمانی۔ دوسرا مذہب چند کاربردین کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ معراج بیت المقدس تک جسمانی تھی اور وہاں سے ملا اعلیٰ تک روحانی۔ تیسرا مذہب جو عام طور پر مشہور ہے کہ تمام معراج جسمانی تھی۔ میری یہ رائے ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ پر اور قرآن واحادیث پر غور کیا جاتا ہے تو مذہب عائشہ ٹھیک اور درست معلوم ہوتا ہے اور وہی مذہب میں نے اختیار کیا ہے۔[2]

اسی طرح سر سید احمد خان اپنی تفسیر کے حصہ ششم میں آنحضرت کے دو اھم العجزات معراج نبوی اور شق صدر پر مفصل انداز میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، 1/238.

[2] محمد اسماعیل، شیخ، مقالات سر سید، 13/48،47

معراج سے متعلق جس قدر احادیث ہیں انہیں آپؐ کا بجسدہ جبرائیل کا ہاتھ پکڑ کر خواہ برق پر سوار ہو کر یا پرند جانور کے گھونسلے میں بیٹھ کر جو درخت میں لٹکا ہوا تھا بیت المقدس میں تک جانا اور وہاں سے بجسدہ آسمانوں پر تشریف لے جانا یا بذریعہ ایک سیڑھی کے جو آسمانوں تک لگی ہوئی تھی چڑھ جانا خلاف قانون فطرت ہے اور اس لیے ممتنعات عقلی میں داخل ہے اگر ہم ان کے راویوں کو ثقہ اور معتبر تصور کر لیں تو بھی یہ قرار پائے گا کہ ان کو اصل مطلب کے سمجھنے اور بیان کرنے میں غلطی ہوئی مگر اس واقعہ کی صحت تسلیم نہیں ہو سکنے کی اسلئے کہ ایسا ہونا ممتنعات عملی میں سے ہے۔ اور یہ کہہ دینا کہ خدا میں سب قدرت ہے اس نے ایسا ہی کر دیا ہو گا جہاں اور نا سمجھ بلکہ مرفوع القلم لوگوں کا کام ہے نہ ان کا جو دل سے اسلام پر یقین کرتے ہیں اور دوسروں کو اس مقام پر یقین دلانا اور اعلائے کلمہ اللہ کا چاہتے ہیں۔[1]

سر سید احمد خان گواہان رویت کی گواہی کو بھی ایسے موقع پر صحیح نہیں تسلم کرتے کیونکہ ان کے مطابق یہاں راوی کے فہم اور بیان میں بھول چوک اور خطا کا اقرار کر لینا فطرئی قانون کو غلط ثابت کرنے سے بہتر ہے اور جہاں تک پیغمبرانہ قول کا تعلق ہے اسکو سر سید بلا حجت تسلیم کے قابل تو مانتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ قول پیغمبر ہونا ثابت ہو جائے۔ سر سید کے خیال میں صحاح ستہ کی کسی حدیث سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کا بیت المقدس اور آسمانوں پر جانے کا واقعہ عالم بیداری میں پیش آیا تھا کہ اس کے برعکس کچھ احادیث ایسی ہیں کہ جنہیں آپؐ کے سونے کی حالت کا ثبوت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اب ھم غور کرتے ہیں کہ احادیث معراج جنمیں صاف موجود ہے کہ وہ ایک واقع ہے جو سونے کی حالت میں آنحضرتؐ نے دیکھا تھا اور دلالہ النص سے ثابت ہے اور صحاح کی کسی حدیث سے نہیں پایا جاتا کہ حالت بیداری میں آتے دیکھا اور بجسدہ آپؐ بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے گئے بر خلاف اس کے چند حدیثوں میں سونے کی حالت پائی جاتی ہے تو ہمارا اور ہر ذی عقل بلکہ ھر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اسے خواب کا ایک واقعہ ہی تسلیم کرے اور ابن رشد نے قول کو صحیح سمجھے کہ اگر نقل میں کوئی بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے تو خود نقل اور اسکے ماسبق و مالحق پر غور کرنے سے وہ مخالفت دور ہو جاتی ہے نہ یہ کہ تاویل بعیدہ اور رکیکہ اور دلائل فرضی دور از کار سے اسکو ایسا واقعہ بنادے جو حقیقت کے بھی ایسا ہی مخالف ہو جیسا کہ عقل اور مذہب اسلام کی

---

[1] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 6/122

مستحکم بنیاد کو توڑ کر ریت پر بلکہ پانی پر اسکی بنیاد رکھے۔[1]

اسی طرح واقعہ معراج کے علاوہ معجزہ شق صدر اور معراج کی کڑیاں سر سید احمد خان ان الفاظ میں ملاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> چند احادیث ایسی ہیں جنہیں شق صدر کا ہونا معراج کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ایسا ہونا البتہ تسلیم ہو سکتا ہے اسلئے کہ ہماری تحقیق میں واقعہ معراج کا ایک خواب تھا جو آنحضرتؐ نے دیکھا تھا اور اسی خواب میں یہ بھی دیکھا کہ جبرائیل نے آپؐ کا سینہ چیرا اور اس کو آب زم زم سے دھویا قابل انکار نہیں ہے اور نہ اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہے۔[2]

چنانچہ معراج کے واقع کے ساتھ ملاتے ہوئے سر سید احمد خان فریدیوں کہتے ہیں کہ:

> شق صدر کے حوالے سے بھی چند مذاہب ہیں بعض اقوال یہاں تک ہیں کہ واقعہ شق صدر پانچ مرتبہ پیش آیا جبکہ جمہور کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایام طفولیت میں پیش آیا جبکہ تیسرا مذہب جو محققین کا ہے اور وہ یہ کہ واقعہ شقی صدر ایک جزو ہے ان تمام واقعات کا جو شب معراج میں پیش آئے تھے۔ یہی روایت میرے نزدیک درست ہے اور معتبر ہے اور اسی مذہب کو میں نے اختیار کیا ہے۔[3]

مذکورہ بالا حوالہ جات اور سر سید احمد خان کے موقف سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ واقعہ معراج اور معجزہ شق صدر کو اپنے انداز میں ملا کر ایک ہی واقعہ پیش کرتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں جو کہ حقیقت میں دونوں الگ الگ واقعات ہیں اور دونوں کے درمیان وقت اور دورانیے کا کافی فاصلہ ہے۔

چنانچہ خلاصہ کلام اس بحث کا یہ ہے کہ جیسا کہ ابتدائی سطور میں یہ بات واضح انداز میں تحریر کی گئی ہے کہ سر سید احمد خان خود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ معجزات و کرامات کا انکار ھم عقلی بنیاد پر نہیں بلکہ اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ قرآن کریم سے معجزات و کرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرق عادت یعنی خلاف فطرت و قدرت کے امتناع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ان تمام آیات واحادیث کا جو معجزاتِ انبیاء علیہم السلام پر دلالت کرتی ہیں بالکلیہ یا تو سرے سے ہی انکار کرتے ہیں اور یا اگر کسی مقام پر کسی جہت سے تسلیم بھی کرتے ہیں تو اسمیں خود ساختہ تاویلات اور اپنی عقلی و

---

[1] سر سید، احمد خان، تفسیر القرآن، 6/126، 123

[2] أیضا، 6/130

[3] محمد اسماعیل، شیخ، مقالات سر سید، 13/48، 47

منطقی توجیہات کا سہارا لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ حضورؐ کے پاس معجزہ نہ ہونے سے ضمناً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیائے سالمین کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ سمجھتے ہیں وہ در حقیقت معجزات نہیں بلکہ مطابق قدرت پیش آمدہ واقعات تھے جو قدرتی قانون کے مطابق تھے۔ اسی طرح معجزات کے علاوہ کرامات کے صدور سے بھی انہوں نے انکار کیا ہے اور اولیاء اللہ میں کرامات کے یقین کو وہ توحید فی الصفات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ معجزات سے متعلق سر سید احمد خان کا تفصیلی موقف گزشتہ صفحات میں تفصیل سے درج کر دیا گیا ہے۔

غلام احمد پرویز اور معجزات نبویؐ:

غلام احمد پرویز ہندوستان کے مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور میں 9 جولائی 1903ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد چودھری فضل دین ناخواندہ جبکہ دادا مولوی چوھدری رحیم بخش حنفی مسلک کے عالم تھے۔ اور تصوف کے سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر طبیب تھے۔ پرویز نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا سے حاصل کی اور ابتداء سے ہی تصوف سے منسلک ہو گئے لیکن بعد میں انہوں نے اس راستے کو خیر آباد کہہ دیا۔ کیونکہ ان کے ہاں تصوف کوئی اچھی چیز نہ تھا بلکہ وہ اسے دین کے خلاف سمجھتے تھے۔

اس کے بعد ان کو قرآن کریم سے شغف پیدا ہوا اور آپ تفسیری اشارات میں منہمک ہو گئے اور مطالعہ قرآن شروع کیا اور اسکی گہرائیوں سے اترنے کی کوششیں کیں. چنانچہ نئی ایجاد کردہ راہیں ان پر کھلنے لگیں اور ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن کے احکام اور احادیث کی روایات ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور تفسیر کو احادیث کی روایات سے ہٹ کر لکھا۔ چنانچہ اس دوران جن روایات کو انھوں نے اپنے مقصد کے مطابق پایا ان کو نقل کیا اور جن کو اپنے ذہن کے خلاف پایا تو بغیر تحقیق کے یوں احادیث کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے انکار کر گئے۔

آپ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن آفیسر تھے مگر جلد ہی اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لیکر 1956ء میں کراچی منتقل ہو گئے اور وہاں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو زندگی کے آخر تک جاری رہا اور یوں اکتوبر 1984 میں آپ علالت کے باعث صاحب فراش ہوئے اور 23 فروری 1985 کو انتقال کر گئے۔

غلام احمد پرویز نے اپنے نظریات کے فروغ کے لیے تقریباً پچاس سے زائد کتب تصنیف کی جسمیں انھوں نے ہر دینی موضوع پر قلم اٹھا کر ایک نئی فکر و سوچ پیش کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی تمام کتب آپکے ہم خیال ادارے "طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور" سے شائع ہوئیں۔

ان کی کتب کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی زندگی میں جس شے نے زیادہ ہیجان پیدا کیا وہ اُن کا تنقیدی نقطہ نظر تھا۔ لہذا اگر کوئی چیز حادیث کے خلاف ہوتی تو اس سے آپ کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ آپ اسکے لیے کسی ٹھوس دلیل کی تلاش و طلب میں سرگرداں رہتے تھے۔

چنانچہ اسی خیال نے ان کو قرآن کریم پر اپنی مخصوص تحقیق کے آغاز پر مائل کیا اور آپ نے بالکل نئے انداز میں قرآن کریم کی تشریح کی۔ آپ نے بزعم خویش از سر نو مفہومات قرآنی کا جائزہ لیا اور ان کے جدید معانی تلاش کئے اور ایک نئے انداز کو سامنے لایا۔ اسی طرح قرآن و فہمی کے دوسرے مرحلے میں آپ نے "تصریف الآیات" کا یہ مطلب نکالا کہ دو آیات کے مفہوم کو پھیر پھیر کر لانا، اور یوں اس انداز سے تفسیر مکمل لکھ دی۔

اپنے خود ساختہ مفاہیم کے لیے چونکہ لغت کی کوئی مستند کتاب نہیں تھی جو کہ ان کے لیے معاون اور دلیل کا باعث بنتی لہذا ان کو اس مقصد کے لیے "لغات القرآن" کے نام سے قرآنی لغت کی ایک کتاب لکھنی پڑی جسمیں قدیم لغات سے استفادہ کر کے اپنے مقصد کے مطالب و معانی نکالنے لگے۔ اور یہ قرآنی موضوع پر کام کرنے کا سلسلہ دس سال تک جاری رہا جس کے بعد انھوں نے کئی ایک کتب کو نئے سرے سے تصنیف کرنا شروع کیا۔ اور اپنی من پسند تفاسیر و تشریحات کو بڑے فخریہ انداز میں پیش کیا۔ غلام احمد پرویز لکھتے ہیں کہ:

> میری عمر بھر کی تحقیق و کاوش کا ماحصل یہ ہے کہ: جو دین نبی علیہ السلام کی وساطت سے منجانب اللہ ہمیں ملا تھا وہ بتمام و کمال قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ دین کے معاملے میں حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار قرآن کریم ہے۔ روایات، احادیث ہوں یا تاریخ، شریعت ہو یا طریقت، غرضیکہ جو کچھ بھی تھی اسلام کے نام سے ہمارے ہاں مروج ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترنے اسے درست تسلیم کر لیا جائے اور جو اسکے خلاف ہو اسے مسترد کیا جائے۔

ان کے خیال میں، آنحضرتؐ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور عدیم النظیر تربیت سے ایک ایسی جماعت تیار کی اور پھر ان کے ساتھ ملکر ایک عالمگیر مملکت کا قیام عمل میں لایا۔ حضورؐ کا یہی علم ہے جو تا قیامت انسانوں کے لیے اسوہ حسنہ قرار پایا اور اسوہ حسنہ کو سامنے لانے کے آپؐ کی سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت جب میں نے روایات و تاریخ کی کتب کا مطالعہ کیا تو مجھے یہ نظر آیا کہ وہ کتب اس قسم کے قصوں اور کہانیوں سے بھری پڑی ہیں جو نہ صرف خلاف علم و عقل اور مخالف قرآن ہیں بلکہ یہ حضورؐ کی سیرت کو بھی داغدار کر رہی ہیں۔

جبکہ دوسری جانب قرآن کا جب میں نے بغور مطالعہ کیا تو اسمیں آپؐ کی سیرت کے اصولی گوشے محفوظ ہیں، میں نے ان اصولوں کو عنوانات قرار دیکر ان کی روشنی میں ہدایات و آثار کی کتب کو کھنگالا چنانچہ جو واقعات

مطابق قرآن نظر آئے ان کو قبول اور جو اسکے خلاف نظر آئے ان کو مسترد کر دیا۔ اور یوں حضورؐ کی نکھری، اجلی، مصفاء اور پاکیزہ سیرت مرتب ہو کر سامنے آگئی جو میری کتاب "معراج ان نسبت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ غلام احمد پرویز کا مسلک و مشرب ہے جو انہوں نے اسلاحی تعلیمات کے حوالے سے اپنایا ہے اور اسی کے تحت ان کی ساری فکری و نظری جستجو ان تحقیق گھوم رہی ہے۔

اللہ رب العزت نے انبیاء علیہم السلام کو وقتاً فوقتاً معجزات عطا فرمائے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہے مگر غلام احمد پرویز ان تمام معجزات کی نفی کرتے ہیں اور قرآن کریم کے ہر اس مقام کو جو معجزے سے متعلق ہو ایسا مفہوم دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ عقلی دائرہ کار میں آجائے اور اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے سے ہی اس بات کا تعین کر رکھا ہے کہ کوئی بھی قرآنی مقام یا آیت خلاف عقل نہ ہو۔

چنانچہ ان کے مطابق اللہ تعالٰی نے یہ کائنات بنا کر اسے قوانین کا تابع بنا دیا ہے اور ہر کام مقررہ قوانین کے مطابق ہی ہوتا ہے اور اس سلسلے میں کائنات بشمول جملہ انسانی امور اللہ تعالٰی بذات خود بھی دخل اندازی نہیں کرتے اور یہاں پہنچ کر وہ خود بھی ضابطے اور قانون کے پابند ہیں اس لیے تمام وہ قرآنی واقعات جہاں باری تعالٰی انسانی امور میں دخیل ہیں یا ایسے تمام کام جو قاعدے اور قانون سے ہٹ کر ہوئے ہیں وہاں غلام احمد پرویز نے آیات قرآنی سے معانی اور مفاہیم کو بدل کر رکھ دیا ہے اور اس بابت عربی کے جملہ قواعد و ضوابط، ترجمہ و تفسیر، صرف و لخو اور عربی محاورات وغیرہ کو وہ بالائے طاق رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔[1]

چنانچہ معجزات کے حوالے سے غلام احمد پرویز کہتے ہیں کہ مشرکین بارہا آنحضرتؐ سے معجزات کا تقاضہ کرتے تھے جس کے جواب یہ آنحضرتؐ نے جو فرمایا اسکے حوالے سے قرآنی آیت اور اس کا مفہوم غلام احمد پرویز کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> مخالفین کہتے کہ اگر آپؐ خدا کی طرف سے رسول میں تو کوئی معجزہ دکھایئے، اسکے بغیر ہم کیسے مان لیں کہ آپؐ مامور من اللہ ہیں:
>
> ﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَا ﴾[2]
>
> (یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس شخص پر اس کے پروردگار کی طرف

---

[1] حیدر علی، فکر پرویز اور قرآن، مکتبہ دارالسلام لاہور، 2017 ص، 74

[2] الرعد:27

سے کوئی نشانی اترتی ؟ اے رسول ! ان سے کہہ دو کہ عجیب، غریب نشانیاں (معجزات) رکھا کر حقیقت کو تسلیم کروانے کا سوال ہی نہیں، اسلئے خدائی قانون یہ ہے کہ جو شخص عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتا، اسے صحیح راستہ نہیں دکھائی دیتا ماہ، جو علم و بصیرت کی رو سے اسکی طرف متوجہ ہوتا ہے، اسکے سامنے نکھر کر آجاتا ہے)

جبکہ سورہ بنی اسرائیل میں ان مطالبات کی توضیح ان الفاظ میں آئی ہے:

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْ ﴾[1]

جس کا مفہوم غلام احمد پرویز یوں بیان کرتے ہیں:

اور یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں جب تک کہ تو اس قسم کی باتیں کر کے نہ دکھا دے، مثلاً ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے، یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے، یا جیسا کہ تو کہتا ہے کہ ہم پر تباہی آئے گی تو اسکے لیے آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر آگرے ، یا اللہ اور اسکے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں۔ یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیا ہو گیا ہے۔ ایسا ہو کہ تو ہم آسمان پر چڑھ جائے۔ اور اگر تو آسمان پر چڑھ بھی گیا تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں جبتک تو ایک (لکھی لکھائی) کتاب ہم پر نہ اتار لائے، اور ہم خود اسے پڑھ کر جانچ نہ لیں۔ (اے رسول) ان سے کہہ دے سبحان اللہ !(میں نے کچھ خدائی کا دعوی تو نہیں کیا) میں اسکے سوا کیا ہوں کہ ایک انسان ہوں جو تم تک حق کی بات پہنچاتا ہوں۔[2]

چنانچہ غلام احمد پرویز کا موقف ان آیات کی روشنی میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس طرح کی متعدد آیات ہیں جنمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ لوگ بار بار معجزات طلب کرتے تھے اور اللہ کی جانب سے ہر مرتبہ اس کا شدت سے انکار ہوتا تھا۔ وہ فرید کہتے ہیں کہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالٰی کی جانب سے علم و حقائق عطا کیے جانے کے لیے (وحی کا) فوق الفطرت انداز اختیار کیا گیا تو پھر اس وحی کو تسلیم کروانے کے لیے کوئی خارق عادت عجوبہ کیوں نہ دکھا دیا گیا۔ بالخصوص جب مخالفین کی جانب سے اسکا بارہا تقاضا کیا جارہا تھا۔ لہذا یہ سوال جہاں غور طلب ہے وہاں

---

[1] بنی اسرائیل: 93-90

[2] پرویز، غلام احمد، معراج انسانیت، طلوع اسلام، ٹرسٹ، لاہور، ص 423، 424، 2002ء

اس کا جواب حقیقت کشا ہے۔[1]

وہ فرید کہتے ہیں کہ انسانیت کی راہنمائی کے لیے وحی کا طریقہ اس وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ ابدی حقائق اور مستقل اقدار کا تخلیق یا دریافت کر لینا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ پر اسکے دائرہ کار سے باھر کی چیز ہے۔ ان حقائق کو رسولؐ پر منکشف کر کے ان سے کہہ دیا کہ ان کو لوگوں کے سامنے پیش کر دو اور ان سے کہہ دو کہ تم عقل و فکر کی رو سے ان پر متوجہ ہو جاؤ اسکے بعد اگر تم اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ واقعتاً صداقت پر مبنی ہیں تو انہیں بطیب خاطر اپنی زندگی کا ضابطہ بنالو۔[2]

مندرجہ بالا تفضل سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اولاً یہ کہ حضورؐ سے معجزات کا تقاضہ کیا گیا اور جواباً شدت سے اسکا انکار ہوتا رہا۔ ثانیاً: انسانی عقل و فکر کو متاثر اور اسکی قوت ارادی کو سلب کر کے کسی بات کا منوانا جبر و اکراہ میں شامل ہے لہذا معجزے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو آپؐ سے جب معجزات کا مطالبہ کیا جاتا رہا تو آپؐ نے کبھی انکار نہیں فرمایا ہے۔ اور نہ ہی آپ نے یہ فرمایا کہ یہ طریقہ کار اللہ تعالیٰ کے ہاں روا نہیں رکھا گیا۔ یا اللہ تعالیٰ معجزے نہیں دیتا بلکہ آپؐ کا ہمیشہ جواب یہی ہوتا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار میں ہے چنانچہ اس حوالے سے قرآنی آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾[3]

(اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ ان کے رب کی طرف سے آپؐ فرما دیجئے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ معجزہ نازل فرمائے لیکن ان میں سے اکثر بے خبر ہیں)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَقُوْلُوْنَ لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴾[4]

(اور پر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوا؟ پس آپ فرما دیجئے کہ غیب کی خبر

---

[1] پرویز، غلام احمد، معراج انسانیت، ص423

[2] پرویز، غلام احمد، معراج انسانیت، طلوع اسلام، ص425

[3] الأنعام:37

[4] یونس:20

صرف اللہ کو ہے پس تم بھی منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں)

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنَاهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْ ﴾[1]

(پس اسے چاہیے کہ ہمارے سامنے کوئی نشانی لائے جیسے کہ اگلے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ ان سے پہلے جتنی بستیاں ھم نے اُجاڑیں سب ایمان سے خالی تھیں۔ تو اب کیا یہ ایمان لائیں گے)

مذکورہ بالا اور ان کے علاوہ متعدد آیات میں تو معجزے کے اثبات کا تذکرہ ملتا ہے مگر انکار نہیں و گرنہ کتنا آسان تھا کہ آپؐ کہہ دیتے کہ اللہ کریم تو کسی کے ذہن کو متاثرہ ماؤف کر کے بات نہیں منواتے۔ لہذا آپ لوگ معجزے کا تقاضہ مت کریں بلکہ ان آیات میں یہی کہا گیا ہے کہ معجزہ خالص اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے جیسا کہ انبیائے سابقہ کے معاملے میں ہوا اور اللہ تعالیٰ اس بات کی قدرت رکھتا ہے۔

دوسری بات کہ معجزے کے ذریعے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اپنی بات زبردستی منوانا چاہتے ہیں تو یہ بھی غلط قیاس ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ویسے بھی فرما چکے ہیں کہ اگر وہ چاہتے تو تمام انسانوں کو ہدایت دے دیتے۔ اسکے ساتھ ساتھ انبیاء کرام نے اس سے قبل جتنے بھی معجزات دکھائے تو وہ معجزہ دیکھنے والے سب لوگوں نے قبول نہیں کیئے بلکہ بعض نے قبول اور بعض نے جھٹلایا اور معجزے کو جادو تک بھی قرار دیا۔

لہذا معجزے سے مقصود اگر قوت ارادی کو سلب کر کے ذہن کو متاثر کر کے اختیار وارادہ کو عاجز کر کے اپنی بات منوانا ہوتا تو فرعون بھی ایمان لے آتا۔ اسی طرح امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ نے حضورؐ کو بہت سے حسی معجزات عطا فرمائے تھے جنمیں معراج جسمانی اور شق قمر وغیرہ مجزات قرآن کریم میں مذکور ہیں اور آپؐ کے دیگر ظاھری اور حسن معجزات کا تذکرہ احادیث وسیرت کی کتاب میں موجود ہے۔ حتی کہ آپ کے حسّی معجزات کا قدر مشترک حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔ اور جس کا انکار صرف بصیرت، روحانیت سے محروم اور عاری شخص ہی کر سکتا ہے۔ لیکن غلام احمد پرویز اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

جناب رسول اکرمؐ کو قرآن کریم کے سوا (جو عقلی معجزہ ہے) کوئی اور معجزہ نہیں۔[2]

اسی طرح ایک اور مقام پر اپنی ایک کتاب میں یوں رقم طراز ہیں:

---

[1] الانبیاء، 6-5

[2] پرویز، غلام احمد، معارف القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور، 2000، 4/731

آنحضرتؐ کے زمانہ میں انسانی عقل و فکر اپنی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ لہذا آپؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ قرآن کریم سے حضورؐ کا کوئی حسّی معجزہ ثابت نہیں ہوتا۔[1]

اسی طرح غلام احمد پرویز مزید لکھتے ہیں کہ:

آپ کو حیرت ہوگی کہ رسول کی جانب سے اتنے سارے معجزات کیسے منسوب ہو گئے حالانکہ قرآنی صراحت کے تحت آپ کو قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ نہیں ملا اور یہ دوسرے معجزات کتب روایات میں مذکور ہیں مگر حیرت کی ضرورت نہیں اسلئے کہ ان کتب میں رسولؐ کی جانب ایسی باتیں نسبت کی گئی ہیں کہ جن سے سعید روحیں کانپ اٹھتی ہیں جب بنیاد درست نہ ہو تو اس اس پر پر مبنی اشیاء پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔[2]

اسی طرح آنحضرتؐ کی معراج کا مطلب بیان کرتے ہوئے غلام احمد پرویز لکھتے ہیں:

معراج النبیؐ کا مطلب ہجرت مدینہ اور مسجد اقصی سے مراد مسجد نبویؐ ہے۔[3]

چنانچہ غلام احمد پرویز مسجد اقصیٰ سے مسجد نبویؐ مراد لیتے ہیں۔ اور یہاں ضمناً یہ بات ملاحظہ ہو کہ مرزا غلام احمد قادیانی مسجد اقصی سے کیا مراد لیتے ہیں:

مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) سے مراد مسیح موعود (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) کی مسجد ہے جو قادیان میں واقع ہے۔ معراج میں آنحضرتؐ مسجد الحرام سے مسجد اقصی تک سیر فرما ہوئے تھے لہذا وہ مسجد اقصیٰ یہی ہے جو قادیان میں مشرقی جانب میں واقع ہے۔[4]

اسی طرح مسجد اقصی سے مراد قادیان کی مسجد لیتے ہوئے قادیانی اخبار "الفضل" میں غلام احمد قادیانی مزید لکھتے ہیں:

{ سجن الذي اسرى بعبده ليلاً من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى الذي بركنا حوله }

(کی آیت کریمہ میں مسجد اقصی سے مراد مرزا غلام احمد کادیانی کی مسجد ہے اور میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا ہے کہ قادیان کی زمین بابرکت ہے یہاں مکہ مکرمہ اور مدینہ

---

[1] پرویز، غلام احمد، معارف القرآن، ص703

[2] ایضاً، 4/732

[3] أیضا، 4/736

[4] قادیانی غلام احمد، اخبار الفضل، 11 دسمبر 1932ء، قادیان

منورہ والی برکتیں نازل ہوتی ہیں)[1]

اسی طرح غلام احمد قادیانی کے ہاں شعائر اللہ کی زیارت ضروری ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہاں قادیان میں کئی ایک شعائر اللہ ہیں جنہیں مسجد مبارک مسجد اقصیٰ ضارۃ المسیح شامل ہیں۔[2] مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غلام احمد پرویز اور مرزا غلام احمد قادیانی معراج النبیؐ کے حوالے تو سے دونوں ہم نوا ہیں جن کے نظریات و عقائد میں کافی حد تک مماثلت ہے۔

اسی طرح غلام احمد پرویز اپنی کتاب میں حضورؐ کی معراج جسمانی کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> اگر آج کوئی سائنسی ایجاد اس امر کا امکان پیدا کر دے کہ کوئی شخص روشنی کی رفتار سے مریخ یا چاند کے کروں تک پہنچ جائے تو پھر چند ثانیوں میں وہ واپس بھی آجائے تو پھر بھی میں حضورؐ کے معراج جسمانی کو قبول نہیں کروں گا۔[3]

یہاں بھی ضمناً یہ بات ملاحظہ ہو کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی آنحضرتؐ کے معراج جسمانی سے انکار کیا ہے اور ان کے ہاں معراج سے مراد اعلیٰ درجے کا کشف ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اس جگہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ اگر جسم خاکی کا آسمان پر چلا جانا محالات میں سے ہے تو پھر آنحضرتؐ کا معراج اس جسم خاکی کے ساتھ کیونکر جائز ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معراج جسم کثیف کے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجے کا کشف تھا۔[4]

مذکورہ عبارت میں لفظ کثیف پر غور کریں کہ مرزا قادیانی نے آنحضرتؐ کے جسم اطہر کے لیے کتنی بیباکی سے استعمال کیا اور پھر اس جسارت میں آپؐ کی معراج کے واقع کو اعلیٰ درجے کے کشف تک پہنچا دیا اور پھر جب انھیں یاد آیا کہ اس اعلیٰ درجے سے کشف سے میں خود کو کیوں محروم رکھا تو مذکورہ عبارت میں آگے چل کر آنحضرتؐ سے ہمسری کا دعویٰ کر کے اس کمی کو پورا کیا اور مزید لکھا کہ:

> یہ کشف کا بزرگ ترین مقام ہے، جو در حقیقت بیداری سے یہ حالت زیادہ اصفی واجلی ہوتی ہے اور اس قسم کے کشفوں میں مؤلف خود صاحب تجربہ ہے۔[5]

---

[1] قادیانی غلام احمد، اخبار الفضل، 21 اگست 1931ء

[2] ایضا، 8 جنوری 1933ء

[3] پرویز، غلام احمد، معارف القرآن، 2/241

[4] قادیانی، غلام احمد، مرزا، ازالہ اوہام، 3/20

[5] ایضا، 3/21

مرزا غلام احمد قادیانی مزید کہتا ہے کہ:

یہاں پر اعتراض ہے کہ نیا اور پرانا فلسفہ متفقہ طور پر اس بات کو محال ثابت کرتا ہے کہ کوئی انسان اپنے اس جسم خاکی کے ساتھ کرہ زمہریر تک بھی پہنچ سکے، بلکہ طبعی علوم کے جدید تحقیقات یہ ثابت کر چکی ہیں کہ بعض بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہنچ کر اس طبقہ کی ہوا ایسی مضر صحت معلوم ہوئی ہے کہ جسمیں زندہ رہنا ممکن نہیں۔ لہذا اس جسم خاکی کا کرہ ماہتاب یا کرہ آفتاب تک پہنچنا کس قدر لغو خیال ہے۔[1]

چنانچہ غلام احمد پرویز سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا﴾[2] کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مخالفین کی جن ریشہ دوانیوں کی جانب پیچھے اشارہ کیا گیا ہے انہیں آخری سکیم یہ تھی کہ رسولؐ کو چپکے سے قتل کر دیا جائے مگر خدا کی سکیمیں اتنی بلند و برتر ہیں کہ وہ ان کے قیاس و گمان میں نہیں آسکتیں۔ چنانچہ وہ اپنی سکیم کے مطابق اپنے بندے کو راتوں رات بیت الحرام (مکہ) سے نکال کر (مدینہ) کی وسیع زمین کی جانب لے گیا تاکہ اس دور دراز مقام میں جا کر نظام خداوندی کی تشکیل کرے۔ ھم نے اس قیام اور اس کے گرد و پیش کو بڑا بابرکت بنایا ہے۔ اس کی فضا آسمانی انقلاب کے لیے بڑی ساز گار ہے یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ خدا ان باتوں کو آشکارہ کر دے جن کا اتنے عرصے سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔[3]

جبکہ آیت کریمہ کا درست ترجمہ یوں ہے:

(پاک ہے وہ ذات (اللہ تعالٰی) جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا۔ جس کے آس پاس ہم نے برکتیں دے رکھی ہیں۔ تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں)

لیکن غلام احمد پرویز نے اسکے مفہوم کو بدل کر رکھ دیا اور مسجد اقصی سے مراد یہاں مدینہ طیبہ لیا جو قرآنی آیت کے

---

[1] قادیانی، غلام احمد، مرزا، ازالہ اوہام، 3/21

[2] بنی اسرائیل: 1

[3] پرویز، غلام احمد، مفہوم القرآن، ص، 626

معانی کے سراسر خلاف ہے۔ اسی طرح غلام احمد پرویز اسی آیت کی تشریح میں فرید لکھتے ہیں کہ:

{ سجن الذي اسری بعبده ليلا من المسجد الحرام }

کہا! کیا بات ہے ان کی تدبیروں کی! آپؐ کے خلاف کفار نے کیا کچھ نہیں کیا ہو گا۔ انتہائی تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح سارے قبائل کا ایک ایک نمائندہ مل کر آپؐ کو راتوں رات قتل کر دیا جائے۔ تاکہ روز روز کا ٹنٹا ہی ختم ہو جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ تیرہ سال ہو گئے ہیں اس نے مستقل طور پر زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ اس کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔ لہذا اللہ تعالٰی نے ان کے متعلق کہا "گھبراؤ نہیں"۔ یہ دیکھو کہ وہ ان کی گرفت سے کتنا اونچا ہے، جس نے یہاں ان کے لیے تدبیر کی اور وہ راتوں رات ان کو یہاں سے نکال کر مدینے کی طرف لے گیا۔[1]

چنانچہ غلام احمد پرویز کی قرآن فہمی اور عقل و تدبر پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہو گا کہ انھوں نے اس آیت میں میں "اسرٰی" سے مراد خنجر، مسجد حرام سے مراد پورا "مکہ" اور مسجد اقصی سے مدینہ مراد لیا ہے۔ لہذا وہ کہتا ہے کہ حضورؐ مسجد حرام سے بیت المقدس نہیں بلکہ مدینہ تشریف لے گئے۔ اب یہاں یہود و نصاری سے بھی اگر پوچھا جائے کہ مسجد اقصیٰ سے کیا مراد ہے تو ان کا جواب ہو گا بیت المقدس۔ مگر پرویز کی اس سے بڑی کم فہمی کیا ہو گی کہ مدینے میں آپؐ کی تشریف آوری سے قبل کب مسجد موجود تھی کہ قرآن کریم نے اسے مسجد اقصی کے نام سے پکارا۔ اور یہ کہ مدینے کو ہجرت نبویؐ سے پہلے کب کوئی برکت حاصل تھی۔ چنانچہ قرآن نے ہجرت سے قبل اس کو اسکے اصلی نام یثرب سے پکارا مگر جب آنحضرتؐ وہاں شریف لے گئے تو وہ "مدینہ" کے لقب سے معروف ہوا۔ اور خود قرآن کریم نے اسے مدینہ کے نام سے یاد کیا۔ جیسا کہ آیت کریم میں ارشاد ہے:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَ ﴾[2]

"اگر ہم مدینہ واپس گئے اس حقیقت پر دال ہے"

جبکہ غلام احمد پرویز ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

(سورۃ بنی اسرائیل کی آیت اسرٰی میں کہا گیا ہے یا ہے کہ خدا اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی جانب لے گیا تاکہ وہاں اسے اپنی آیات دکھائے۔ خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ خواب کا نہیں تو یہ حضورؐ کی شب ہجرت کا بیان ہے۔ اسی طرح مسجد نبویؐ سے مراد مدینہ کی مسجد نبویؐ ہو گی جسے آپ نے وہاں جا کر تعمیر فرمایا)[3]

---

[1] أیضا، مطالب الفرقان في دروس القرآن، سورہ بنی اسرائیل، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور 1998ء، ص 23

[2] المنافقون: 8

[3] پرویز، غلام احمد، معارف القرآن، 4/73

چنانچہ مندرجہ بالا حوالہ جات سے یہ معلوم ہوا کہ غلام احمد پرویز نے واقعہ اسراء (معراج) اور واقعہ ہجرت کو ایک ہی واقعہ قرار دیا ہے جو کہ بوجوہ غلط ہے۔

1. سورہ اسراء بلحاظ ترتیب نزولی ۵۰ نمبر پر ہے اسکے بعد مکہ میں مزید ۳۶ سورتیں نازل ہوئیں اور اس کے بعد ہجرت کا وقت آیا تھا۔
2. واقعہ اسراء تو واقعی ایک رات کا واقعہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے مگر ہجرت میں ۱۵ دن اور ۱۵ راتوں کا دورانیہ لگا تھا لہذا اس پر لیلاً یعنی ایک رات یا راتوں رات کا اطلاق کرنا درست نہیں۔
3. مسجد اقصیٰ اسم معرفہ اور ایک معروف مسجد کا نام ہے جو دور بنی اسرائیل سے لیکر آج تک موجود اور اسی نام سے متعارف ہے۔ لہذا مسجد اقصیٰ کا مفہوم اور دور دراز کا مقام بیان کرنا اور عرضی معانی چھوڑ کر لغوی معنی بیان کرنا سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔

اسی طرح معجزات میں سے ایک اہم معجزہ جناب رسول اللہ ﷺ کا معجزہ شق القمر ہے جو کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ اسکے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ۔ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ۔ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ۔ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ﴾[1]

(قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ یہ اگر کوئی معجزہ دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ زور دار چلتا ہوا جادو ہے۔ انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی اور ہر کام ٹھہرے ہوئے وقت پر مقرر ہے۔ یقیناً ان کے پاس وہ خبریں آچکی جنمیں ڈانٹ ڈپٹ کی نصیحت ہے اور مکمل عقل کی بات ہے۔ لیکن ان ڈراؤنی باتوں نے بھی کوئی فائدہ نہ دیا۔ پس آپؐ ان سے اعراض کیجئے جس دن ایک پکارنے والا ناگوار چیز کی طرف پکارے گا۔ یہ جھکی ہوئی قبروں سے اس طرح نکل کھڑے ہوں گے کہ گویا وہ پھیلا ہوا ٹڈی دل ہے۔ پکارنے والے کی جانب دوڑتے ہوں گے اور کافر کہیں گے یہ دن تو بہت سخت ہے)

---

[1] القمر:1-8

واقعہ شق القمر کے حوالے سے قرآنی آیات کی بعد احادیث مبارکہ سے بھی تواتر کے ساتھ منقول ہے چنانچہ امام ترمذیؒ نے حضرت انس سے روایت نقل کی ہے:

(حدثنا عبد ابن حميد ، حدثنا عبد الرزاق ، عن معمر، عن قتادة : عن النبين قال سال اهل مكه النبي آية فانشق القمر بمكة مرتين ، فنزلت: اقتربت الساعة والنشق القمر الى قوله سحر سحر نه مستمر سورة القمرآية 1-2 ، يقول : ذاهب". قال ابو عيسى : هذا حديث حن صحيح) [1]

حضرت انس فرماتے ہیں کہ اہل مکہ نے نبی اکرمؐ سے نشانی (معجزے) کا مطالبہ کیا جس پر مکہ میں چاند دو بار دو ٹکڑے ہوا۔ اس پر آیت (اقتربت الساعة و الشق القمر) سے لیکر سحر ستمر تک نازل ہوئی، راوی کہتے ہیں: سحر مستمر میں مسمتر "کا مطلب ہے "ذاہب" (یعنی وہ جادو جو چلا آرہا ہو)۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اسی طرح ترمذی کی ایک اور حدیث میں جبیر بن لطعم سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا اس پہاڑ پر اور ایک ٹکڑا دوسرے پہاڑ پر، ان لوگوں نے کہا کہ محمدؐ نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ لیکن انہی میں سے بعض نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ اگر انھوں نے ہم پر جادو کیا ہے تو باہر کے تمام لوگوں کو جادو کے زیر اثر نہیں لاسکتے۔ (کیونکہ باہر سے آنے والے لوگوں نے چاند کے دو ٹکڑے ہونے کی خبر دی تھی)۔[2]

مندرجہ بالا آیات و احادیث واقعہ شق القمر کے حوالے سے ٹھوس اور واضح طور پر نصوص سے ثابت ہیں جس سے آنحضرتؐ سے کفار نے معجزہ کا دکھلانے کا جو مطالبہ کیا تھا وہ آپؐ سے ظاہر ہوا۔ اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا لیکن غلام احمد پرویز معجزہ شق القمر کو دیگر معجزات کی طرح تسلیم نہیں کرتے اور وہ اس حوالے سے کہتے ہیں، آیات قرآنی کا مفہوم ان کے الفاظ میں واضح ہو۔

1. وہ انقلاب کی گھڑی (جس کا اتنے عرصے سے کہا جارہا ہے) بالکل قریب آپہنچی ہے اب ان مخالفین عرب کی قوت و شوکت ختم ہو جائے گی۔ اور ان کا پرچم (جس پر چاند کا نشان ہے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

---

[1] الترمذی، ابو عیسی، السنن، (ریاض: دار السلام 1410ھ) کتاب الفتن عن رسول اللہؐ باب ماجاء في انشقاق القمر، ح:3286

[2] أیضا، 7\3285

2. اس آنے والے واقعے کی کئی علامات ان کے سامنے آچکی ہیں مگر ان کی سرکشی اور مدہوشی کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ان پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرتے بلکہ الٹے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ سب وہی جھوٹے افسانے ہیں جنکو ہم ایک عرصے سے سنتے چلے آرہے ہیں۔

3. یہ اس انقلاب کے حوالے سے ھر بات کو جھٹلاتے ہیں اور بدستور اپنے مفاد پرستوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ (اور جب ان سے ذرا زور سے کہا جائے۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ جس تباہی سے متعلق یوں دھمکیاں دی جارہی جارہی ہیں اسے لیکر کیوں نہیں آتے انکو یہ معلوم نہیں کہ) اعمال کے نتائج اپنے وقت پر محسوس صورت میں سامنے آتے ہیں۔[1]

چنانچہ پرویز کے ان خرافات پر تبصرہ کرتے ہوئے حیدر علی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

(یہ تھا پرویز صاحب کا مفہوم۔ ظاہر ہے اسمیں گرائمر کے اصول وضوابط، تراجم کے اسلوب، لسان العرب، سیاق وسباق وغزہ کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ یہ ان سب سے وراء پرویز صاحب کی ذہنی اختراع ہے جسمیں چاند کے پھٹنے پر محمول کیا ہے جبکہ دوسری آیت کو مزید واضح کررہی ہے کہ اگر وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ زوردار چلتا ہوا جادو ہے۔ پرچم کا پھٹنا تو جادو نہ تھا جبکہ چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا دو ہی ہو سکتا ہے (ان لوگوں کی نظر میں) جبکہ وہ تو معجزہ خداوندی تھا)[2]

جہاں تک معجزہ شق القمر کے حوالے سے عقلی دلائل کا تعلق ہے۔ تو یہ عملی طور پر بھی مسلمان کے ہاں ممکن الوقوع ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ زمین و آسمان اور جملہ کائنات کا خالق ومالک ہے اور وہ اجرام سماوی اور سیارگان فلک میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کر سکتا ہے۔ اللہ کا نبی زمین پر اسی کا بھیجا ہوا۔ تبھی اسکی سچائی کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالٰی اسکو کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے اور چونکہ یہ اختیار واقتدار اللہ کا دیا ہوتا ہے لہذا ایک مسلمان کے لئے اسمیں کسی قسم کے تردد کی بات نہیں اور نہ ہی اس معجز کے سے انکار کی کوئی وجہ ہے۔ البتہ غیر مسلموں کے ہاں اس حوالے سے ذہنی ناآسودگی، بے اطمینانی اور الجھن کا جو اظہار پایا جاتا ہے وہ اُلجھن یہ کہ تاریخ عالم میں اسکا تذکرہ نہیں ملتا اگر یہ وقوع پذیر ہوتا تو تاریخ اقوام عالم میں لیکن ضرور کہیں اسکا تذکرہ ملتا۔ لیکن اس اعتراض کی حیثیت فقط ایک مفروضہ سے زیادہ نہیں، تاریخ کی کتب میں نہ ہونا اسکے عدم وقوع کی دلیل نہیں، بہت

---

[1] پرویز، غلام احمد، مفہوم القرآن، ص1648

[2] فکر پرویز اور قرآن، مطبوعہ دار الفرقان لاہور 2005، ص222

سے ایسے واقعات ہیں کہ جو تاریخ کے صفحات میں مندرج نہیں مگر ان کا وقوع سب کے ہاں مسلم ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہ معجزہ رات کے وقت پیش آیا جبکہ زمین کے نصف کرے پر دن کا وقت تھا، دن جب طلوع ہوا ہو تو دھوپ کی روشنی میں چاند ویسے بھی دکھائی نہیں دیتا، اسکا پہلا پہر تھا۔ کہیں آخری اور درمیان رات کے درمیانی اور آخری حصوں میں لوگ ویسے ہی سوئے ہوئے ہیں اور پہلے پہر میں اگر بیدار بھی ہو رہے ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ آسمان کی جانب سے نظریں جمائے ہوئے ہوں گے بلکہ وہ کسی اور کام میں بھی مصروف ہو سکتے ہیں۔

دیکھنے یا یہ عمل بھی مستحق ہو سکتا ہے جب اس حیرت انگیز واقع کا قبل از وقت علم ہو کہ چاند دو ٹکڑے ہونے لگا ہے۔ لیکن وہاں تو ایسی کوئی صورت نہ تھی۔ نہ کوئی منتظر تھا اور یہ واقعہ بعد از وقوع چند لمحوں میں اختتام پذیر ہو گیا۔ چنانچہ ان حالات میں اگر کسی نے نہیں دیکھا، یا بہت کم لوگوں نے دیکھا تو اس سے انکار کا جواز نہیں نکلتا، کئی مرتبہ ایسے ہوتا ہے کہ چاند گرہن ہوتا ہے مگر لوگ اسے اپنی مصروفیات کے باعث نہیں دیکھتے اور اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔

اسکے علاوہ تمام دیکھنے والے مصنف و مورخ بھی نہیں ہوتے بلکہ وہ فقط زبانی ہی تذکرہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی محافل میں یہ تذکرہ کیا، پھر آہستہ آہستہ ذہنوں سے اوجھل ہو گیا۔ لہذا تبھی تاریخ میں تذکرہ نہ ہونا کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس طرح سابقہ کتب میں اس واقعے کا ذکر نہ آنے کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ اسلام کی مستند کتب احادیث اس واقعے کے تذکرے سے بھری ہیں۔ بلکہ محدثین کے ہاں تو ایسی احادیث کی تعداد حد تواتر تک ہے جس میں اس مجرے کا ذکر ہے۔

عبد اللہ چکڑالوی اور معجزات:

آپ میانوالی (پنجاب کے علاقے چکڑالہ میں 1915) میں پیدا ہوئے۔ اصل نام غلام نبی تھا لیکن نبیؐ اور احادیث سے نفرت کے باعث اپنا نام غلام نبی سے تبدیل کر کے عبد اللہ رکھ لیا۔ ان کا تعلق ابتداءً اہل حدیث سے تھا مگر بعد میں اپنے لیے "اہل قرآن" کا لقب پسند کیا، آپ ایک الگ فرقہ "اہل القرآن" کے بانی ہیں جسکا تبلیغی مرکز لاہور میں ہے۔ عبد اللہ چکڑالوی وہ پہلا شخص ہے جس نے احادیث نبویہ کا کھل کر انکار کیا اور انبیاء کی اطاعت کا تذکرہ زندگی بھر اس کو کھٹکتا رہا۔ تبھی "الرسول" سے مراد قرآن لیا۔

دہلی سے علم حدیث کی تعلم حاصل کی وہاں سے لاہور میں منتقل ہوئے۔ لاہور میں چھ عرصہ حدیث کا درس دیتے رہے اور کچھ عرصے بعد اپنے درس میں صحیح بخاری کے لیے اصح الکتاب بعد کتاب الباری کی دلیل ذکر کر کے صحیح بخاری کے علاوہ احادیث کی دوسری کتاب کو مشکوک قرار دیا اور ایک عرصے تک بخاری کا درس جاری رکھے رہا۔

لیکن اضطراب طبع نے بخاری اور قرآن میں تقابل شروع کروادیا۔

چنانچہ بعض احادیث کو آیات اللہ کے خلاف قرار دیکر اعلان کیا کہ قرآن کریم جب ایک مکمل کتاب ہے تو احادیث کی کیا ضرورت ہے؟ جہاں تک آپ کے عقائد و نظریات کا تعلق ہے تو آپ پہلے اہل حدیث اور مسع سنت تھے بعد میں نہ صرف حجیت حدیث کے منکر بن گئے بلکہ اسے شرک فی الکتاب قرار دیا۔ چنانچہ اپنی تفسیر "ترجمہ القرآن" میں آپ یوں رقمطراز ہیں:

> پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک سے مراد یہ ہے کہ جیسے کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دین اسلام میں مانا جائے خواہ فرضاً جملہ انبیاء ورسل کا قول یا فعل بھی کیوں نہ ہو۔ جیسے شرک باعث عذاب ہے ویسے ہی "ان الحکم الا اللہ" اور "الا لہ الحکم والامر" اور "ولا یشرک فی حکمہ احدا" کے شرک فی الحکم یعنی مسائل میں سوائے اللہ تعالٰی کے اور کسی کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا باعث ابدی و دائمی عذاب ہے اور افسوس شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں۔[1]

اسی طرح موصوف نے حدیث کے حوالے سے یوں لکھا ہے کہ:

> قرآن میں دین اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل و مشرح طور پر بیان کی گئی ہے تو اب وحی خفی یا احادیث کی کیا حاجت رہی؟ بلکہ اسکا ماننا اور دین اسلام میں اسپر عملدرآمد کرنا سراسر کفر، شرک اور ظلم و فسق ہے۔[2]

اسی طرح عبد اللہ چکڑالوی اپنی تفسیر میں احادیث کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> کسی جگہ سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ قرآن کے ساتھ کوئی چیز آپؐ پر نازل ہوئی تھی، اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں قرآن کریم کے علاوہ اور شے سے دین اسلام میں حکم کرے گا تو وہ مطابق آیات مذکورہ بالا کافر ظالم اور فاسق ہو جائے گا۔[3]

چنانچہ انکار حدیث کی بناء پر آپ دوسرے منکرین حدیث کی طرح معجزات، شفاعت، عذاب قبر، ایصال ثواب اور تعدد ازدواج وغیرہ کے بھی قائل نہیں تھے۔ اور اسی طرح آپ نے عمومی طور پر مسلمان جس طریقے سے

---

[1] چکڑالوی، عبد اللہ، تفسیر ترجمۃ القرآن، مطبوعہ لاہور 1320ھ، ص98

[2] امرتسری، خواجہ احمد، تسہیل برہان القرآن، دوست ایسوسی اسٹیٹس لاہور 1995ء، ص45

[3] چکڑالوی، عبد اللہ، تفسیر ترجمۃ القرآن، ص42

نماز ادا کرتے ہیں اسکو بھی قرآن کے خلاف تصور کرتے ہیں اور ان کے ہاں مسلمانوں نے اصل نماز کا طریقہ بدل ڈالا ہے۔ اسی طرح جناب رسول اکرمؐ کا سفر معراج جسکے حالت بیداری میں ہونے پر امت کا اتفاق ہے لیکن عبد اللہ چکڑالوی معراج نبویؐ کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> رب العلمین نے آپ کو بطور معجزہ سخت اندھیری رات میں صرف بحالتِ نیند، خواب ہی میں اس خاص زمین کی سیر کروائی یعنی مسجد الحرام سے لیکر مسجد اقصی بیت المقدس تک تمام مقامات کو ظاہر باھر طور پر پوراپورا دکھادیا۔[1]

ان کی اس رائے اور موقف کے حوالے سے شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں:

> لغت کی کونسی کتاب میں یہ حوالہ ملتاہے کہ اسراء کا لفظ خواب میں سیر کروانے پر ہی بولا جاتا ہے اور بیداری میں رات کی سیر پر اسکا اطلاق نہیں ہوتا؟ اور نیز خواب کا یہ واقعہ کونسا تعجب خیز تھا جسکو اللہ تعالیٰ نے "سبحان" کے ساتھ شروع کیا ہے؟ اور یہ کہ لفظ "عبد" محض روح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسم اور روح دونوں کے لیے مستعمل نہیں ہے؟[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات قرآن حکیم میں ذکر کیے گئے ہیں کہ وہ مٹی کے پرندے بنا کر انہیں پھونک مارتے تو وہ باذن اللہ پرندہ بن کر اڑنے لگئے تھے، مادر زاد اندھوں کو باذن اللہ بینائی عطا کرتے تھے، مردوں کو زندہ کرتے تھے لیکن چکڑالوی کے ہاں اسکا مفہوم کچھ اور ہے جو کہ یہ ہے:

> جیسے چار مشہور شکاری پرندے باز، باشہ، چرخ، شاہیں شکاری پرندے تعلیم و تربیت سے فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے مردگان ایمان کو تعلیم و تربیت فرمائی اور وہ مطیع ہو گئے۔[3]

اسی طرح ابری الہا کمہ یعنی اللہ کے حکم سے اندھوں کو بینا کرنے کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

> جسمانی اندھے ہر گز ہر گز مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ رسل انبیاء ڈاکٹر و طبیب جسمانی نہیں ہوا کرتے بلکہ ایمانی اندھوں کو ہی صحت یاب و شفایاب کیا۔[4]

جبکہ حضرت عیسی علیہ السلام کے احیاء موتی سے متعلق لکھتے ہیں کہ ہیں کہ:

---

[1] چکڑالوی، عبد اللہ، تفسیر ترجمۃ القرآن بایات الفرقان، پارہ 15، ص 1
[2] صفدر، سرفراز خان، مولانا، انکار حدیث کے نتائج، مکتبہ گجرانوالہ 1998ء، ص 44
[3] چکڑالوی، ترجمۃ القرآن فی تفسیر القرآن، ص 172
[4] أیضاً: ص 172

احیاء موتی سے جسمانی مردوں کا زندہ کرنا ہر گز ہر گز وھم وخیال تک نہیں ہو سکتا بلکہ خاص ایمانی مردوں ہی کا زندہ کرنا مراد ہے۔[1]

چنانچہ چکڑالوی صاحب پر لکھ کر تو چلے گئے مگر اس عقدہ کو حل نہ کیا کہ روحانی امراض کا علاج تو تمام انبیاء ورسل کرتے رہے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص کی وجہ اس میں کیا ہوئی؟ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ معجزات حضرت عیسیٰ کے بیان ہوئے ہیں اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے مذکور نہ ہوئے۔ اسی طرح اس کے علاوہ بھی چکڑالوی صاحب کی تحریفات کے حوالے سے مولانا سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں:

نار ابراھیمؑ سے فتنہ کی آگ مراد لی ہے اور داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح پڑھنے سے مراد یہ لی ہے کہ یا جبال سے پہاڑی لوگ مراد ہیں اور الطیر سے طیر نامی قوم مراد ہے۔ وادی تیہ میں حضرت موسیٰؑ سے ان کی قوم نے پانی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا فقلنا اضرب بعصاک الحجر۔ چکڑالوی صاحب نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ آپ اپنی جماعت کو پہاڑ کی جانب لے جائیں۔ چنانچہ وہ پہنچے تو دیکھا کہ وہاں چشمے بہہ رہے تھے۔ مگر یہ راز حل نہ کیا کہ جب اس قوم کو چالیس سال تک وادی تیہ سے نکلنا ہی ممنوع تھا تو پھر پانی کے لیے پہاڑوں کی طرف جانے کا کیا سوال؟ مگر ان امور سے چکڑالوی صاحب اور ان کی جماعت کو کیا غرض؟ غرض ان کے نظریات تو اپنی جگہ اٹل اور محکم ہیں۔ اور یہ عقدہ بھی حل نہ کیا کہ فتنہ کی آگ تو تمام انبیاء کرام کے خلاف دشمنوں نے بھڑکائی تھی پھر قلنا یٰنار کو نبی برداو سلما، علی ابراہیم کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ اور جب ان پر فتنہ کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی تو لا محالہ لوگ ان کے دین کو قبول کر چکے ہوں گے (کیونکہ کفار تو کبھی کسی نبی سے مقابلہ کرنے سے نہیں ہارے) پھر حضرت ابراہیم کو انی مھاجر الی ربی کہہ کر عراق اور بابل کے علاقے سے ہجرت کر کے ملک شام جانے کی کیا ضرورت درپیش ہوئی۔ اور کیا پہاڑی لوگوں کی طرف فقط حضرت داؤ کی مبعوث ہو گئے تھے۔[2]

مندرجہ بالا تفصیلی بحث سے یہ خلاصہ نکلتا ہے کہ عبد اللہ چکڑالوی جہاں احادیث مبارکہ کا انکار کرتے ہیں اور ان کو درست نہیں سمجھتے وہاں وہ قرآن وحدیث کے دیگر بہت سارے احکامات کا بھی سراسر انکار کرتے ہیں اور بالخصوص معجزات نبویؐ اور انبیاء بھی ان کے ہاں کوئی معنی رکھتے اور احادیث کو تو وہ سرے سے مانتے ہی نہیں البتہ قرآن کریم

---

[1] چکڑالوی، ترجمۃ القرآن فی تفسیر القرآن: ص172

[2] صفدر سرفراز خان، مولانا، انکار حدیث کے نتائج، ص45

کے اندر بھی جہاں جہاں معجزات سے متعلق آیات واحکام ہیں وہ اعلانیہ طور پر ان سے تحریف کرتے ہیں۔

حافظ اسلم جے راج پوری اور معجزات:

ان کی پیدائش 1881ء میں جیراج پور ضلع اعظم گڑھ یوپی انڈیا میں معروف اہل حدیث عالم مولانا سلامت اللہ کے ہاں ہوئی۔ تعلیمی مراحل سے فارغ ہونے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں 1906 میں لیکچرر تعینات ہوئے، بعد ازاں جامعہ ملیہ دہلی میں تاریخ اسلام کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ آپکی معروف تصانیف میں تاریخ القرآن، تاریخ امت، الوراثۃ في الاسلام، تاریخ االسلام کا جائزہ، تعلیمات القرآن، لوادرات اور مقام حدیث شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی منتقل ہوئے مگر غلام احمد پرویز لکھتے ہیں:

> اس خطہ زمین کو اہل علم حضرات کی ضرورت نہیں تھی تھی وہ انکو قبول نہیں کر سکی اور یوں عصر حاضر کا یہ جوہر گراں مایہ مراجعت فرمائے ہندوستان ہو گیا۔[1]

جے راج پوری بھی ان معروف لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے احادیث کا انکار کیا اور غلام احمد پرویز نے بھی انہی کی فکر سے استفادہ کیا۔ انکی نگاہ میں حدیث کی اھمیت تاریخ سے کچھ زیادہ نہیں چنانچہ ان کے ہاں اگر کوئی بھی آدمی مجموعہ احادیث میں سے کسی حدیث کو قبول کرنا چاہے تو وہ اسکی مرضی وپسند پر منحصر ہے اور اگر کوئی رد کرنا چاہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ حافظ اسلم الیوم اکملت لکم دینکم الخ کی تفسیر میں احادیث پر ان الفاظ میں نقد کرتے ہیں:

> اس تکمیل کے بعد اب دین میں کیا کمی رہ گئی ہے جسکو روایتوں سے پورا کیا جائے۔ اسلیے روایات کی جگہ اپنی تاریخ کی الماری ہے ان سے علمی و تاریخی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں اور فقہ اسلامی یعنی قوانین وضوابط کے استنباط میں کام لیا جاسکتا ہے۔ احادیث میں آنحضرتؐ کے اقوال، اعمال اور احوال جو بیان ہوئے ہیں اسی کو تاریخ کہا جاتا ہے۔ بیشک قرآنی احکام مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ پر آپؐ نے جو عمل کیا اورامت کو بتلایا اور سلسلہ بہ سلسلہ جو تواتر سے چلا آرہا ہے وہ یقینی ہے کیونکہ تواتر یقینیات کی اقسام میں داخل ہے جسکے بارے میں قرآن کہتا ہے: ''لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنه[2]

چنانچہ اس پر غلام احمد پرویز حاشیے میں یوں ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں کہ: تواتر بھی وہی یقینی ہے جو

---

[1] پرویز، غلام احمد، علوم الحدیث، مطبوعہ مطبوعہ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ص819

[2] جے راج پوری، اسلم، حافظ، ماہنامہ طلوع اسلام، لاہور ستمبر 1955

قرآن کے مطابق ہو۔[1] یہ بھی کہتے ہیں کہ:

نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے اور نہ اسپر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے اور نہ ہی ان پر ایمان لانے کا ہمیں کہا گیا ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح حجت مانیں۔[2]

آنحضرتؐ کی اطاعت کے انکار پر جیراج پوری لکھتے ہیں:

قرآن میں جہاں جہاں اللہ اور اسکے رسولؐ کی اطاعت کا حکم موجود ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جبتک آپؐ امت میں موجود تھے ان کی اطاعت اللہ ورسولؐ کی اطاعت تھی اور آپؐ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہو گی اور اطاعت عربی میں میں کہتے ہیں زندہ کی فرمان برداری کو۔[3]

اسی طرح آنحضرتؐ کی معراج جسمانی کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں:

اگر آپ ہم سے پوچھیں تو ہم یقین رکھتے ہیں کہ عالم ملکوت کی سیر اور مادیات سے بالاتر جاکر خدائی نشانیوں کو دیکھنا جسمانی نہیں روحانی ہی ہو سکتا ہے۔[4]

اسی طرح جے راج پوری نے سدرۃ المنتہیٰ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے: اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سدرۃ المنتہی جس کا ذکر قرآن میں معراج کے بیان میں ہے اس سے علم نبوت کی انتہائی حد مراد ہے۔[5]

ان کے اس بیان کی تردید میں مولانا سرفراز خان صفدر کہتے ہیں:

یہ بات خود زمانہ حال کے منکرین حدیث کو مسلم ہے کہ دور حاضر میں جو قرآنی بصیرت حافظ اسلم صاحب کو ہے وہ ان کی جماعت میں کسی کو بھی حاصل نہیں اور جناب پرویز صاحب وغیرہ تو صرف ان کے خوشہ چیں ہی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تاریخی کتب ہیں جنمیں یہ لکھا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ حسی طور پر ساتویں آسمان پر مخصوص درخت نہیں بلکہ اس سے حقیقی طور پر مراد ہی علم نبوت کی انتہائی حد ہے؟ باقی ادیبانہ رنگ میں اور مجازی طور پر اسکا کوئی منکر نہیں ہے بحث

---

[1] جے راج پوری، اسلم، حافظ، لاہور ستمبر 1955

[2] ایضاً، دسمبر 1950

[3] ایضا، مقام حدیث، ادارہ طلوع اسلام لاہور 1965، 1/149

[4] ایضا، لغادرات، ادارہ طلوع اسلام، کراچی 1956، ص 17

[5] ایضا، ص 17

صرف اس بات سے ہے کہ قرآن کریم اور احادیث میں معراج کے بیان میں جس سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر ہے، کیا وہ حسی طور پر ایک مخصوص درخت نہیں ہے؟ اور یقینا ہے! مگر اسلم صاحب کو معراج جسمانی کے انکار کی کچھ ایسی لگن ہے کہ وہ سفر معراج میں واقع شدہ منزلوں اور ان کی حدود و تعریفات کو بھی بدلنے سے ہر گز نہیں چوکتے۔ تاکہ معراج جسمالی کے انکار کے تمام راستے ہموار کیے جاسکیں اور اس کے روحانی تسلیم کروانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری ہی باقی نہ رہے۔ مگر یقین جانیئے کہ ایسی بے سروپا باتوں سے کون متاثر ہوتا ہے؟ اور ان سے بھلا یہ جاندار مسئلے کب حل ہوتے ہیں۔[1]

اس کے بعد آپؐ کے معجزات کا انکار کرتے ہوئے اسلم جے راج پوری لکھتے ہیں:

یہی حال معجزات کا ہے۔ قرآن نے تصریح کے ساتھ کہا ہے کہ خاتم النبیینؐ کو عقلی معجزہ قرآن حکیم دیا گیا، جسکو اہل بصیرت قیامت تک دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کہ دیگر انبیاء کی طرح حسی معجزہ؟[2]

آگے مزید کہتے ہیں کہ: مگر ان صریح آیات کے ہوتے ہوئے بھی راویوں نے آنحضرتؐ کے حسی معجزات کی روایات کا انبار لگا دیا۔[3] یوں ابتداءً انھوں نے احادیث کا انکار کیا پھر اسکے بعد آنحضرتؐ کے سفر معراج کے جسمانی ہونے کی نفی کر کے اسکو روحانی قرار دیا۔ اور اسکے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے حوالے سے بتلایا کہ خاتم النبیینؐ کو عملی معجزہ قرآن کی صورت میں دیا گیا نہ کہ دیگر انبیاء ورسل کی طرح حسی معجزہ دیا گیا۔ اور پھر احادیث کے رواۃ کے حوالے سے یہ کہہ گئے کہ انھوں نے حضورؐ کے حسی معجزات کا تسلسل قائم کر دیا۔

حافظ عنایت اللہ اثری اور معجزات:

علامہ عنایت اللہ اثری جنکی پیدائش ۱۹۸۰ میں ہوئی۔ سر سید احمد خان کے افکار سے بہت متاثر تھے۔ خود کو اہل حدیث کہلوانا پسند کرتے تھے۔ آپ نے بھی سر سید احمد خان اور دیگر منکرین حدیث کی طرح معجزات انبیاء کا انکار کیا۔ انھوں نے امت کے اجماعی عقدہ کے بر خلاف "عیون زمزم في ولادت عیسی بن مریم" نامی کتاب لکھ کر سیدنا عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے پیدائش کی تردید کی جبکہ اس کے علاوہ دو کتب "بیان المختار" "امر قول المختار" لکھ کر تمام انبیاء کرام کے معجزات کا انکار کیا۔ ان کے اور دیگر انکار حدیث سے وابستہ فکر کے لوگوں میں فرق یہ ہے کہ وہ تمام لوگ

---

[1] صفدر، سرفراز خان، مولانا، انکار حدیث کے نتائج، ص 51،52

[2] جے راج پوری، اسلم، حافظ، مقام حدیث 1/181

[3] ایضا، 1/181

پہلے حدیث کا انکار کرتے ہیں اور بعد میں قرآن کی من پسند تاویلات کرتے ہیں جبکہ حافظ عنایت اللہ اثری تاویلات کے ذریعہ پہلے قرآن پر رائے زنی کرتے ہیں اور اسکے بعد احادیث پر۔ اس لحاظ سے انھوں نے عام منکرین حدیث سے بڑھکر قرآنی تاویلات کو اختیار کیا ہے۔

حافظ عنایت اللہ اثری نے "حصول تیسیر البیان علی اصول تفسیر القران" کے نام سے ایک تاویلات سے بھر پور ایک تفسیر لکھی ہے جسمیں انھوں نے دیگر باتوں کے علاوہ آنحضرتؐ کے معجزہ معراج آسمانی سے انکار کیا ہے۔ اور رات کے کچھ حصہ میں مسجد الحرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصی تک آپؐ کے سفر کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> آنحضرتؐ کو مسجد حرام سے (جو اسکی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی جانب کسی نہ کسی رات روانہ کر دے گا اور "اسرائ" کا مطلب لے گیا کی بجائے "لے جائے گا" (روانہ کر دے گا) سے کیا ہے یعنی بجائے ماضی کے مستقبل میں لے جائے گا۔[1]

یہاں ذیل میں عنایت اللہ اثری کی مذکورہ تفسیر سے آپؐ کے معراج آسمانی کے حوالے سے سورہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت { سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا } کے بارے میں ان کی بیان کردہ توضیح و تفسیر ملاحظہ ہو:

> اللہ رحمان و رحیم کا نام لیکر پڑھو۔ چرچا کرو اور وعدہ خلافیوں اور غلیظ پیشگوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرو تا کہ وہ اپنے بندے (محمدؐ) کو مسجد حرام سے (جو کہ اسکی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی جانب کای نہ کسی رات روانہ کر دے گا۔ جو کہ یہاں سے بہت دور ہے۔ اور تبلیغ واشاعت کی وجہ سے اسکے ارد گرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقہ اسلام دن بدن وسیع ہو تا جارہا ہے۔[2]

یہ ہے حافظ عنایت اللہ اثری کی وہ تفسیر جو انہوں نے واقعہ معراج کے حوالے سے بیان کی جو کہ تمام قدیم وجدید اور جمہور مفسرین سے ہٹ کر ہے اور جہاں وہ تفسیر بغیر کسی روایت و نقل کے بیان کرتے ہیں وہاں وہ صرفی و نحوی اعتبار سے بھی اصول و ضوابط سے ہٹ کر ترجمہ تفسیر بیان کرتے ہیں جو کہ خالصتاً ان کی ذاتی اختراع و تاویل ہے۔ اسی طرح "اسراء نبویؐ" کے حوالے سے مزید لکھے ہیں کہ:

> ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً اس اسراء نبویؐ کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور

---

[1] اثری، عنایت اللہ، طلوع اسلام، ماہ جنوری، 1975ء، ص42-43

[2] ایضاً، حصول تیسیر البیان علی اصول تغیر القران، طلوع اسلام لاہور، 1976، ص113، 111

صحیح احادیث میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اسی آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان احادیث کو بیان فرمایا ہے مگر متون حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ آپؐ نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی احادیث میں ذکر ہے اور جو کتب زائد میں قتادہ اور زر بن حبیش سے مقطوعاً" اور عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ ابن عباس اور ابو ہریرہ سے موقوماً اور ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ سے مرفوعاً اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے۔ تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مسترد نہیں کہ وہ قرآنی الفاظ کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے۔ اسکے علاوہ اسراء کی جن احادیث میں آپؐ کے ذہاب کا تذکرہ ہے انہیں آپؐ کے ایاب کی بھی تصریح ہے۔ مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اسمیں واپسی کا کوئی ذکر کیا بلکہ اشارہ تک بھی موجود نہیں۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں ایک تو حافظ عنایت اللہ اثری معراج سے متعلق تمام احادیث کو جو چاہے صحیح ہوں یا موضوع تسلیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب وہ ان احادیث کو سورہ بنی اسرائیل کی آیات کی تفسیر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ احادیث کے متون میں اس آیت کا کوئی ذکر نہیں کہ جسمیں آپؐ نے اسراء کو بیان کرتے ہوئے اس آیت کا ذکر کیا ہو حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اور انھوں نے اس آیت کریمہ کے شان نزول کے حوالے سے بھی یہ کہہ دیا کہ وہ مروی نہیں اور اسکا اسراء کی احادیث میں ذکر نہیں جبکہ بہت سے جلیل القدر صحابہ سے جو روایات اس حوالے سے منقول ہیں ایک طرف ان کا بھی ذکر کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف ان روایات اور اسراء و معراج کا انکار بھی کرتے ہیں یہ ان کا ذاتی منطقی انداز ہے جو کہ سمجھ سے بالاتر ہے۔

جاوید احمد غامدی اور معجزات نبویؐ:

آپکی پیدائش 18 اپریل 1951ء کو ساہیوال (پنجاب) کے ایک گاؤں جیون شاہ میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے استاد مولانا امین احسن اصلاحی سے اکتساب فیض کیا جبکہ ان کے دیگر اساتذہ کرام میں سے مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور مولانا سید ابوالد علیٰ مودودی شامل ہیں۔

ان کی علمی تصنیفات میں سے قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر ہے جو البیان کے نام سے 5 جلدوں میں ہے۔ اسی

---

[1] اثری، عنایت اللہ، حصول تیسیر البیان علی اصول تغیر القران، ص114

طرح ان کی ایک معروف کتاب میزان کے نام سے ہے جو کہ دین کی تفہیم و تبیین پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ان کے تنقیدی مضامین پر ایک مجموعہ "برہان" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جبکہ دینی و علمی اور قومی موضوعات پر دینی متفرق تحریروں پر مشتمل ان کی کتاب "مقامات" کے نام سے موجود ہے۔ اسی طرح 1985ء میں انہوں نے غاوری افکار و نظریات پر مشتمل ماہنامہ اشراق کا باقاعدہ آغاز کیا جو کہ ابھی تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے اور اسکے متعین سلسلہ جات میں قرآنیات، معارف نبویؐ، دین و دانش، نقد و نظر، نقطہ نظر، حالات و وقائع، تبصرہ کتب شامل ہیں۔

اسی طرح انگریزی زبان میں ان کی افکار و نظریات کی ترجمانی کے (Monthly Renaissance) کا 1991ء سے آغاز ہوا جو کہ تاہنوز جاری و ساری ہے اور اسکے معروف سلسلہ جات یہ ہیں:

Editorial- Quranic Exegesis, Reflections, Boo Queries, Selection, New and Views, Dialogue , Islamic Law, Scriptures.

1951ء میں "ادارہ علم و تحقیق" کے نام سے اسلامی علوم سے متعلق علمی و تحقیقی کام اور اس کی نشر و اشاعت اور عوام الناس کی دینی تربیت کے اہداف پر مشتمل کثیر المقاصد ادارے کی بنیاد رکھی۔

جاوید احمد غامدی نے بیسویں صدی سے اپنے علمی سفر کا آغاز کیا۔ بائیس سال کی عر میں آپ تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور اپنے شیخ سے بے پناہ تعلق قائم رہا۔ چنانچہ مرتے دم تک اپنے استاد سے تعلق میں کبھی دوری نہیں آنے دی۔ ان سے علمی مباحثہ کا سلسلہ چلتا رہا جو کبھی کبھار مناظرہ تک بھی چلا جاتا مگر اپنے اور استاد کے مابین کبھی کوئی خلیج نہیں آنے دی۔

جہاں تک جاوید احمد غامدی کے افکار و نظریات کی بات ہے تو وہ قرآن و سنت میں فرق کے ساتھ ساتھ حدیث و سنت میں بھی فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں سنت کی تعریف کچھ اسطرح ہے:

> سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے اللہ کے نبی نے اسکی تجدید و اصلاح کے بعد اور اسمیں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے زمانے والوں میں دینی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔[1]

جبکہ جمہور کے ہاں یہ تعریف درست نہیں ہے اور ان کی یہ تعریف محدثین و اہل علم کی تعریف کے برعکس ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لیے جو انبیاء و رسول بھیجے ان کو وحی لفظی اور معنوی طریقے پر بھیجی گئی چنانچہ لفظی وحی (وحی متلو) سے مراد قرآن کریم جبکہ معنوی وحی (غیر متلو وحی) سے مراد سنت ہے۔

چنانچہ اسی انداز سے غامدی صاحب نے مختلف مواقع پر قرآن و حدیث میں اپنی تعبیرات، توضیحات پیش

---

[1] غامدی، جاوید احمد، المیزان، المورد، لاہور 2009ء، ص14

کی ہیں جو کہ جمہور اہل علم سے ہٹ کر ہیں۔ اور ان کے بہت سے نظریات قرآن و حدیث کی صریح نصوص کے خلاف ہیں جنمیں سے چند ایک یہ ہیں۔ یہ کہ جاوید احمد غامدی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ موقف رکھتے ہیں کہ انکی وفات ہو چکی ہے۔[1] اسی طرح امام مہدی کی آمد کے حوالے سے امت کے متفقہ عقیدے اور قرآن و حدیث کے بر خلاف ان کا موقف یہ ہے کہ: قیامت کے قریب کوئی مہدی نہیں آئے گا۔[2]

اسی طرح حدیث کی شرعی حیثیت کا انکار کرتے ہوئے ایک مقام پر یوں رقمطراز ہیں کہ: احادیث سے دین میں کسی عمل یا عقیدے کا اضافہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔[3] اسی طرح سنت کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ:

> سنت صرف دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی اکرمؐ نے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا اور یہ قرآن سے مقدم ہے۔ اگر کہیں قرآن کا ٹکراؤ یہود و نصاری کے فکر و عمل سے ہوا تو قرآن کریم کی بجائے یہود و نصاری کے متواتر عمل کو ترجیح دی جائے گی۔[4]

قرآن و سنت کی نصوص سے استدلال کرتے وقت سلف صالحین کے معروف طریقہ کار یعنی ان کے متفقہ اصول تفسیر و اصول فقہ سے ہٹ کر چلنا درست نہیں ہے لیکن جناب غامدی کی تحقیقات کا عمومی انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔

جمہور اہل علم قرآن و سنت کی کسی نص کے مفہوم پر صحابہ اور مابعد کے زمانوں کے اجماع کو حجت سمجھے ہیں اور اسکے خلاف رائے دہی کو غلط سمجھتے ہیں مگر غامدی صاحب کے ہاں صحابہ اور تمام امت خطا پر اکٹھی ہو سکتی ہے اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ گزشتہ چودہ سو سال میں کوئی شرعی مسئلہ کسی صحابی رسول، تابعی مافقیہ کو سمجھ نہ آیا ہو اور پہلی مرتبہ انہیں یا ان کے استاد و امام پر منکشف ہوا ہو۔ چنانچہ اس اصول کے تحت وہ بہت سے اجتماعی موقفات کے بر خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

اگر کسی مسئلے کی دلیل حدیث کو بنایا جائے تو غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث سے مستقل بالذات دین ثابت نہیں ہوتا جبکہ جمہور اہل علم اور ائمہ کرام کے ہاں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیث سے بھی مستقل طور پر کوئی حکم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن غامدی صاحب یہ تو مانتے ہیں کہ قرآن کریم کے بغیر بھی وحی نازل ہوئی ہے لیکن وہ حدیث کو وحی کی حیثیت دینے سے انکار کرتے ہیں یعنی بالفاظ دیگر وہ حدیث کو ایک طرف حجت تو کہتے ہیں مگر اسکو وحی

---

[1] غامدی، جاوید احمد، علامات قیامت، ص1780

[2] ایضا، ص177

[3] غامدی، المیزان، ص15

[4] ایضا، ص14

نہیں مانتے۔

اسلام کے بنیادی مصدر شریعت قرآن وسنت ہیں لیکن غامدی صاحب کے ہاں سنت سے مراد سنت رسولؐ نہیں بلکہ سنت ابراہیمی ہے۔یعنی دین کی وہ روایت جو حضرت ابراہیمؑ سے جاری ہوئی اور اسی طرح غامدی صاحب کے ہاں کتاب سے مراد فقط قرآن کریم نہیں ہے بلکہ کتاب الٰہی ہے جو کہ تورات، زبور، انجیل اور صحف ابراھیم کو شامل ہے۔اسی طرح جمہور اہل سنت کے ہاں عقل و فطرت سے شریعت کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف حکم خداوندی یا سنت سے ثابت ہوتی ہے مگر غامدی صاحب عقل وفطرت سے حلال وحرام، اوامر ونواہی اور جائز وناجائز کی ایک طویل فہرست پر مبنی مسائل کو ثابت کرتے ھیں۔اسی طرح جمہور اہل سنت قرآن وسنت کے ثبوت کا بنیادی ذریعہ قطعی و ظنی خبر کو مانتے ہیں جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن وسنت کے ثبوت کا بنیادی ذریعہ اجماع صحابہ اور قولی و عملی تواتر ہے۔

معجزات کے حوالے سے جاوید احمد غامدی کے ہاں نبی کی شخصیت انسانیت کا مظہر اتم اور اسکی دعوت انسانی فطرت کے مطابق ہوئی ہے۔ وہ لوگوں سے جو کچھ بھی کہتا ہے وہ عقل و بصیرت کا آخری معیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی چیزوں کی نشاندہی کرتا ہے جن سے انسان غفلت یانسیان اختیار کرتا ہے۔

نبی کی نبوت کے پیچھے چونکہ اخذ والکتاب کا پہلو نہیں ہوتا لہذا اسکی پہچان سے کسی سلیم الفطرت شخص کو کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔ چنانچہ نبی کو اللہ تعالیٰ ایسے بنات عطا فرماتے ہیں کہ معاندین اگرچہ زبانی طور پر تسلیم نہ بھی کریں مگر انکی صداقت پر یقین کے سوا ان کے لیئے کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہتا۔ بینات ہر نبی کو حالات و زمانہ کے اعتبار سے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جاوید احمد غامدی لکھتے ہیں:

> نبی کو اللہ تعالی معجزات وخوارق عطا فرماتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور مسیح علیہ السلام کو جو غیر معمولی معجزات دیئے گئے ان کے بارے میں خود قرآن کریم نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ وہ جن چیزوں پر دلالت کے لیے دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک ان انبیاء کی رسالت بھی تھی۔
> چنانچہ عصائے موسیٰ اور ید بیضا کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ:
> ﴿فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ-اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾[1]
> (پس یہ دونوں واضح نشانیاں ہیں فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس جانے کے لیے۔

[1] القصص:32

اس بات میں شبہ نہیں کہ وہ نافرمان لوگ ہیں)

ان معجزات کو کوئی بندہ سحر و ساحری یا علم و فن کا کمال کہہ کر رد نہیں کر سکتا کیونکہ اس طرح کے علوم وفنون کی حقیقت اسکے ماہرین سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ بھی اسکے سامنے عجز سے اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں۔[1]

غامدی صاحب کا مزید کہنا ہے کہ جناب رسول اکرمؐ کو جو معجزہ اس حیثیت سے دیا گیا وہ قرآن کریم ہے۔ عربی زبان کے بعد اسالیب بلاغت اور علم و ادب کی روایت سے واقف ادبی ذوق کے حامل لوگ جب اسکی تلاوت کرتے ہیں تو یہ صاف محسوس کرتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اسکی کے مثل پیش کر سکتا ہے۔ اسی طرح واقعہ معراج کے حوالے سے جناب غامدی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

﴿وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَ ﴾[2]

(اور ہم نے جو نظارہ آپؐ کو دکھایا تھا اسکو ہم نے (کافر) لوگوں کے لیے اس ایک فتنہ بنا دیا)

یہاں وہ واقعہ معراج کے لیے الرویا کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا معنی خواب ہوتا ہے اور قرآنی بیان کی روشنی میں ہم مجبور ہیں کہ اس واقعے کو بھی خواب ہی کے معنی میں لیا جائے۔ تاہم اتنی بات ذہن نشین رہے کہ نبی کا خواب وحی ہوتا ہے اور اسمیں جو حقائق بیان کیے جاتے ہیں وہ دن کی روشنی میں اور سر کی آنکھوں سے دیکھے جانے والے حقائق سے زیادہ سچے ہوتے ہیں۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ قرآن نے جب اس واقعے کی تفصیلات میں دیکھنے، دکھانے، لے جانے اور کسی خاص جگہ پر موجود ہونے کے جو الفاظ بیان کیے ہیں وہ بلاشک و شبہ حقائق کا بیان ہیں۔[3] مذکورہ بالا آیت کریمہ سے غامدی صاحب نے لفظ الرویا سے استدلال کرتے ہوئے معراج کو خواب پر محمول کیا ہے جبکہ یہ واقعہ جمہور مفسرین کے ہاں عالم خواب میں نہیں بلکہ بیداری میں پیش آیا تھا۔

چنانچہ علامہ سہیلیؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ آیا معراج کا واقعہ عالم بیداری میں پیش آیا یا خواب ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے اہل علم کے تین طائفوں کے اقوال نقل کئے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ طائفہ اولیٰ جسمیں ابن اسحاق نے حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ کا قول ذکر کیا ہے کہ یہ ایک سچا خواب تھا اور اس شب حضورؐ کا جسم اطہر مفقود نہیں ہوا تھا بلکہ فقط آپ کی روح کو سیر کروائی گئی تھی۔ ان کا استدلال مذکورہ بالا اسی آیت

---

[1] غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد ادارہ علم و تحقیق لاہور 2010، ص129

[2] بنی اسرائیل:60

[3] غامدی، جاوید احمد، میزان، ص188

{وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيٓ اَرَيْنٰك }سے ہے جس سے جناب غامدی نے استدلال کیا ہے۔

ان کے ہاں رویا سے مراد صرف وہ خواب ہے جو بلند میں نظر آئے اور انہوں سے انے اسپر حدیث سے مزید استدلال بھی پیش کیا ہے۔اسی طرح خائفہ ثانیہ سے مراد وہ علماء ہیں کہ جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ معراج عالم بیداری میں ہوئی اور وہ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی "رویا" عالم بیداری میں بھی دیکھنے کو کہا جاتا ہے اور ان کا استشہاد اس عربی شعر سے ہے۔

(وکبر للرؤیا وهش فواده
وبشر قلبا کان جما بلاله)

(اس نے اس منظر کو دیکھ کر تکبیر کہی۔اسکا دل خوش ہو گیا۔اس نے اپنے دل کو بشارت دی۔وہ پہلے مختلف وساوس کی آماجگاہ تھا)

چنانچہ ان علماء کے نزدیک مذکورہ دلیل قرآنی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سیر عالم بیداری میں تھی۔اور اگر یہ نیند میں خواب ہوتا تو لوگ فتنے میں مبتلا نہ ہوتے اور بہت سے لوگوں کے اقدام ڈگمگانہ جاتے۔

کفار مکہ نے کہا کہ "محمدؐ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بیت المقدس گئے اور پھر اسی رات مکہ مکرمہ واپسی ہوئی جبکہ کاروان ایک مہینے میں وہاں پہنچتے ہیں اور ایک مہینے میں واپس آتے ہیں"۔اور اگر یہ خواب ہوتا تو کوئی بھی اسکو ناممکن نہ سمجھتا کیونکہ سونے والا کبھی کبھی اپنے آپ کو آسمان پر دیکھتا ہے۔کبھی وہ مشرق و مغرب میں جاتا ہے اُسے کوئی بھی ناممکن نہیں کہتا۔ان اہل علم کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے اس برتن سے پانی پیا جسے اہل کاروں نے ڈھانپ رکھا تھا، صبح انھوں نے دیکھا کہ برتن خالی تھا۔اس کارواں کا ایک اونٹ براق کی آواز سن کر بھاگ گیا۔آپؐ نے ان کی راہنمائی فرمائی۔آنحضرتؐ نے اہل مکہ کو یہ علامت بھی بتائی کہ آپؐ نے ان دوبوروں کو بھی خبر دی جن میں سے ایک کالا اور دوسرا دھاری دار تھا۔علامہ یونس کی روایت میں ہے کہ جس قافلہ سے حضورؐ نے پانی نوش فرمایا تھا اور گمشدہ اونٹ کی جانب ان کی راراہنمائی کی تھی اسکے بارے میں فرمایا کہ وہ عنقریب پہنچ جائے گا اور اہل کارواں مذکورہ بالا واقعات کا بتائیں گے۔قریش مکہ نے پوچھا وہ قافلہ کب پہنچے گا؟ آپؐ نے فرمایا "وہ بدھ کے دن تک پہنچ جائے گا؟ بدھ کے دن سورج غروب ہونے کے قریب تر ہو گیا مگر ابھی تک قافلہ نہ پہنچا۔آپؐ نے اللہ سے دعا کی۔اللہ رب العزت نے سورج کو روک دیا حتی کہ وہ کاروان پہنچ گیا۔

حضرت آدمؑ سے لیکر حضورؐ کی امت تک سورج صرف یا تو آپؐ کے لیے روکا گیا۔یا حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے لیے روکا گیا۔اور یہ تمام واقعات عالم بیداری میں ہی وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔اور ان ہی واقعات سے اہل علم نے معراج کے عالم بیداری میں جسم مقدس کے ساتھ وقوع پذیر ہونے کا استدلال کیا ہے۔جبکہ اہل علم کا

ایک طائفہ ثالثہ بھی ہے جسکے سرخیل ابو بکر ابن عربی ہیں جو اوپر بیان کردہ دونوں اقوال کی تصدیق کرتے ہوئے دونوں احادیث کو صحیح مانتے ہیں اور ان کے نزدیک معراج دو مرتبہ ہوئی تھی۔

پہلے آپؐ کو نیند کے عالم میں معراج کروائی گئی تھی تاکہ آپؐ کے لیے سہولت ہو جیسے آغازِ وحی سچے خوابوں سے ہوا تھا۔ تاکہ نبوت کا امر آپؐ کے لیے آسان ہو جائے اسلئے کہ یہ ایک عظیم امر تھا جس سے قومی بشریہ کمزور تھے۔ ایسے ہی سفر معراج پر جانے سے قبل بھی آپؐ کو نیند میں معراج کروائی گئی۔ پھر اسی طرح عالم بیداری میں معراج ہوئی۔ یہ فقط اللہ تعالیٰ کا کرم تھا۔ اور بہت سے علماء کا یہ نقطہ نظر ہے کہ معراج دو مرتبہ ہوئی اول حالت نیند میں دوم حالت بیداری میں۔ چنانچہ علامہ سہیلیؒ نے بھی اسی قول کو درست قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ احادیث کے معانی اسی پر متفق ہوتے ہیں۔[1] بہر کیف جمہور اہل علم نے اسی قول کو اختیار کیا اور ترجیح دی کہ واقعہ معراج حالت بیداری میں حضورؐ کے جسم اطہر کے ساتھ پیش آیا۔

خلاصہ بحث:

معجزات کے حوالے سے انکار کا تسلسل ابتدا سے ابھی تک جاری ہے لیکن ابتدائی منکرین اور عصر حاضر کے منکرین کی وجوہ انکار مختلف ہیں۔

چنانچہ مذکورہ فصل میں مستشرقین کی بالخصوص جبکہ مغربی مفکرین کی بالعموم آراء کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور معجزہ کے حوالے سے ان کی فلسفیانہ آراء اور عقلی استدلالات کو موضوع بحث بنا کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معجزے کا انکار دراصل رسالت کا انکار ہے۔ اسی طرح یہاں برصغیر کے جدت پسند مسلم مفکرین کی آراء کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور معجزہ سے متعلق ان کی آراء کو بھی تحقیقی و تنقیدی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

جبکہ غلام احمد پرویز، مرزا قادیانی اور بعض مزید لوگوں کے معجزات سے متعلق غلط اور بے بنیاد عقائد و نظریات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور واقعہ معراج اور دیگر معجزات کا قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیلا اثبات کیا گیا ہے۔

---

[1] السہیلی، ابو القاسم، الروض الأنف، 2/289-290

نتائج بحث

نتائج بحث

1. اس تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ سیرت کو بطور اصطلاح سب سے پہلے ابن ہشام نے متعارف کروایا۔
2. متقدمین کے ہاں سیرت صرف مغازی پر مشتمل تھی جیسا کہ ابان بن عثمان، عروہ بن زبیر، وہب بن منبہ اور محمد بن شہاب کی رائے ہے، متاخرین (جن میں عبد الرحمن السہیلی، عبد الملک نیشاپوری، ابن سید الناس علامہ قسطلانی اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی شامل ہیں) کے ہاں سیرت سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اقوال واحوال اور افعال ہیں۔
3. سیرت نگاری کے کام کا آغاز صحابہ کرام میں سے ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ، جبکہ تابعین میں سے عروہ بن زبیر (متوفی 94ھ)، وہب بن منبہ (متوفی 128ھ) اور محمد بن شہاب زہری (متوفی 124ھ) نے کیا۔
4. قاضی عیاض مالکی کی کتاب الشفاء اس تحقیق کے مطابق کلامی مباحث پر مشتمل وہ پہلی اور جامع کتاب ہے کہ جسکا دو تہائی حصہ تقریباً کلامیات سیرت پر مشتمل ہے، جس میں انہوں نے حفاظت قرآن کی چار اقسام، نبوت اور اسکے متعلقات، مقام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر و تعظیم، عصمت انبیاء، خصوصیات انبیاء، انبیاء کے سبّ و شتم، تنقیص واذیت، توہین مقدسات اور معجزات و دیگر کلامی موضوعات پر اس اسلوب سے بحث کی ہے، کہ ہر کلامی موضوع کو قرآن وحدیث کے دلائل سے ثابت کیا ہے۔
5. علامہ ابو القاسم السہیلی نے اپنی کتاب الروض الأنف میں کلامی مسائل کو جگہ جگہ بیان کرکے تفصیلاً روح اور نفس، اسراء و معراج، ختم نبوت، نزول وحی کی کیفیت، فترہ الوحی، مہر نبوت، اقسام وحی اور شق صدر وغیرہ موضوعات کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کرکے کلامی اسلوب میں بیان کیا ہے، اور وحی کے استناد، اقسام وحی وغیرہ کو بیان کیا ہے جس سے وحی کے حوالے سے جدید کلامی شبہات و شکوک رفع کرنے میں مدد ملتی ہے۔
6. حافظ ابن قیم کی کتاب زاد المعاد ویسے تو ادب، سیرت، تصوف، قانون وغیرہ پہلوؤں پر مشتمل ہے، مگر اس میں بھی کلامی اسلوب و منہج پر بھی بہت ساری ابحاث مشتمل ہے، جن میں معجزات، اسراء و معراج کی کیفیت نوعیت اور اسکے روحانی و جسمانی پہلوؤں کے حوالے سے قرآن وحدیث کے دلائل سے معراج کے جسمانی ہونے کو ثابت کیا ہے۔
7. منصب رسالت ایک وہبی منصب کا نام ہے نہ کہ کسبی، جو کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو عطا فرمائے ہیں، شق صدر کے حوالے سے لزلے ہزلٹن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و شخصیت کو داغدار کرنے کے لیے سیرت کے اکثر واقعات کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مستشرقین

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کی تصدیق نہیں کرتے اور یہی عدم تصدیق انکی کذب و افتراء کی علامت ہے۔

8. مستشرقین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی صحت پر اعتراضات اٹھاکر سیرت کے مختلف واقعات کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہزرہ سرائی کرتے ہوئے وحی کی کیفیت کو جنون و مرگی سے تشبیہ دی جو سیرت کے تمام حقائق کے برعکس ہے۔

9. عقیدہ عصمت انبیاء بنیادی دینی عقائد میں سے ہے۔ عصمت کا مفہوم یہی ہے کہ انبیاء کے اقوال وافعال ،عبادت و معاملات اور اخلاق و کردار میں اللہ تعالیٰ ان کو اپنی قدرت سے نفس و شیطان کی مداخلت اور خطاء و نسیان سے محفوظ رکھ کر ملائکہ کو انکی حفاظت پر مامور کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کفر وشرک اور صغائر و کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔

10. مستشرقین نے واقعہ غرانیق سے عصمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو استدلال کیا ہے وہ بعض ضعیف روایات کا سہارا لیکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور مقاصد نبوت کو بے وقعت ثابت کرنے کی ناکام کوشش ہے چنانچہ اس حوالے سے (William Montogmery)،(William Muir) کا مؤقف من گھڑت، خلاف واقعہ اور عصمت نبوت کی شان کے خلاف ہے۔ چنانچہ انبیاء جہاں صغائر و کبائر سے پاک ہوتے ہیں وہاں خلاف توحید اور بنیادی عقائد اسلام کے منافی ہر طرح کی لغزشوں سے پاک ہوتے ہیں۔

11. آزادی اظہار رائے کے مغربی تصور و قانون کی آڑ میں اکثر اوقات انبیاء کرام بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مقدسات اسلام و دیگر مذاہب کی توہین و بے حرمتی کی جاتی ہے جو کہ انتہائی غیر شرعی و غیر قانونی کام ہے۔

12. عقیدہ ختم نبوت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جسکی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اسمیں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور اسلام کی حقانیت، کاملیت اور ابدیت عقیدہ ختم نبوت سے ہی ممکن ہے۔ قرآن کریم اور احادیث متواترہ و مشہورہ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی شخص دعوائے نبوت کرے گا تو وہ دعویٰ باطل ہو گا۔ چنانچہ امت محمدیہ کا پہلا اجماع اسی بابت منعقد ہوا تھا کہ باطل مدعی نبوت کو قتل کیا جائے۔

13. عقیدہ ختم نبوت قرآن و حدیث، اجماع امت اور عقلی دلائل سمیت سابقہ کتب سماویہ سے بھی ثابت ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر 7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ چنانچہ قادیانی خود کو آئین پاکستان کے تحت نہ مسلمان کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی شعائر اسلام کو استعمال کر سکتے ہیں۔

14. انبیاء کرام کے ہاتھوں پر صادر ہونے والے وہ واقعات جو خوارق عادت ہوں معجزہ کہلاتے ہیں۔ معجزہ اسباب طبعیہ سے ہٹ کر خالصتاً مشیت الٰہی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ معجزے کا صدور نبی پر جبکہ سحر کا جادوگروں کا شیطانی عمل ہوتا ہے۔

15. اور بعض مستشرقین کا یہ کہنا کہ معجزے کے لیے کوئی شہادت ثبوت تو کیا، ظن کا کام بھی نہیں دے سکتی اور معجزہ کسی نظام مذہب کی بنیاد قرار نہیں پا سکتا، غلط اور بے بنیاد ہے۔

16. معجزات کے معنی انتہائی حیرت انگیز واقعات کے طور بیان کرتے ہیں جبکہ Saint Augustine رائے یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب واقعات اور باتیں ہیں جو انسانی طاقت اور قوت کے دائرے سے باہر ہیں اور یہ اشیاء قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور ان اشیاء کا جو معجزانہ اور ملکوتی انداز میں دکھائی دیتی ہیں عبادت و ریاضت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

17. عصر حاضر میں بہت سے لوگ جو مسلمان ہیں اس لحاظ سے معجزات کے منکر ہیں کہ چونکہ یہ معجزہ قدرتی قانون کے مخالف ہے لہذا یہ ناممکن الوقوع ہے۔ وہ معجزے کے اقرار کو عجوبہ پرستی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے جبکہ معجزے کا انکار دراصل قدرت خداوندی کا انکار ہے۔

18. سر سید احمد خان، غلام احمد پرویز، عبداللہ چکڑالوی، اسلم جے راج پوری، عنایت اللہ اثری اور جاوید احمد غامدی نے اپنے اپنے انداز سے معجزات کے حوالے سے مؤقف اختیار کرتے ہوئے بعض نے مکمل طور پر انکار کیا جبکہ بعض نے معجزات کی تعبیر و تشریح قرآن و سنت کے مفہوم کے بر خلاف اپنی عقل و قیاس اور منطق کو استعمال کرتے ہوئے قائم کی۔

تجاویز و سفارشات

تجاویز و سفارشات

1. سیرت طیبہ کے جملہ اسالیب بالخصوص کلامی مباحث کے حوالے سے تحقیقی کام پر مبنی معلومات اور مواد کو یکجا کر کے رسائل و جرائد اور کتب سیرت میں شائع شدہ مقالات کو جمع کر کے محققین اور اہل علم کی رسائی آسان بنائی جائے۔
2. مجوزہ کتب سیرت نبوات سے متعلق کلامی مباحث کو مقالہ ہذا میں موضوع بحث بنایا گیا ہے جبکہ انہی کتب کے ساتھ ساتھ متقدمین کی دیگر بنیادی کتب و مصادر سیرت پر بھی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔
3. ایک ایسے دائرۃ المعارف کی ضرورت ہے جس میں تمام کتب کا تعارف اور مختصر معلومات درج ہوں۔ اسکے علاوہ کتب اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کے منظور شدہ مقالات کے روابط پائے جائیں۔
4. نبوت و رسالت، ختم نبوت، معجزات، عصمت انبیاء اور وحی کے حوالے سے عصری اشکالات اور متجددین کے افکار و نظریات کے حوالے سے تفصیلی و تحقیقی کام کی اشد ضرورت ہے جو کہ اہل علم اور محققین کے لیے توجہ طلب ہے۔

فہرست آیات

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات	سورۃ	آیت	صفحہ نمبر
.1	وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ	البقرۃ	50	264
.2	وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ	البقرہ	105	123
.3	قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ	آل عمران	31	150
.4	إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰٓ ءَادَمَ وَنُوحًا وَءَالَ إِبْرَٰهِيمَ وَءَالَ عِمْرَٰنَ	آل عمران	33	151
.5	إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰٓ ءَادَمَ وَنُوحًا وَءَالَ ٱلشَّيْطَٰنِ ٱلرَّجِيمِ	آل عمران	36	130
.6	أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِأَيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّيٓ أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ ٱلطِّينِ كَهَيْـَٔةِ ٱلطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ	آل عمران	49	215
.7	اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"	آل عمران	59	266
.8	اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا	آل عمران	45	266
.9	اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰا عِيسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	آل عمران	55	267
.10	وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُۥ يُدْخِلْهُ نَارًا	النساء	14	151
.11	أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلْقُرْءَانَۚ	النساء	82	212
.12	وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْه	النساء	157	270
.13	ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًاۚ	المائدۃ	3	180
.14	أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَٰذَا ٱلْغُرَابِ فَأُوَٰرِيَ سَوْءَةَ أَخِيۖ فَأَصْبَحَ مِنَ ٱلنَّٰدِمِينَ	المائدۃ	31	208
.15	ٱللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُۥ	الانعام	124	183

16.	قَالُواْ يٰمُوسَىٰٓ إِمَّآ أَن تُلۡقِيَ وَإِمَّآ أَن نَّكُونَ نَحۡنُ ٱلۡمُلۡقِينَ	الاعراف	115	220
17.	فَلَمَّآ أَلۡقَوۡاْ سَحَرُوٓاْ أَعۡيُنَ ٱلنَّاسِ وَٱسۡتَرۡهَبُوهُمۡ وَجَآءُو بِسِحۡرٍ عَظِيمٖ	الاعراف	116	220
18.	لِيُظۡهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ	التوبہ	33	74
19.	وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ-فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا	یونس	20	281
20.	أَلَآ إِنَّ أَوۡلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ	یونس	62	249
21.	إِنَّ هٰذَا لَسِحۡرٞ مُّبِينٞ	یونس	76	210
22.	أَلَا لَعۡنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ	ھود	18	151
23.	وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ	الرعد	27	279
24.	انَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ٱلذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ	الحجر	9	180
25.	وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٞ ؕ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ	النحل	103	85
26.	سُبْحَٰنَ ٱلَّذِيٓ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ لَيۡلٗا مِّنَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ إِلَى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡأَقۡصَا ٱلَّذِي بَٰرَكۡنَا حَوۡلَهُۥ	بنی اسرائیل	1	285
27.	وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔	بنی اسرائیل	40	275
28.	وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ	بنی اسرائیل	90	280
29.	وَإِن كَادُواْ لَيَفۡتِنُونَكَ عَنِ ٱلَّذِيٓ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِيَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهُۥۖ وَإِذٗا لَّٱتَّخَذُوكَ خَلِيلٗا	بنی اسرائیل	73	170
30.	وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانِ مِن كُلِّ مَثَلٖۚ فَأَبَىٰٓ	بنی اسرائیل	89	213
31.	وَٱذۡكُرۡ فِي ٱلۡكِتَٰبِ إِسۡمَٰعِيلَۚ إِنَّهُۥ كَانَ صَادِقَ ٱلۡوَعۡدِ وَكَانَ رَسُولٗا نَّبِيّٗا	مریم	54	126
32.	وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسَىٰ ۔ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُاْ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا	طٰہٰ	17	263

.33	اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِىْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ	طه	71	264
.34	وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ	طٰهٰ	77	265
.35	فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنَاهَاۖ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ	الانبياء	4	256
.36	قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ، وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ"	انبياء	80	236
.37	وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ	الحج	52	125
.38	ٱللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ رُسُلا وَمِنَ ٱلنَّاسِۚ	الحج	75	69
.39	إِنَّ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ أَكْثَرَ ٱلَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ	النمل	76	198
.40	فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ-اِنَّهُمْ ...	القصص	32	301
.41	وَمَا كُنتَ تَتْلُواْ مِن قَبْلِهِۦ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَۖ إِذًا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ	العنكبوت	48	121
.42	وَقَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	العنكبوت	50	75
.43	اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ	العنكبوت	51	75
.44	لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِۚ	الروم	30	236
.45	وَلَئِن جِئْتَهُم بِـَٔايَةٍ لَّيَقُولَنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ	الروم	58	214
.46	مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَۗ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا	الاحزاب	40	178
.47	وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَدًا	الاحزاب	53	93
.48	تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ	الاحزاب	51	93
.49	لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاء مِن بعد	الاحزاب	52	93
.50	فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ ٱللَّهِ تَبْدِيلًاۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ ٱللَّهِ تَحْوِيلًا	فاطر	43	236

.51	اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	يٰس	82	271
.52	وَإِذَا رَأَوْاْ ءَايَةً يَسْتَسْخِرُونَ	الصافات	14	214
.53	هَٰذَا سِحْرٌ كَذَّابٌ	ص	4	231
.54	وَٱذْكُرْ عِبَٰدَنَآ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ أُوْلِي ٱلْأَيْدِي وَٱلْأَبْصَارِ إِنَّآ أَخْلَصْنَٰهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى ٱلدَّارِ	ص	46	152
.55	وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ ٱلْمُصْطَفَيْنَ ٱلْأَخْيَارِ	ص	47	152
.56	اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ	الزمر	42	243
.57	وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِٱلْبَيِّنَٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُم بِهِۦ حَتَّىٰٓ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ	المؤمن	34	126
.58	وَلَمَّا جَآءَهُمُ ٱلْحَقُّ قَالُواْ هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِۦ كَٰفِرُونَ	الزخرف	30	215
.59	وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ	الجاثيه	24	96
.60	لِيَزْدَادُوٓاْ إِيمَٰنًا مَّعَ إِيمَٰنِهِمْ	الفتح	4	132
.61	فَذَكِّرْ فَما أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِكاهِن وَ لا مَجْنُون	الطور	29	86
.62	وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ة إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ	النجم	3	199
.63	ٱقْتَرَبَتِ ٱلسَّاعَةُ وَٱنشَقَّ ٱلْقَمَرُ ، وَإِن يَرَوْاْ ءَايَةً يُعْرِضُواْ وَيَقُولُواْ سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ	القمر	2-1	287
.64	هُوَ ٱلَّذِي بَعَثَ فِي ٱلْأُمِّيِّۦنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُواْ عَلَيْهِمْ	الجمعة	2	127
.65	لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ	المنفقون	8	286
.66	وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى	الضحى	7	95
.67	أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَٰبِ ٱلْفِيلِ	الفيل	1	261

فہرست آحادیث

فہرست احادیث

نمبر شمار	فہرستاحادیث	کتاب	صفحہ نمبر
1	احياناً يا تيني مثل صلصلة الجرس.....	المستدرک علی الصحیحین	96
2	إن الرسالة و النبوة قد انقطعت فلا رسول بعد.....	ترمذی	182
3	ان روح القدس نفث فی روعی.....	فیض القدیر	95
4	إن مثلي و مثل الأنبياء من قبلي كمثل	البخاري	181
5	اني قمت من الليل فتوضأت و صليت.....	المستدرک علی الصحیحین	96
6	إني لاستغفر الله و أتوب إليه.....	مسلم	146
7	اول مابدئ به	المستدرک علی الصحیحین	96
8	ثم فتر الوحي عني فترة فبينا أنا أمشي سمعت صوتا من	البخاری	132
9	فضلت على الأنبياء بست: أعطيت جوامع الكلم، و نصرت بالرعب و أحلت لي الغنائم.....	البخاري	168
10	فنزلت: اقتربت الساعة والنشق القمر الى قوله سحر.....	الترمذی	288
11	قلت يا رسول اللهﷺ، كم الانبياء؟ قال مآة الف	المستدرک علی الصحیحین	115
12	كان في بعض	البخاری	29
13	كانت بنواسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبي خلفه نبي و أنه لا نبي بعدي و سيكون.....	البخاري	182
14	لا تقوم الساعة حتى تلحق قبائل من	الترمذی	180
15	لاتكتبوا عنى غير القرآن ومن كتب	مسلم	122
16	واحياناً يتمثل لى الملک رجلا فيكلمنى	المستدرک علی الصحیحین	95

17	ولنعم الامير اميرها و نعم	المستدرک علی الصحیحین	74
18	يا محمد! إني لأرجو أن يكون شيطانك قد تركك، لم أره	البخاری	139
19	يا نبى الله، كم الانبياء؟ قال: مائة الف و اربعة.....	المستدرک علی الصحیحین	115

مصادر و مراجع

مصادر و مراجع

- القرآن، انجیل برناباس، طبع پنجم، مترجم آسی ضیائی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1987ء
- بائبل، (پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، 2007ء)

1. آلوسی، شہاب الدین، محمود بن عبد اللہ الحسین، تفسیر روح المعانی، دار احیاء التراث الاسلامی بیروت، 1986ء
2. ابن ابار، تکملہ الصلۃ، بیروت: دار العلم، 1990ء
3. ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، دار صادر، بیروت، 1998ء
4. الابیاری، ابراہیم، المطرب من اشعار اہل المغرب، (بیروت: دار العلم للجمیع، 1997)
5. اثری، عنایت اللہ، طلوع اسلام، ماہ جنوری، 1975ء
6. ایضاً، حصول تیسیر البیان علی اصول تغیر القران، طلوع اسلام لاہور، 1976ء
7. احسان عباس، دکتور، رحلۃ التجانی، (طبع دار العربیہ للکتاب، 1998ء)
8. الازہری، پیر کرم شاہ، ضیاؤ النبیؐ، مکتبہ ضیاء القرآن، لاہور 1997ء
9. الأفريقي، منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، دار صادر بیروت، 2010ء
10. الاصفہانی، ابو نعیم، دلائل النبوۃ، ضیاء القران پبلی کیشنز، 2006ء
11. ایضاً، فی علوم القرآن، دار القلم الشامیۃ-دمشق-بیروت، 1996ء
12. الأعرجی، ستار، الوحی ودلالتہ فی القرآن الکریم والفکر الأسلامی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، 2000ء
13. أیضًا، سید نعمان، جلاء العینین، مطبوعہ مصر، 2006ء
14. امرتسری، خواجہ احمد، تسہیل برہان القرآن، دوست ایسوسی اسٹیٹس لاہور 1995ء
15. البخاري، محمد بن اسماعیل، الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وسننہ، دار طوق النجاۃ، 2001ء
16. البدوی، عبد الرحمن، مذاہب الاسلامین (قاہرہ: مصر، دار ابن کثیر، 2009ء)
17. البزار، بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق العتکی، البحر الزخار، المعروف بمسند بزار، مدینہ منورہ، مکتبۃ العلوم والحکم، 1988ء
18. البزدوی، فخر الاسلام، اصول البزدوی مع شرح کشف الأسرار، مطبوعہ دار السراج، 2016ء
19. البغدادی، محمد بن سعد، طبقات سعد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1990ء
20. ابو البقاء، أیوب بن موسیٰ الحسینی، الکلیات معجم فی المصطلحات والفروق اللغویہ، بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، 1998ء
21. پرویز، غلام احمد، معارف القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور، 2000ء

22. أیضًا، مفہوم القرآن، مطبوعہ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2002ء

23. أیضًا، مطالب الفرقان في دروس القرآن، سورہ بنی اسرائیل، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور 1998ء

24. أیضًا، معراج انسانیت، طلوع اسلام، ٹرسٹ، لاہور، 2002ء

25. أیضًا، علوم الحدیث، مطبوعہ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2002ء

26. الترمذی، عیسی، السنن، (ریاض: دار السلام 1990ء)

27. التفتازانی، سعد الدین، شرح العقیدہ النسفیہ، مکتبہ دار الہدی، الجزائر

28. تھانوی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون، بیروت: مکتبہ، لبنان، 1996ء

29. ابن تیمیہ، الجواب الصحیح، المکتبہ العربیہ السعودیہ، الریاض، 1956ء

30. أیضًا، مجموع فتاوی شیخ الاسلام تیمیہؒ، دار الوفاء اسکندریہ، مصر

31. أیضًا، مجموعہ رسائل تیمیہ، مطبعہ المنار، بصرہ، 1930ء

32. جبران بن مسعود، معجم الرائد، دار العلم للملایین 1992ء

33. الجرجانی، سید شریف، معجم التعریفات، دار القلم، بیروت، لبنان، 1984ء

34. أیضًا، شرح المواقف، دار الجیل، بیروت، 2012ء

35. جعفری، رئیس احمد، اردو ترجمہ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، (کراچی: نفیس اکیڈمی، 1990ء)

36. الجوزی، القیم، حافظ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، مئی 2015ء

37. الجوہری، اسماعیل بن حماد، الصحاح (تاج اللغۃ وصحاح العربیہ)، بیروت، دار العلم للملایین 1995ء

38. جے راج پوری، اسلم، حافظ، ماہنامہ طلوع اسلام، لاہور، دسمبر 1950ء

39. أیضًا، مقام حدیث، ادارہ طلوع اسلام لاہور، 1965ء

40. أیضًا، لغادرات، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، 1956ء

41. چکڑالوی، عبد اللہ، تفسیر ترجمۃ القرآن، مطبوعہ لاہور، 1908ء

42. الچلپپی، حاجی خلیفہ، مصطفی عبد اللہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، 2007ء

43. چیمہ، غلام رسول، پروفیسر، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، مطبوعہ غلام رسول اینڈ سنز لاہور، مارچ 2016ء

44. حاتمی، عربی، محاضرات الابرار ومسامرات الاخیار فی الادبیات والنوادر والاخبار، (بیروت: دار صادر، غیر مؤرخ)

45. ابن حجر، احمد بن علی، فتح الباری شرح صحیح الابخاری، المکتبۃ السلفیہ، 2001ء

46. اَیضًا، تہذیب التہذیب، مجلس دائرہ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، 1908ء

47. اَیضًا، التقریب، المکتبہ السلفیہ، س۔ن

48. حقانی، عبدالحق، تفسیرِ حقانی (مقدمہ)، دارالاشاعت دہلی، 1938ء

49. الحلبی، امیر الحاج، التقریر والتحبیر شرح التحریر، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، 1419ھ/1999ء

50. الحموی، یاقوت، معجم البلدان (بیروت: دار صادر، 1995ء)

51. ابو حنیفہ، نعمان بن ثابت، الفقہ الأکبر، مکتبۃ الفرقان، الأماراۃ العربیۃ، 1999ء

52. حیدر علی، فکر پرویز اور قرآن، مکتبہ دارالسلام لاہور، 2017ء

53. خالد، محمد متین، تحفظِ ختمِ نبوت اہمیت وفضیلت، ناشر۔ ادارہ تالیفاتِ ختمِ نبوت، لاہور 2008ء

54. خان، سر سید احمد، تفسیر القرآن مع اصول تفسیر، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، 1995ء

55. اَیضًا، تفسیر القرآن، مطبوعہ دوست ایسوسی ایشن، لاہور 1994

56. اَیضًا، سیرت محمدی، مکتبہ الکوثر کراچی، س ن

57. خفاجی، احمد شہاب الدین، نسیم الریاض، شرح الشفاء للقاضی عیاضؒ، مطبوعہ بیروت

58. ابن خلدون، عبدالرحمن بن محمد، تاریخ خلدون، دار حزم، 2010ء

59. ابن خلکان، شمس الدین احمد بن محمد، وفیات الاعیان (منشورات الرضی، قم) طبع 2000ء، نفیس اکیڈمی کراچی

60. خمیس، محمد بن عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، منہج الماتریدیہ فی العقیدہ، دار احیاء التراث، بیروت، 2000ء

61. السجستانی، ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، السنن، ضیاء القران پبلی کیشنز، 2012ء

62. دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، 1973ء

63. دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، بستان المحدثین، (مطبع مجتبائی دہلی 1898ء)

64. ایضاً، عجالہ نافعہ، مترجم وشارح: ڈاکٹر عبدالحلیم وچشتی، کراچی، مکتبہ الکوثر، 2012ء

65. دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور 2010ء

66. دہلوی، عبدالحق، شیخ، لمعات التنقیح فی شرح مشکاۃ المصابیح، مکتبۃ المعارف لاہور، 1981ء

67. دہلوی، عبدالحق، مدارج النبوۃ (مترجم: غلام معین الدین) مکتبہ دانش، دیوبند، 1971ء

68. الذہبی، عبداللہ شمس الدین بن محمد، تذکرۃ الحفاظ (بیروت: لبنان، دار احیاء التراث العربی، 1916ء)

69. اَیضًا، تذکرہ الحفاظ، بیروت، دارالکتاب العربی، 1990ء

70. الرازي، فخر الدین، المطالب العالیہ من علم الالٰہی، الدارالکتاب العربی، 1987ء

71. آیضًا، تفسیر مفاتیح الغیب المعروف بتفسیر الکبیر، دارالفکر، بیروت، 1981ء

72. آیضًا، عصمۃ الانبیاء، دارالھدیٰ، الجزائر، 2006ء

73. رضا، محمد رشید، تفسیر المنار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، 2008ء

74. رومی، لال الدین، مثنوی مولوی معنوی، مطبع مجید، کانپور، 1801ء

75. الزبیدی، محمد مرتضیٰ الحسینی، تاج العروس، مطبوعہ کویت، بمطابق 1949ء

76. الزرقانی، عبدالعظیم، شیخ، مناھل العرفان فی علوم القرآن، مطبوعہ دارالکتاب العربی، 1995

77. آیضًا، شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، مطبعۃ الازہریہ مصر، 1943ء

78. الزرکلی، خیر الدین، الاعلام، دارالعلم للملایین، بیروت، 2002ء

79. زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والأسلام، المجلس الأعلی للشؤن الأسلامیہ 1965ء

80. زین الدین، عبدالرحمن بن شہاب الدین احمد، الذیل علی طبقات الحنابلہ لرجب، (بیروت: دارالکتب العلمیہ، 1997ء)

81. السالمی، شکور، التمہید فی بیان التوحید مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الأسلامیۃ، الریاض

82. السباعی، مصطفیٰ حسنی، ڈاکٹر، استشراق اور مستشرقین، مترجم: محمد نور الحسن خان ازہری، کتاب محل، لاہور، 2017ء

83. السبحانی، محمد تقی، بحوث فی الملل والنحل، نشر العلوم، اصفہان

84. سرہندی، احمد فاروقی، شیخ، مکتوبات امام ربانی، جلد اول، مطبوعہ شاہ الخیر اکیڈمی، دہلی 2019ء

85. ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دارالفکر، بیروت، لبنان، 1977ء

86. السلمی، محمد بن صامل، السیرۃ النبویۃ، ریاض، دارابن الجوزی

87. السہیلی، القاسم، الروض الانف، دار إحیاء التراث العربي، بیروت، 2000ء

88. ابن سید الناس، محمد بن محمد بن محمد بن سید الناس، عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، دمشق، بیروت، دار کثیر، 1993ء

89. السیوطي، جلال الدین، الدر المنثور في التفسیر المأثور، دار الأحیاء التراث الأسلامي، بیروت، 2003ء

90. سیوہاروی، حفیظ الرحمان، قصص القرآن، میر محمد کتب خانہ، کراچی، 1945ء

91. الشامی، ابن عابدین، محمد امین آفندی، رسائل عابدین الرسالۃ الرابعۃ عشر

92. شبانہ، محمد کمال، معیار الاختیار فی ذکر المعاہد والدیار (ناشر وزارۃ الاوقاف المغرب)

93. شبلی نعمانی، الکلام علم الکلام، مطبع معارف اعظم گڑھ، 1922ء

94. ایضاً، سیرۃ النبی ﷺ، قرآن محل، کراچی، 1923ء

95. الشعرانی، عبدالوہاب بن احمد بن علی، الیواقیت الجواہر فی بیان عقائد الاکابر، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، 2006ء
96. الشہرستانی، محمد بن عبدالکریم، الملل والنحل، 1993ء
97. الصحراوی، محمد الامین، الارتجال فی مناقب سبعۃ رجال، مخطوط الخزانۃ الحسینہ نمبر 194
98. صفدر، سرفراز خان، مولانا، انکار حدیث کے نتائج، مکتبہ گجرانوالہ 1998ء
99. الصفدی، صلاح الدین خلیل، الوافی بالوفیات، المعھد الالمانی فی للبحوث الشرقیۃ، 1962ء
100. الطبری، محمد بن جریر، تفسیر القرآن العظیم، مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ 1410ھ/1990ء
101. ایضاً، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف القاہرہ، 1977ء
102. الطحاوی، شرح معانی الآثار، رومی پنٹر پبلی کیشنز لاہور، 1993ء
103. الطناحی، الدکتور محمود محمد، الموجز فی مراجع التراجم والبلدان والمصنفات وتعریفات العلوم، قاہرۃ، المکتبۃ الخانجی، 1985ء
104. طٰہٰ محسن، ڈاکٹر، مجلۃ المورد العراقیہ، مطبوعہ 1989ء
105. الطیار، مساعد بن سلیمان، الدکتور، الدخیل من اللغات القدیمۃ علی القرآن۔۔۔، عرض ونقد، 2012ء
106. فرحات، عبدالحکیم، الدکتور، اشکالیۃ تأثر القرآن الکریم بالأناجیل فی الفکر الأستشراقی الحدیث، الطبعۃ الألکترونیۃ
107. عبدالرزاق، دکتور، مصادر السیرۃ النبویہ بین المحدثین والمورخین، 2007ء
108. عجک، بسام داؤد، دکتور، الحوار الأسلامی المسیحی، دار قتیبہ، للطباعۃ والنشر والتوزیع، 1998ء
109. عرجون، محمد الصادق، محمد رسول اللہ منہج ورسالۃ، مطبوعہ دارالقلم، کویت، 2017ء
110. عمر بن ابراہیم رضوان، الدکتور، آراء المستشرقین حول القرآن الکریم وتفسیرہ، دار طیبۃ، الریاض، 1992ء
111. العنان، عبداللہ، الآثار الاندلسیہ الباقیہ فی اسبانیۃ والبرتغال، (مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، طبع دوم 1966ء)
112. العینی، بدرالدین، محمود بن احمد، عمدۃ القاری، دارالکتب، بیروت، 2001ء
113. غازی، محمود احمد، محاضرات سیرت، (الفیصل لاہور، جنوری 2017ء)
114. غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد ادارہ علم وتحقیق لاہور 2010ء
115. أیضًا، برہان، مطبوعہ المورد لاہور 2009ء
116. أیضًا، ماہنامہ اشراق، اگست 2008ء
117. الغزالی، ابوحامد، المنقذ من الضلال، اللجنۃ الدولیۃ، بیروت، 1959ء
118. أیضًا، احیاء العلوم الدین، مکتبہ مطبعۃ مصطفی، مصر، 1937ء
119. أیضًا، الاقتصاد فی الاعتقاد، دارالکتب العلمیۃ بیروت: لبنان، 2009ء

120. الفارابی، محمد ابو النصر، مسائلِ متفرقہ، دائرہ المعارف النظامیہ، الکائنۃ الہند، 1924ء
121. ابن فارس، الحسین احمد، معجم مقاییس اللغہ، بیروت، دار الفکر، 1979ء
122. فکر پرویز اور قرآن، مطبوعہ دار الفرقان لاہور 2005ء
123. الفراہیدی، خلیل بن احمد، کتاب العین، تحقیق: مہدی المخزومی وغیرہ دار مکتبۃ الہلال، س-ن
124. قادیانی، غلام احمد، اخبار الفضل، ۱۱ دسمبر 1932، قادیان
125. أیضًا، ازالہ اوہام، ۳/۲۱
126. أیضًا، اخبار الفضل، ۲۱ اگست ۱۹۳۱
127. أیضًا، اخبار الفضل، ۸ جنوری 1933
128. أیضًا، تفسیر سورۃ الفاتحہ، ربوہ، دار المصنفین
129. أیضًا، تذکرہ، ایڈیشن چہارم 2007ء، ضیاء الاسلام پریس
130. القاری، ملا علی بن سلطان، الشفاء وشرح الشفاء، مطبوعہ دار صادر، بیروت، 2008ء
131. ایضاً، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، دار الفکر بیروت، 2001ء
132. القرطبی، الجامع لأحکام القران: تفسیر القرطبی، دار الکتب المصریۃ- القاہرۃ، 1964ء
133. القسطلانی، احمد بن محمد، المواہب اللدنیۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 2000ء
134. القشیری، مسلم بن حجاج، المسند الصحیح المختصر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 2000ء
135. القطان، خلیل منان، مباحث فی علوم القرآن، مکتبہ وھبیۃ بیروت 2000ء
136. القونوی، قاسم بن عبد اللہ، انیس الفقہاء، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 2004ء
137. ابن القیم، محمد بن ابی بکر، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، تحقیق شعیب الارنؤوط، دمشق: مؤسسۃ الرسالہ ناشرون، 2010ء
138. ایضاً، ہدیۃ الحیاری فی اجوبۃ الیہود والنصاریٰ، دار العلم جدہ، السعودیہ، 1996ء
139. کاندھلوی، محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰ، دہلی، فرید بک ڈپو، 1999ء
140. ابن کثیر، اسماعیل بن عمرو، البدایۃ والنھایۃ، دار الفکر، بیروت، 1986ء
141. ایضاً، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، 1999ء
142. أیضًا، البدایۃ والنھایہ، بیروت،: مکتبۃ المارف، 1985ھ
143. کشمیری، انور شاہ، علامہ، (م:1933ء) خاتم النبیین
144. کحالہ، عمر رضا، معجم المؤلفین، (بیروت: لبنان، ادارہ احیاء التراث العربی)، 1957ء

145. کیرانوی، رحمۃ اللہ، شیخ، اظہار الحق، تحقیق: عمر الدسوقی، طبعۂ دولۃ قطر، س۔ن

146. الکفوی، الطلبات، دار العلم بیروت، 1981ء

147. لکھنوی، عبد الشکور، مولانا، مختصر سیرت نبوی، اردو بازار، لاہور، المکتبۃ العربیہ، س۔ن

148. لویس معلوف، المنجد فی اللغۃ العربیہ، خزینہ علم وادب، لاہور، 2005ء

149. مبارکپوری، صفی الرحمن الرحیق المختوم، دار الحلال، بیروت، 2006ء

150. محلی، جلال الدین، تفسیر جلالین، دار الأحیاء التراث الأسلامي بیروت

151. محمد رضا، محمد رسول اللہ، دار الکتب العلمیہ بیروت 1975ء

152. محمد زبیر، ڈاکٹر، فکر غامدی ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ، مکتبۃ رحمۃ للعالمین لاہور 2007ء

153. محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، دار الاشاعت کراچی 2010ء

154. محمد یسری، الدکتور، التجدید فی عرض السیرۃ النبویہ، قاہرہ، دار الیسر، 2009ء

155. المرداوی، علی بن سلیمان، شرح التحریر، مطبوعہ مکتبۃ الرشد، سن اشاعت، 2000ء

156. مرزا، بشیر الدین محمود، انوار العلوم، آئینہ صداقت، فضل عمر فاؤنڈیشن، اسلام آباد

157. أیضًا، سیرت المہدی، نظارت اشاعت ربوہ پاکستان، ضیاء الأسلام پریس پاکستان، حصہ اول

158. مرزوک، عبد الرزاق، المنہج النقدی لتصنیف السیرۃ النبویۃ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ جامعۃ الازہر، مصر

159. المزی، جمال الدین الحجاج یوسف، تہذیب الکمال، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ

160. مشاق احمد، تاریخ تحفظِ ختمِ نبوت کی صد سالہ، چینیوٹی پرنٹرز اردو بازار لاہور، 2008ء

161. المناوی، عبد الرؤف، فیض القدیر شرح جامع الصغیر، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، 1972ء

162. مودودی، الاعلیٰ بن سید احمد حسن، سیرت سرورِ عالم ﷺ، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 1994ء

163. أیضًا، تفہیم القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 1949ء

164. النجار، عبد الحلیم، تاریخ الادب العربی لبروکلمان (دار المعارف، مصر، طبع چہارم)

165. الندوی، ابو الحسن علی، تاریخ دعوت وعزیمت، (کراچی،: مجلس نشریاتِ اسلام)

166. الندوی، عبد السلام، حکمائے اسلام، دار المطبع معارف، اعظم گڑھ، 1953ء

167. الندوي، محمد صدر الدین، المستشرقون والسنۃ النبویۃ، مشمولہ، الأسلام والمستشرقین، جدہ 1985ء

168. نقشبندی، محمد نذیر، مفتاح العلوم شرح مثنوی، مولانا رومؒ، شیخ علی اینڈ سنز، لاہور 1954ء

169. النمری، عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، المالکی، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، مطبوعہ دار الجیل، بیروت، 1992ء

170. النووی، یحیٰ بن شرف زکریا، شرح النووی علیٰ مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار دار الخیر، 1996ء،

171. النیسابوری، عبد اللہ حاکم، المستدرک، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، 2009ء

172. ایضاً، معرفۃ علوم الحدیث، بیروت، دار حزم 2003ء

173. ابن ہشام، محمد عبد الملک، السیرۃ النبویۃ، مطبعہ مصطفی البابي الحلبي، مصر، 1955ء

174. أیضًا، اوضح المسالک الیٰ الفیۃ مالک، بیروت، المکیۃ، س۔ن

175. وجدی، محمد فرید، دائرہ معارف القرآن العشرون، مکتبہ علمیہ جدیدہ بیروت

176. وحید الدین خان، مولانا، شاتم رسول کا مسئلہ: قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں، گڈورڈ بکس، نیو دہلی، 2007ء

ENGLISH BOOKS:

177. Arthur Jeffery, *Material for the History of the Text of the Quran*, The Old Codices, UK: E.J. Brill,1937
178. Augustine, Saint, *The City of God*, The Modern Library, New York
179. Edward Gibbon, *The Decline and Fall of the Roman Empire*, America, 1976
180. Dr. Farhat Aziz, *International Journal of Humanities and Social Sciences*, Vol. 1. No. 11 (Special Issue-August 2011)
181. H.R. Gibb, *Mohammiadanism: A Historical Survey* London: Oxford University Press, 1961
182. Hazleton, Lesley, *The First Muslim-The Story of Muhammad*, Atlantic Books, London 2013
183. Hume, David, Enquires Concerning the Human Understanding, Oxford University Press, London, 1951
184. Huxley, Thomas. *H, Hume*, Macmillan, and co-limited, New York
185. International Bible Society 1820 Jet Stream Drive, USA-2005
186. James, William, *The Principles of Psychology*, Dover Publications Inc, New York, 1890.
187. John Bagot Glubb, *The Life Times of Muhammad*, Hard and Stongton, London: 1970.
188. John Burton, *The Collection of the Quran*, Cambridge University, Press,1979.
189. Joseph Schacht, *Origins of Muhammadan Jurisprudence*, Oxford University Press, London: 1967.
190. Maurice Bucaille, *The Bible, The Quran and Science*, Islamic Book Corporation, Islamabad, 1992
191. Minggu, *The Study of Hadith Literature in the West*, Oxford University Press, London: 1967

192. Mohammad Mohar Ali, *Sirat-al-Nabi and The Orientalists*, Madinah: King Fahad Complex, 1997
193. Montgomery Watt, *Muhammad at Madinah*, UK: Oxford University Press.1958
194. Montgomery Watt, *Muhammad at Mecca*, UK: Oxford University Press.1956
195. Pakistan Penal Code XLV of 1860, Sec 298, Mansoor Book House Lahore, 1995
196. Philip K, Hitti, *Islam and the West: A Historical Cultural Survey*, New York: Robert E. Krieger Publishing Company, 1979
197. Philip Khuri Hitti, *Islam a Way of Life*, Minnesota Press Minneapolis, 1971
198. Richard Bell. *The Origin of Islam in its Christian Environment*. London: Frank Cass & Company1968
199. Samuel Margoliouth, *Muhammad and the Rise of Islam*, New York, 1905
200. Springer, *Life of Muhammad from Original Sources*, Allahabad: Presbyterian Mission Press, 1851
201. Stanlely Lanepool, *Introduction to Selection from Quran*, Oxford University Press London, 1975
202. Theodore Noldeke, The Quran: An Introductory Essay, USA, Interdisciplinary Biblical
203. Thomas Carlyle, *On Heroes and Hero Worship*, Everyman Library, New York, 1973
204. William Montgomery Watt, *Muhammad: Prophet and Statesman*, UK: Oxford University press,1960
205. William Muir, *Muhammad and Islam*, Wellgen Society, London,
206. William Muir, *The Biography of the Prophet and Orientialists*
207. William St, Clair Tisdall, *The Original Source of Quran*, London: Society for promoting Christian Knowledge, 1905
208. Zeid Ra'ad Al Hussain, *Universal Declaration of Human Rights*, Geneva 10, Switzerland: OHCHR,